بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
فروری 2021
www.pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

بانی و مدیرِ اعلیٰ محمود ریاض

مدیرہ ــــــ رضیہ جمیل

مدیر منتظم ــــــ آذر ریاض

مدیرِ اعزازی ــــــ امت الصبور

قلمی معاون ــــــ شاہین رشید

اشتہارات ــــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ــــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

واٹس اپ
03172266944

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 840/- روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ــ 20,500 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

فروری 2021
جلد 35 شمارہ 06
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

شعاع فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، بہت سے ادوار سے گزرے، کئی بحرانوں کا سامنا ہوا، دو جنگوں کا بھی مقابلہ کیا۔ وطن عزیز دولخت ہوگیا۔ ہر مرحلے سے جیسے تیسے گزر ہی گئے۔ لیکن گردشِ ایام کا جو باب اب رقم ہو رہا ہے۔ ایسی صورت تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ مہنگائی اور بے روزگاری کا ایسا طوفان تو کسی دور میں نہ آیا تھا۔ ایسی بے اختیاری اور بدانتظامی کا مظاہرہ تو کبھی نہ دیکھا تھا۔

معاشی ابتری اور روز افزوں بڑھتی مہنگائی سے عوام اس قدر مضمحل، اتنے پریشان ہیں کہ وہ احتجاج کی سکت تک کھو بیٹھے ہیں۔ ان میں مہنگائی کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی ہمت نہیں رہی ہے۔ مہنگائی، مسائل اور دکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آرہا۔

ایک ماہ میں دوبار پیٹرول کی قیمت میں اضافہ جبکہ عالمی منڈیوں میں تیل کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ پیٹرول کی قیمت میں اضافے کا مطلب ہے کہ اب ہر چیز ہی مہنگی ہوگی۔ پہلے ایسا بھی ہوتا تھا کہ پیٹرول کی قیمت صرف بڑھتی ہی نہیں تھی، نیچے بھی آتی تھی مگر اب تو دور دور ایسی صورت نظر نہیں آتی۔

پیٹرول کی قیمت میں اضافے کے ساتھ ساتھ بجلی کی قیمت میں اضافہ کی نوید بھی سنا دی گئی ہے۔ گیس کی قیمت میں تو پہلے ہی کئی سو گنا اضافہ ہوچکا ہے۔

متوسط طبقہ کسی بھی معاشرے میں ستون کی حیثیت رکھتا ہے جو معاشرے کی اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اقدار کو تھامے رکھتا ہے۔ متوسط طبقہ بڑی تیزی سے غربت کی لکیر سے نیچے آرہا ہے۔ اعداد و شمار کو توڑ مروڑ کر، دوسروں کو الزام دے کر آپ کچھ بھی ثابت کرسکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ دی ہے۔

آنے والا وقت کیا ہوسکتا ہے، ہم سمجھ نہیں پارہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنا برا بھلا سوچنے سے قاصر ہیں۔

سالگرہ نمبر۔ سروے

ہماری ایک قاری بہن امرحہ حسین کی تجویز پر سالگرہ نمبر کے سروے میں آپ سے سوال کر رہے ہیں۔

- اگر آپ کو اپنی پسندیدہ مصنف سے کوئی ایک سوال کرنے کا موقع ملے تو آپ کیا سوال کریں گی؟

آپ کے جواب ہمیں 25 فروری تک موصول ہوجانا چاہئیں۔ ہم سالگرہ نمبر میں آپ کے سوال کا جواب آپ کی پسندیدہ مصنف سے لے کر شائع کریں گے۔

اس شمارے میں

- عمر یسرا۔ حسنہ حسین کا مکمل ناول،
- چار سو پھیلی محبت۔ عاصمہ فرحین کا مکمل ناول،
- جبیں چیمہ، میمونہ صیف اور حنا بشریٰ کے ناولٹ،
- رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے ناول،
- حمیرا شفیع، فریحہ اشتیاق، عمارہ جہاں، قرۃ العین خرم ہاشمی اور خولہ سعید جاوید کے افسانے،
- فضا احسن اور عابدہ جمیل کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ہر دل کی دھڑکنوں میں شامل ہے نام تیرا
دیتا ہے جو ہدایت وہ ہے کلام تیرا

تیری ہی روشنی ہے، روشن ہے تیری ہستی
ذہنوں میں جگمگائے، ایسا ہے نام تیرا

سنتی ہے روح جس کو پڑھتی زباں جسے ہے
جو دل میں گونجتا ہے وہ ہے کلام تیرا

کوئی شریک تیرا نہ ثانی ہے اے خدایا
لاریب سب سے ارفع و اعلیٰ مقام تیرا

تو نے عطا کیا ہے دردِ جنوں کنول کو
کرتی ہے ذکر مولا وہ صبح شام تیرا!

یاسمین کنول

حضورﷺ آئے تو کیا کیا ساتھ نعمت لے کے آئے ہیں
اخوت، علم و حکمت، آدمیت لے کے آئے ہیں

کوئی صدیق سے پوچھے صداقت کن سے حاصل کی
عمرؓ ہیں ان کے شاہد وہ عدالت لے کے آئے ہیں

کہا عثمانؓ نے میری سخاوت ان کا صدقہ ہے
علیؓ دیں گے شہادت وہ شجاعت لے کے آئے ہیں

رہے گا یہ قیامت تک سلامت معجزہ ان کا
وہ قرآنِ مبین، نورِ ہدایت لے کے آئے ہیں

خدا نے دین کامل کر دیا ہے اے امین ان پر
محمدﷺ پرچمِ ختمِ نبوت لے کے آئے ہیں

سید امین گیلانی

ادارہ

حرام

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، بدکار عورت کی کمائی اور کاہن کی شرینی سے منع فرمایا۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کتے کی قیمت کی ممانعت کا مطلب ہے کہ کتے کی خرید و فروخت حرام ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم عام ہے جو ہر قسم کے کتے کو شامل ہے۔ چاہے وہ شکاری کتا ہو یا سدھایا ہوا ہو یا کھیتوں وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے لیا گیا ہو، جن کا رکھنا جائز ہے۔ اس لیے کہ کتا مطلقاً نجس ہے، چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو۔ بعض علماء کے نزدیک ان کتوں کی خرید و فروخت اور ان کی قیمت جائز ہے جن کتوں کو رکھنے کی اجازت ہے، جیسے شکار اور حفاظت کے لیے رکھے جانے والے کتے۔ دلائل کے اعتبار سے جمہور کا قول راجح ہے۔ کیونکہ حدیث میں مطلقاً منع کیا گیا ہے۔

2۔ بدکار عورت جو کچھ کماتی ہے، اسے مہر صرف اس کی ظاہری شکل کی وجہ سے کہا گیا ہے، ورنہ یہ حرام ہے۔ اس کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اسی طرح کاہن، نجومی، اور جو لوگ بھی ان کی طرح مستقبل کی خبریں بتا کر عوام کو بے وقوف بناتے اور ان سے پیسے بٹورتے ہیں، ان کی کمائی بھی حرام ہے۔

3۔ ان کی کمائی کی طرح ان کو دینا بھی حرام ہے، اس لیے کہ جب ان کے لیے لینا جائز نہیں تو دینے والے کا دینا بھی جائز نہیں۔

بدشگونی لینے کی ممانعت کا بیان

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا اور بدشگونی لینا کوئی چیز نہیں۔ اور مجھے فال اچھی لگتی ہے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا ”فال کیا چیز ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اچھی بات (کا سننا اور اس سے خیر کی امید وابستہ کر لینا۔)“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ”بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگ جانا نہیں۔“ میں اس بات کی نفی ہے کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے تندرست آدمی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یعنی تم کسی بیماری کو اس معنی میں متعدی مت سمجھو کہ یہ خیال کرو کہ فلاں شخص فلاں کی بیماری کی وجہ سے بیمار ہوا، بلکہ جس طرح پہلا شخص اللہ کی مشیت سے بیمار ہوا، دوسرا بھی اللہ کی مشیت ہی سے بیمار ہوا۔

بعض بیماریاں، جو متعدی سمجھی جاتی ہیں۔ اس میں ان کے متعدی ہونے کا انکار نہیں ہے بلکہ صرف عقیدے کی درستی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس

میں بھی اصل چیز اللہ کی مشیت ہی کو سمجھنا چاہیے نہ کہ کسی بیماری کو کیونکہ اگر بیماری ہی اصل سبب ہوتو پھر ایک گھر میں متعدی مرض میں مبتلا ایک شخص کی وجہ سے گھر کے تمام افراد کو اس بیماری میں مبتلا ہونا چاہیے جب کہ واقعتاً ایسا نہیں ہوتا۔ صرف ایک دو شخص ہی بیمار ہوتے ہیں۔ سب کے سب بیمار نہیں ہوتے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ متعدی مرض میں بھی اصل سبب بیماری نہیں، اللہ کی مشیت اس کی تقدیر اور فیصلہ ہی ہے۔

بیوہ کہاں عدت گزارے

حضرت زینب بنت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی زوجہ، محترمہ تھیں، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں، انہوں نے فرمایا۔

"میرے شوہر اپنے کچھ (بھاگے ہوئے) غلاموں کی تلاش میں نکلے۔ (آخر) "قدوم" جگہ کے قریب انہیں جالیا۔ غلاموں نے انہیں شہید کردیا۔ جب مجھے میرے خاوند کی وفات کی خبر ملی تو میں اپنے خاندان کے محلے سے دور انصار کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھی۔ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے خاوند کی وفات کی خبر اس حال میں ملی ہے کہ میں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہوں۔ جو میرے خاندان کے محلے سے دور ہے اور میرے بھائیوں کے گھروں سے بھی دور ہے اور اس نے کوئی مال بھی نہیں چھوڑا جس سے میرا خرچ چلتا رہے، نہ کوئی مال چھوڑا ہے جو مجھے ترکے میں ملے، نہ ان کی ملکیت میں کوئی گھر تھا اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنے اقارب اور اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤں۔ مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے اور اس سے میرے (روزمرہ کے) کام بہتر طور پر چلتے رہیں گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو یوں ہی کرلو۔"

وہ فرماتی ہیں: "میں باہر نکلی تو مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے حق میں فیصلہ فرمایا۔ میں ابھی مسجد ہی میں تھی یا گھر کے صحن ہی میں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (دوبارہ) طلب فرمالیا پھر فرمایا۔

"تم نے کیسے بیان کیا؟"

میں نے دوبارہ صورت حال پیش کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تک اللہ کی مقرر کردہ مدت (موت کی عدت) پوری نہیں ہوجاتی، اسی گھر میں رہائش رکھو جہاں تمہیں اپنے خاوند کی وفات کی خبر پہنچی۔"

چنانچہ میں نے چار ماہ دس دن تک وہیں عدت گزاری۔

فوائد ومسائل:

عورت کو عدت اسی مکان میں گزارنی چاہیے جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

خاوند کی وفات پر عدت چار مہینے دس دن ہے۔

اور اگر عورت حاملہ ہو تو عدت وضع حمل (بچے کی پیدائش) ہے اگرچہ خاوند کی وفات کے چند لمحے بعد ہی ولادت ہوجائے۔

2۔ اسی طرح بدشگونی لینے کا معاملہ ہے، اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لیے کچھ دیکھ کر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا بھی ہوتو اسے اہمیت دو اور نہ اس کے مقتضی پر عمل کرو کیونکہ اس سے یہ بداعتقادی پیدا ہوتی ہے کہ فلاں چیز کی وجہ سے کام خراب ہوگیا، جب کہ فاعل اور موثر حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے، اس لیے بدشگونی لینا حرام اور ناجائز ہے۔

اچھی بات سن کر فال لینے کو جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح ایک انسان اللہ تعالیٰ سے حسن ظن قائم کرلیتا ہے جو ایک مستحسن امر ہے۔ اس میں گویا اس امر کی بھی ترغیب ہے کہ انسان کو اپنی زبان سے اچھی بات ہی نکالنی چاہیے اور اچھی بات ہی سننی چاہیے جس سے لوگ نیک فال اخذ کریں اور ایسی بات کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے ان کے دلوں میں بدفالی کا خدشہ ہے۔

فائدہ: بہتر یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں بدشگونی نہ لی جائے۔ تاہم اگر دل میں اس قسم کا وسوسہ پیدا ہو تو اس کے مقتضی پر عمل نہ کیا جائے۔

آرزو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے ادنیٰ جنتی کا یہ مرتبہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا۔ آرزو کر، چنانچہ وہ آرزو کرے گا۔ پھر آرزو کرے گا (کہ میرے لیے فلاں چیز ہو، فلاں چیز ہو، وغیرہ) اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنی ساری آرزوؤں کا اظہار کردیا ہے؟ وہ کہے گا۔" ہاں۔" چنانچہ اللہ اس سے کہے گا تیرے لیے جو کچھ تو نے آرزو کی ہے، وہ بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی۔" (مسلم)

نماز میں لمبا قیام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز (تہجد) پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا عرصہ کھڑے رہے کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کرلیا۔

(ابووائل فرماتے ہیں) میں نے کہا۔" وہ کون سا کام تھا؟"

فرمایا۔" میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا رہنے دوں۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ نماز تہجد باجماعت جائز ہے۔

2۔ نماز تہجد میں طویل قرأت افضل ہے۔

3۔ شاگردوں کو تربیت دینے کے لیے ان سے مشکل کام کروانا جائز ہے اگرچہ اس میں مشقت ہو۔

4۔ استاد کا خود نیک عمل کرنا شاگردوں کو اس کا شوق دلاتا اور ہمت پیدا کرتا ہے۔

5۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیکی کا اس قدر شوق رکھتے تھے کہ افضل کام کو چھوڑ کر جائز کام اختیار کرنے کو انہوں نے "براکام" قرار دیا۔

6۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا تھا، اب اتباع اور محبت کا تقاضا ہے کہ اس نیکی میں آخر تک ساتھ دیا جائے، اس لیے بیٹھ جانے کو انہوں نے برا سمجھا کہ یہ محبت کے تقاضے کے خلاف ہے۔

مردے کی خوبیاں بیان کرنا

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر بے ہوشی طاری ہوگئی تو ان کی بہن رونے لگی اور کہنے لگی۔

"ہائے اے پہاڑ! ہائے ایسے اور ایسے!"

ان کی خوبیاں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ جب انہیں ہوش آیا تو فرمایا۔" تو نے جو کچھ کہا، تو مجھ سے پوچھا جاتا تھا: تو اس طرح ہی ہے؟" (بخاری)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ بین کرنے پر گرفت ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر ایسی خوبیاں بیان کرنا جو مرنے

والے میں نہ ہوں تو فرشتے اس پر اسے سرزنش کرتے ہیں کہ کیا تو واقعی ان خوبیوں کا حامل ہے۔ درآں حالیکہ وہ ان سے محروم ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے ملامت اور توبیخ کا باعث ہے۔

کثرت سے سجدے

حضرت ابو فاطمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''میں نے عرض کیا'' اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی عمل بتایئے جس پر میں قائم رہوں اور اسے کیا کروں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔'' کثرت سے سجدے کیا کر، کیونکہ تو اللہ کے لیے جو بھی سجدہ کرے گا۔ اس کی وجہ سے اللہ تیرا ایک درجہ بلند کردے گا اور تیری ایک غلطی معاف کردے گا۔'' (طبرانی)

فوائد ومسائل:

1۔ نماز کے تمام اعمال ہی اللہ کے قرب کا باعث ہیں، لیکن سجدے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہ عجز ہی عبادت کی روح ہے۔

2۔ طویل قیام کی فضیلت تلاوت قرآن کی وجہ سے ہے اور سجدے کی فضیلت عجز ونیاز کی وجہ سے، اس لیے طویل سجدہ بھی ایک عظیم عمل ہے۔ جیسے کہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل سجدوں کا بھی ذکر ہے۔

3۔ سجدے سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رب العالمین کے نزدیک یہ شخص سب لوگوں سے زیادہ بڑی شہادت والا ہوگا۔'' (مسلم۔ اور بخاری نے بھی اس مفہوم کی بعض روایات بیان کی ہیں۔)

فوائد ومسائل:

1۔ اس میں ایک مومن کی عزیمت واستقامت اور پھر شہادت کا ذکر ہے۔ جس کا مظاہرہ اس کی طرف سے دجالی فتنے کے مقابلے میں ہوگا۔

2۔ اس میں اس کی گردن کے اس حصے کو تانبا بنا دینے کا جو ذکر ہے جس کو تلوار مار کر انسان کے جسم سے الگ کردیا جاتا ہے تو یہ حقیقتاً بھی ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بعید نہیں اور بعض لوگ اسے کنائے پر محمول کرتے ہیں کہ دجال اس کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہوسکے گا۔ حقیقت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

3۔ اسی طرح آخر میں دجال کی آگ کو جنت بتلایا گیا ہے۔ یہ یا تو انجام کے اعتبار سے ہے، یعنی اس آزمائش کا نتیجہ جنت ہے۔ یا جنت بمعنی امن وسکون ہے کہ مومن کو اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے آگ میں بھی امن وسکون محسوس ہوگا یا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح وہ آگ اس کے لیے گلزار بن جائے گی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ دجال کے فتنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے سوال میں نے کیے۔ اتنے کسی نے نہیں کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا

''وہ تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

''میں نے عرض کیا۔'' لوگ کہتے ہیں: اس کے پاس روٹی کا پہاڑ اور پانی کی نہر ہوگی؟''

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اہل ایمان کو بچالینا اللہ کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔''

(بخاری ومسلم)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ دجال کے پاس اگرچہ گمراہ کرنے کے بڑے وسائل ہوں گے لیکن اہل

ایمان کو اس کے حشر سے بچانا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

کان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو بھی نبی آیا، اس نے اپنی امت کو کانے، جھوٹے (دجال) سے ضرور ڈرایا۔ خبردار وہ دجال کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں ہے۔ اس دجال کی دونوں آنکھوں کے درمیان (ک ف ر) لکھا ہوا ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

کانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے۔ یاد رکھو! مسیح دجال، دائیں آنکھ سے کانا ہے، گویا اس کی آنکھ ابھرا ہوا انگور ہو۔"

فوائد و مسائل

1۔ دجال اور اس کی فتنہ انگیزی کی بابت جو حدیثیں بیان ہوئی ہیں یہ صحت اور درجہ استناد کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم کی، جن کی صحت و قطعیت پر علمائے امت کا اتفاق ہے، اس لیے اس کی بابت کسی قسم کا شک صحیح ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول بھی ایسی متواتر احادیث سے ثابت ہے جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قیامت کے قریب یہ علامت کبریٰ یقیناً ظہور پذیر ہوں گی جن پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

2۔ دجال، یہودی الاصل شخص ہوگا۔ فتنہ پردازی میں ممتاز ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہی دجال ہے۔ بہت دجل و فریب سے کام لینے والا۔ اللہ تعالیٰ بھی اہل ایمان کی آزمائش کے لیے اسے بعض خرق عادت امور پر قدرت عطا فرمائے گا۔ وہ الوہیت کا مدعی ہوگا، یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس کے ساتھ ہوگا اس کو حدیث میں مسیح الدجال بھی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ مسیح الضلالتہ ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسیح الہدیٰ ہیں۔ مسیح کے معنی اور اس کے ساتھ اسے لقب کرنے کی وجہ میں بہت اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ اس کا ممسوح العین ہونا ہے، بعض، کہتے ہیں کہ وہ مکہ و مدینہ کے علاوہ روئے زمین پر پھرے گا، اس لیے اسے مسیح کہا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی لیے مسیح کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے جب نکلے تھے تو ان کے جسم پر تیل ملا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ جس بیمار پر ہاتھ پھیر دیتے تھے۔ صحیح ہوجاتا تھا۔ وغیرہ (فتح الباری، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء قبل السلام)

برکت کے ساتھ مال کی زیادتی کے لیے

ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انس آپ کا خادم ہے اس کے لیے اللہ سے دعا کیجیے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

"اے اللہ! اس کے مال و اولاد میں زیادتی کر اور جو کچھ تو اسے دے اس میں برکت عطا فرما۔"

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ر۔ ملتان

رشتے قسمت سے طے ہوتے ہیں یہ سنا تھا میں نے بزرگوں سے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

س: شادی کب ہوئی؟

شادی 5 اکتوبر 2013ء کو ہوئی۔ یہ لوگ گجر فیملی سے تھے اور ذات کے علاوہ کہیں بھی شادی نہیں کرتے تھے۔ یہ چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ساس کی وفات ہو چکی تھی اور سسر ہی سب کے رشتے طے کرتے تھے۔ ان کا ایک فلسفہ بہت خوب صورت تھا کہ بیٹیاں کیا دیکھنی، بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ اس لیے جس کے گھر بھی رشتہ دیکھنے گئے بس ایک دفعہ ہی گئے اور رشتہ طے کر دیتے تھے۔ میری بہن میرے سسرال کے ہمسایہ میں رہتی تھی اور میرا سارا سسرال رشتے کے خلاف تھا۔ میرے شوہر کا نمبر چوتھا تھا۔ باقی سب کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ سب سے چھوٹے تھے لیکن میرے سسر میرے والدین سے ملے اور بہت خوش ہوئے اور رشتہ طے کر دیا۔

س: شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

اسکول میں جاب تھی پرائیوٹ اور ٹیوشن پڑھاتی تھی بچوں کو۔ گانے سننا اور رسالے پڑھنا میرے شوق تھے۔ رات کو چاند کی چاندنی میں اور موبائل کی روشنی میں رسالہ ختم کر لیا کرتی تھی۔ بچپن میں نونہال، تعلیم و تربیت، پھول، بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا تھا جو میں نہ پڑھتی۔ دوستی بھی صرف ان لڑکیوں سے رکھتی تھی جو رسالے پڑھتی ہوں اور بعد میں سرگزشت، خواتین، شعاع، جاسوسی، سسپنس، اخبار جہاں، فیملی...... کچھ نہیں چھوڑا۔

س: اس شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے کے آگے سر جھکایا؟

"ہاں میں نے بزرگوں کے فیصلے کے آگے سر جھکایا۔"

س: ذہن میں جیون ساتھی کے لیے کوئی تصور تھا اور وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

نہیں، کوئی تصور نہیں تھا۔ بس سکون والی زندگی کی خواہش تھی جس میں بحث و مباحثہ نہ ہو۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی۔ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟

منگنی تقریباً ایک سال سے بھی کم عرصہ رہی۔ منگنی تو نہیں تھی، بس رشتہ طے ہوا تھا۔ فون پر بات کم ہوتی تھی یہ ذرا رومانٹک مزاج کے تھے اور میں ٹھہری خشک مزاج کی۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

چونکہ میرے سسر بہت اچھے مزاج کے تھے اور فون پر میری بڑی جیٹھانی سے بات ہوتی تھی اور وہ بھی بہت اچھی تھیں تو بہت اچھے خیالات تھے۔ ہاں میری دوسرے نمبر والی جیٹھانی جو کہ لاہور سے تعلق رکھتی ہیں، ذرا غصے والی اور جھگڑالو طبیعت کی ہیں۔ میرے جیٹھ بھی انتہائی غصے والے، بات بات پر گالیاں دینے والے ہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ ایک فاصلہ رکھا اور خدمت گزاری کی اور اپنے شوہر سے پہلے ان کو رکھا تو وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔

س: شادی کے لیے آپ کو تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی؟

نہیں۔ بس میرے والد کی ڈیتھ ہو گئی تو شادی بہت سادگی سے ہوئی، میرا نمبر آخری تھا۔

س: شادی بخیر و خوبی انجام پائی؟

شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ میرے سسر خود رسموں کے خلاف تھے، اس لیے کوئی رسم نہیں ہوئی۔ میری امی عدت میں تھیں، اس لیے زیادہ رشتہ داروں کو بھی نہیں

بلایا تھا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟

میرا میک اپ بہت برا ہوا تھا اور کچھ لمبے سفر نے منہ اور خراب کر دیا (میری شادی ملتان سے لاہور ہوئی تھی)۔ میری ایک نند نے پہلی دفعہ تب دیکھا جب میں بارات کے ساتھ لاہور پہنچی۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ بن گیا اور غصہ میں آ گئی۔ باقی رشتہ دار بھی ناخوش تھے کیونکہ ایک تو ذات کی نہیں تھی اور دوسرا عجیب سی لگ رہی تھی۔ لیکن جب اگلے دن میں بنا میک اپ کے تھی تو مجھے دیکھ کر سب نے سکون کا سانس لیا کہ قصور میک اپ کا تھا، میرا نہیں۔ پھر سب رشتہ دار اور نند صاحبہ خوش ہو گئیں دیکھ کر۔ ولیمہ کا میک اپ بہت زبردست تھا۔

س: شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

تبدیلی ہی تبدیلی آئی۔ شوہر بہت اچھے ثابت ہوئے سسر صاحب اصول پرست انسان تھے۔ ان کا کھانا پینا، سونا سب وقت کے مطابق ہوتا تھا۔ اپنے وقت کے انجینئر تھے۔ لیکن اولاد زیادہ پڑھ نہ سکی۔ اولاد کو ہمیشہ رزق حلال کھلایا، سو اولاد میں کوئی برائی نہیں تھی سوائے گالیاں دینے کے اور غصہ کرنے کے۔

بڑے جیٹھ کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کی شادی دوسرے بھائی سے زبردستی کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی میں کبھی نہ بنی لیکن اس کی قیمت باقی خاندان چکاتا رہا۔ جوائنٹ فیملی ہے اس لیے سب کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جیٹھ صاحب نے کمپنی میں اپنی سیکریٹری صاحبہ سے بغیر بتائے نکاح کر لیا۔ شادی شدہ زندگی تیرہ برس مکمل کر چکی تھی لیکن انہوں نے بائیس سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا پینتالیس سال عمر ہونے کے باوجود۔ گھر میں لڑائی جھگڑے ایک سال تک چلے لیکن میری جیٹھانی نے ہمت نہ ہاری، وظائف پڑھائیاں کرتی رہیں۔

دونوں دیوران کی بات پر آمین کہتے تھے اور اپنے بھائی کے خلاف تھے، حتیٰ کہ قتل کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔

بہت دفعہ مجھے اور دوسرے نمبر والی جیٹھانی کو گھر سے نکالنے کی کوشش کی۔ پہلے نمبر والی جیٹھانی نے اپنے گھر والوں کو کبھی کچھ نہیں بتایا اور ساری لڑائی اپنے سسر اور دو دیوروں سے حل کر لڑی۔ میرے سسر بھی اپنے بیٹے کے خلاف تھے اور ساری جائیداد بڑی بہو کے نام کرنے کے لیے تیار تھے، بہت مشکل تھی زندگی۔ بالآخر بڑے جیٹھ سے طلاق دلوائی تو سکون آیا میری بڑی جیٹھانی کو اور ان کے ساتھ ہماری زندگی کو۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

شادی کے چوتھے پانچویں دن سے کام سنبھال لیا تھا۔ میرے بڑے جیٹھ نے صبح صبح اٹھ کر بولنا شروع کر دیا تھا کہ یہ شروع کرے۔ حالانکہ بارات والے دن میرے بڑے جیٹھ نے مجھ سے گھٹنا پکڑائی کے پیسے مانگے تو میں نے اپنے حق مہر کے سارے پیسے ان کو دے دیے۔ خیر ایک ہفتے کے بعد اس بات پر لڑائی ڈالی کہ یہ دونوں اپنے میاں کو پہلے ناشتہ کیوں دیتی ہیں، مجھے کیوں نہیں۔ میں بڑا ہوں گھر کا۔ کھانا نہیں اچھا بنا تو لڑائی۔ سالن پھینک دیا جاتا۔

س: کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

جی بالکل، بہت فرق تھا۔ مجھے تو کھانا نہیں بنانا آتا تھا، شادی سے کچھ عرصہ پہلے سیکھا تھا لیکن زیادہ ایکسپرٹ نہیں تھی، اصل میں میری امی بہت چست خاتون ہیں۔ ان کو کسی کا کھانا پسند نہیں آتا تھا۔ میکے والے تیز مرچ کھاتے تھے اور سسرال والے ہلکی مرچ کے کھانے۔ لیکن جب میں نے بنانا شروع کیا تو گھر والوں نے بہت پسند کیا۔

س: سسرال والوں نے کن باتوں پر تنقید کی اور کب تعریف؟

تنقید ہمیشہ دوسرے نمبر والی جیٹھانی نے کی اور لڑائیاں بڑے جیٹھ نے کیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمیشہ شوہر کی عزت کو سامنے رکھا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ دیکھو، باہر کی ذات کی لائے ہو۔ ہمیشہ سب کی عزت اور خدمت کی ہے، آٹھ سال تک اور آج میرے سسر کہتے ہیں کہ میری یہ

بیٹی دونوں گجریوں پر بھاری ہے۔ میں نے ان کی بہت خدمت کی دل سے۔ انہوں نے مجھے بہو بنا کر عزت دی تو میرا فرض ہے کہ میں ان کا خیال رکھوں۔

س: سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

سسرال والے خود پر فیصلہ کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ وہاں مردوں کی حکمرانی چلتی تھی، اگر بقرعید پر گوشت بھی بانٹنا ہوتا ہے تو تینوں بھائی خود ہی تقسیم کرتے ہیں، عورتوں کو کسی فیصلے میں رائے کا اختیار نہیں ہے۔

س: سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

میں نے ہمیشہ کمپرومائز کیا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں میرے شوہر میرے گھر والوں کا فون اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہن کا گھر بالکل ساتھ میں تھا لیکن میں جا نہیں سکتی تھی، پورے محلے میں سے کسی کو ہمارے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اصل میں میرے سسر نے اپنے وقت میں اپنی بیوی کو اکیلے رکھا اور بیوی نے اپنا سارا میکہ اپنے پاس رکھا، جس کی وجہ سے ان کی اولاد پڑھ نہ سکی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر پابندی ہے، اپنے میکے جانے پر اور ان کو بلانے پر

س: بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بڑا امتحان؟

جی بالکل۔ مجھے بیٹے کی بڑی خواہش تھی کیونکہ میری دوسرے نمبر والی جیٹھانی کے چار بیٹے تھے اور بڑی جیٹھانی کا ایک بیٹا۔ لیکن خدا نے مجھے رحمت سے نوازا، میری دوسرے نمبر والی جیٹھانی نے کہا کہ کہیں یہ بھاگ نہ جائے کیونکہ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ لیکن میں نے برداشت کرلیا پھر خدا نے مجھے ایک نعمت سے نواز دیا۔

س: شوہر سے تعلقات؟

بہت اچھے تعلقات ہیں، بس اتنا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں کے خلاف نہیں جاسکتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے پہلے بہن بھائی ہیں بعد میں اولاد اور پھر بیوی۔

س: جوائنٹ فیملی سے اتفاق کرتی ہیں یا نہیں؟

جوائنٹ فیملی اس لحاظ سے بہتر ہے کہ بچوں کو ہر رشتہ مل جاتا ہے لیکن ساتھ ساتھ مقابلے کی فضا بھی ہوتی ہے۔ کوئی کھلونا نہیں خرید سکتے۔ کوئی کھانا نہیں بنا سکتے۔ بازار سے اگر کوئی چیز منگوانی ہو تو سب کے لیے منگواؤ ورنہ جھگڑا تیار۔ سب بچے ایک ہی اسکول میں جاتے ہیں، ایک ہی ٹیوشن لیتے ہیں، اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔

س: سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی؟

بہت..... اپنے آپ کو مار کر ڈھال دیا سسرال کے ڈھانچے میں۔ کبھی کوئی بات میکے میں نہیں بتائی۔ ہمیشہ اچھا ہی کہا سسرال والوں کو۔ سال میں صرف دو دفعہ میکے میں جاتی ہوں، کبھی سسرال کے خلاف نہیں گئی۔ نندوں کی جی حضوری کی۔ اگر کسی سوٹ پر ہاتھ رکھا تو فوراً دے دیا۔ اپنی جیٹھانیوں کے جھگڑوں میں بھی ان کا ساتھ دیا۔

میری ایک نند حمل سے ہوئی تو لاہور آگئی اور میرے ایک کمرے میں۔ ان کے تین بچے ساتھ رہے نو ماہ تک اور۔ جی جان سے اس کی خدمت کی۔ بس خدا قبول فرمائے اور میری اولاد کو نیک بنائے۔ اپنا مقام بنانے کے لیے کچھ تو قربانی دینا پڑتی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے.....

جو اعلا ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کے بھرا کرتی ہے پیمانہ

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... سونیا آصف
میک اپ --- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

زوبی میر چکوال

السلام علیکم! جب میں نے پہلی دفعہ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کے سوال پڑھے تو جناب اسی وقت ہمارا من مچلا کہ ہم بھی اپنی روداد لکھیں۔ آج اتنے مہینوں بعد قلم اٹھانے کی وجہ ایک تو اپنی بہنوں کے احوال پڑھ ہم حیران کہ "زندگی لیتی ہے امتحان کیسے کیسے" دوسرا سوچا جناب کچھ کنواری بہنوں کی دل جوئی بھی ضروری ہے جو یہ سب پڑھ کر گھبرا رہی ہوں گی۔ بے شک زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آگاہی بہت ضروری ہے لیکن کچھ لوگ ہم جیسے بھی ہوں گے۔ جن پر زندگی بہت مہربان اور اللہ کا بے حد فضل ہوتا ہے جی تو جانیے اب ہمارا احوال۔

س 1: شادی کب ہوئی؟

ج: 4 مارچ 2001 میں ہوئی۔

س 2: شادی سے پہلے مشاغل؟

ج: میں ہمیشہ ایک بہت محنتی اسٹوڈنٹ رہی پڑھنے کا انتہائی شوق، اللہ نے سہیلیاں بھی لائق فائق دیں۔ لیکن میں صرف بی اے کر سکی۔ بی اے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب شروع کی ساتھ ہی بی ایڈ بھی کیا۔ اسکول سے گھر آ کر دل و جان سے ٹیوشن کے بچوں کو پڑھاتے پھر شام سات بجے بچوں کو چھٹی دے کر کھانا بنانے یا برتن دھونے کی ڈیوٹی کرتے۔ اور رات نو بجے سے دس یا گیارہ بجے تک اسکول کا کچھ کام کرتے اور پھر خواب خرگوش کے مزے لیتے۔

یہ دور ہماری محنت کا دور تھا۔ گھر کے حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ ابو کی تنخواہ کم اور ہم سات بہن بھائی، ہماری امی نے بہت سلیقہ مندی سے گزارا کیا۔ میرے تین بھائی تو چھوٹے تھے لیکن ہم بڑی دو بہنوں اور دو بھائیوں نے امی اور ابو کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہم سب نے محنت کی اور اللہ نے ہمیں اس کا پھل دیا۔

س 3: رشتے میں مرضی؟

ج: رشتہ والدین اور ددھیال کی مرضی سے ہوا۔ امی نے مجھ سے پوچھا۔ بتاؤ کیا کریں میں نے کہا مجھے کیا پتا جو آپ کی مرضی، میں نے اپنا ہر فیصلہ اپنے رب کے حوالے کیا اور اس نے میرے لیے بہترین چناؤ کیا۔

س 4: جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟

ج: بس ایک ہی شدید خواہش تھی شکل و صورت جیسی بھی ہو کردار کا مضبوط ہو، اف مجھے زہر لگتے ہیں تانک جھانک کرتے مرد۔ الحمدللہ خواہش سے بڑھ کر ملا۔ نیک، شریف محنتی اور محبت کرنے والا مخلص ہمسفر۔

س 5: منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج: منگنی دو سال رہی خاندان میں ہی رشتہ ہوا۔ لیکن یہ جس راستے سے گزرتے، میں راستہ بدل لیتی، ہم نے کبھی ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کیا۔ بس دوسروں سے ان کا احوال پتا چلتا۔

س 6: شادی کے لیے قربانی؟

ج: کوئی قربانی نہیں دی۔ شادی سے کچھ مہینے پہلے خاندان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ہمارا رشتہ ٹوٹتے ٹوٹتے بن گیا۔

س 7: رسموں میں لین دین میں کوئی جھگڑا؟

ج: کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔

س 8: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج: ہائے کیا بتاؤں، جو انہوں نے کہا وہ میں اسی وقت بھول گئی اور حیران بھی ہوئی کہ لڑکیاں تو کہتی ہیں ہمیں شادی کی ایک ایک بات ساری زندگی یاد رہتی ہے اور ایک ہم ہیں۔

کچھ دنوں بعد میاں جی سے بھی پوچھا آپ نے مجھے کیا کہا تھا۔ کہتے ہیں دوست نے ایک کتاب تحفے میں دی تھی اس پر کچھ لکھا تھا وہ ہی کہا تھا (لو جی سن لو)

س 9: شادی کے بعد خاص تبدیلی؟

ج: مجھے لگتا ہے میں پہلے ذرا بے وقوف تھی اب سمجھ دار ہو گئی ہوں (میاں جی کا خیال اس سے الٹ ہے)

س 10: کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: جی شادی کے ایک ہفتے بعد اپنی خوشی و مرضی سے جیٹھانی ہماری امید سے تھیں اور ہم کام کرتے نہ تھکتے، بس میاں جی کا پیار ہمیں ہواؤں میں رکھتا اور ہم اڑتے پھرتے۔ لیکن اللہ کا شکر شادی کے دو سال بعد ہم الگ ہو گئے۔

س 11: میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟

ج: شادی خاندان میں ہوئی ہے۔ سب ہی کھانا بنانے میں ماہر ہیں۔ میں نے کھانا بنانا شادی کے بعد شروع کیا اور جو کام دل سے کیا جائے اور ساتھ محنت بھی ہو تو پھر یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ کام اچھا نہ ہو۔

س 12: سسرال میں کن باتوں پر تعریف یا تنقید؟

ج: میرے ساس اور سسر حیات نہیں۔ ایک نند اور چار جیٹھ جیٹھانیاں ہیں۔ تعریف منہ پر تو کبھی نہ کی ہاں تنقید ہوتی رہتی ہے۔

آپ کو ایک بات بتاؤں میں کوشش کرتی ہوں خود کو مصروف رکھنے کی۔ عورتوں والی عادات (جیسکے لگانا، غیبتیں کرنا) سے خود کو دور رکھنے کی، حالانکہ بہت مشکل ہے۔ اور ہاں میرے سسرال والے اکثر اپنی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ان جیسا نیک، شریف، اور ہاں خوب صورت کوئی نہیں۔

س 13: سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج: جی جو توقعات تھیں وہ منگنی کے عرصے میں ہی دھڑام سے گر گئیں۔ شادی خاندان میں ہوئی، شادی کے پہلے دو سال صرف ایک جیٹھ جیٹھانی کے علاوہ سب ناراض بول چال بند، ہماری شادی میں شرکت بھی غیروں کی طرح کی۔ شکر ہے جلد ہی سب نے بناوٹی چولے اتار پھینکے۔

س 14: پہلے بچے کی پیدائش؟

ج: پہلا بچہ شادی کے چھ سال بعد ہوا بہت مشکل وقت لگا لیکن گزر گیا اور اب میں چار بچوں کی اماں جان ہوں۔ زندگی کی ایک بڑی خواہش ہے کہ بچوں کی اچھی تربیت کر سکوں۔

س 15: سسرال میں مقام؟

ج: الحمدللہ عزت کرتے ہیں ہم سب کی اور عزت کرواتے ہیں۔ اللہ نے اپنا گھر بھی دے دیا۔ میرے میاں جی نے خود کو منوایا ہے۔

اور لوگ کبھی آپ کو آپ کا اصل مقام نہیں دیتے اور مجھے تو خواہش بھی نہیں جتنا جتن ہم انسان کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں اپنے رب کو خوش کرنے کی کوشش کر لیں تو وہی سب مقام مقرر کرنے والا ہے۔

س 16: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: جی مجھے علیحدہ رہنا پسند ہے۔ حالانکہ میری شروع میں یہ خواہش نہیں تھی۔ اگر میرے ساس سسر حیات ہوتے تو یقیناً میں ان کے ساتھ رہنا پسند کرتی کیونکہ بزرگوں کا پیار اور ساتھ انمول ہے۔ لیکن اپنی فیملی کے حالات دیکھ کر شکر کرتی ہوں ہم الگ رہتے ہیں۔

س 17: میکے اور سسرال میں فرق؟

ج: میں نے بتایا میری شادی خاندان میں ہوئی ہے تو سسرال والے بھی میرے اپنے ہی ہیں۔

مجھے ایک چیز جو کبھی بھی پریشان کرتی ہے وہ ہے کہ ہماری فیملی ماڈرن ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ نے سب کو صحت عزت و دولت سے نوازا ہے لیکن سب نئے رنگ ڈھنگ اپنانے کے چکر میں پتا نہیں کیا سے کیا بن رہے ہیں، بس اللہ کی ذات ہی ہدایت دینے والی ہے۔

س 18: شوہر سے تعلقات؟

ج: میں نے کبھی بھی اونچے اونچے خواب نہیں دیکھے اپنی نیت کو ہمیشہ صاف رکھا۔ اور میرے رب نے مجھے اچھے لوگوں کا ساتھ دیا۔

میرے میاں جی مزاج اور طبیعت کے نرم ہیں میں اپنی ہر بات ان سے شیئر کرتی ہوں۔ ہمارے آپس کے تعلقات دوستانہ ہیں۔ یہ محبت کے اظہار میں کنجوس اور میں فراخ دل ہوں، میری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں جی کبھی میاں جی غصے میں آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں (تو کون نہ میں کون) لیکن جی اب انسان ہیں فرشتے تو نہیں۔ جو بات بری لگے فوراً سے کہہ دیتے ہیں۔ میں تو جب ان کا غصہ اترتا ہے تب اپنے دل کی بات کرتی ہوں۔

اللہ پاک سے دعا ہے وہ ہمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پورا کرنے کی توفیق دے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆

دستک دستک

دستکہ

شاہین رشید

شیف ثنا راحیل

کچھ عرصے سے یوٹیوب چینل پہ meaty chick کے پکوان اور دیگر ایکٹو یٹیز دیکھ رہی تھی۔ پکوان کے چینل میں دیگر ایکٹو یٹیز تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ چینل دیگر چینلز سے ذرا مختلف تھا۔ چنانچہ اس چینل کی میزبان ثنا راحیل سے رابطہ کیا تو کچھ سوالات جو ذہن میں تھے پوچھ لیے۔ جو لوگ اپنا چینل کھولنا چاہتے ہیں ان کے لیے بھی یہ انٹرویو کارآمد ہوگا۔ ثنا راحیل کا تعلق پاکستان سے ہے۔ مگر رہتی وہ دبئی میں ہیں۔

”کیا حال ہیں ثنا راحیل؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”ثنا! آپ کو کیسے خیال آیا کہ اپنا ایک چینل ہو، جس میں اپنا ہنر اور اپنی مصروفیات لوگوں سے شیئر کروں؟“

”لاک ڈاؤن میں بہت سی باتیں سوچتی تھی کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو مصروف رکھیں اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی بیکار نہیں بیٹھی نا صرف جاب کی بلکہ اپنا بزنس بھی چلایا۔

اور جب لاک ڈاؤن ہوا تو صرف میرا نہیں بلکہ ہمارے گھر والوں کا، میرے میاں کا فیملی کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزر رہا تھا۔ روزانہ ہی کچھ نہ کچھ اسپیشل پک رہا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے پروفیشنلی لیا جائے چنانچہ اس آئیڈیے کو گھر والوں سے شیئر کیا اور اُتر آئے ہم میدان میں اور باقی تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں کہ ہماری کیا کیا ایکٹو یٹیز ہوتی ہیں۔“

”اپنا چینل کھولنے کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟ کچھ پے منٹ کرنی پڑتی ہے، اجازت لینی پڑتی ہے، کیا کرنا ہوتا ہے؟“

”چینل کو مونوٹائز کرانے کے لیے آپ کو ایک ہزار سبسکرائبر اور چار ہزار گھنٹے پورے کرنے ہوتے ہیں اور یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ مسلسل ویڈیوز ڈالنی پڑتی ہیں لوگوں سے رابطے میں رہنا پڑتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کی ویڈیوز دیکھیں، سبسکرائب کریں اور لائک بھی کریں تب آپ کا چینل مونوٹائز ہوگا۔“

”میں دیکھتی ہوں کہ اب آپ کے چینل کو اشتہار بھی ملنے لگے ہیں۔ پروگرام کے شروع میں یا درمیان میں ایک ایڈ ضرور ہوتا ہے۔ تو کیا اس کی پے منٹ آپ کو ملتی ہے؟“

”اشتہار کی پے منٹ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک ہم ”یوٹیوب“ کو سو ڈالر کما کر نہ دیں۔ یوٹیوب چینل ٹھر و پراپر چینل چلتا ہے، ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ میرا چینل مونوٹائز ہوگیا ہے۔ مجھے اشتہار مل رہے ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد میں یوٹیوب کو کما کر دوں گی۔ اس کے بعد میری اپنی کمائی شروع ہوگی ان شاء اللہ ابھی تھوڑا سفر اور باقی ہے مگر جلدی منزل مل جائے گی۔“

”آپ کے کوکنگ چینل کا نام دیگر چینل سے ذرا مختلف ہے۔ تو یہ کس کی سوچ ہے؟“

”جب ہمیں چینل کھولنے کا خیال آیا تو ہم نے خاص طور پر اس بات کا جائزہ لیا کہ چینل کے نام کیا ہیں تو زیادہ تر چینل کوکنگ ود ...... یعنی نام کے ساتھ تھے تو ہم نے سوچا کہ اگر ہم بھی نام پر رکھیں گے تو

ہماری انفرادیت کیا رہے گی۔ چنانچہ سب کی مشترکہ رائے سے meaty chick رکھا جو کہ نہ صرف تھوڑا منفرد تھا بلکہ یورپین اسٹائل کا بھی تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ باہر کے ملک والے بھی اس کو باآسانی سرچ کر سکیں۔"

"کیمرے کے سامنے آپ بہت پر اعتماد نظر آتی ہیں۔ پہلی بار کیمرہ فیس کیا تو کیا کیفیت تھی؟"

"پہلی بار کیمرہ فیس کرتے ہوئے مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، کیونکہ جب میں پاکستان میں تھی تو ٹیچنگ کرتی تھی تو مجھے ایسا ہی لگا کہ جیسے میں اسٹوڈنٹ کو پڑھا رہی ہوں اور ہر چیز کو ایکسپلین کر رہی ہوں..... اور میرا انداز یہی ہے کہ ہر چیز کو نیچرل انداز میں ایکسپلین کروں تاکہ سب اچھی طرح سیکھ لیں..... اور میری بات کو سمجھ لیں بہتر طریقے سے۔"

"اس کام کے لیے آپ کے پاس ٹیم ہے کیا؟"

"ہمارے ویڈیوز کے لیے یا اس کام کے لیے تین افراد کی ٹیم ہے۔ میری ویڈیوز میرے شوہر راحیل بناتے ہیں وہ ہی ایڈٹ کرتے ہیں۔ بہت ڈانٹ بھی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی کچھ غلط ہو جائے یا حماقت سرزد ہو جائے یا کچھ بھول جاؤں تو پھر ڈانٹ پڑتی ہے..... مگر اب عادت ہو گئی ہے غلطیاں کم ہوتی ہیں اور فیوچر میں مزید غلطیاں نہیں ہوں گی اور ہم پروفیشنل ویڈیوز بنا سکیں گے اور میرے شوہر اتنی اچھی ویڈیوز بناتے ہیں کہ وہ پروفیشنل ہی لگتی ہیں۔ درحقیقت راحیل کو بھی اس کام کا کافی تجربہ ہے۔ وہ گانوں کی اور دبئی کے خوب صورت مقامات کی کافی ویڈیوز بنا چکے ہیں۔ جو "یوٹیوب" پہ چلتی رہتی ہیں اکثر و بیشتر۔"

"کوکنگ میں مہارت کس سے حاصل کی اور کہیں ٹریننگ کلاسز بھی لیں؟"

"میں چونکہ گھر میں اپنے بہن بھائی سے بڑی ہوں تو میں نے کوکنگ اپنے بڑوں سے سیکھی ہے۔ اپنی نانی دادی سے۔ اپنی خالاؤں اور امی سے... بچپن سے ہی مجھے کچن سے لگاؤ تھا تو سیکھتی رہتی تھی اور جب بڑی ہوئی تو میرا دل چاہا کہ میں اس میں اور بھی زیادہ مہارت حاصل کروں چنانچہ میں نے کوکنگ کلاسز بھی لیں۔

اب تو مجھے مسالوں کے ٹیسٹ کا بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ کون سا مسالا شامل کروں گی تو کیا ذائقہ آئے گا..... اور جب میں چائنیز اور اٹالین کھانے کھاتی ہوں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں انہیں خود بھی بنا سکتی ہوں۔ بلکہ اصل چائنیز اور اٹالین سے بھی زیادہ اچھا اور زبردست طریقے سے بنا سکتی ہوں۔ مسالوں کی پہچان اور مقدار اور چٹ پٹے کس طرح بنا سکتے ہیں یہ سب اب پتا چل گیا ہے اور سب کو پتا بھی ہونا چاہیے۔"

"ثنا! آپ کی ویڈیوز میں اب اچھی خاصی ورائٹی نظر آتی ہے۔ کبھی ایوننگ واک تو کبھی دبئی کی میٹرو کی سیر تو مزید کیا چینج لانے کا ارادہ ہے کہ ویڈیو زیادہ سے زیادہ دیکھی جائے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر انسان یکسانیت سے

بور ہو جاتا ہے...... اور یکسانیت والے کام زیادہ عرصہ چلتے بھی نہیں ہیں اس لیے میں اس بات کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ ہم اپنے پروگرام کو کچن تک ہی محدود نہ رکھیں۔

میرے میاں صاحب بھی مجھے بہت اچھے آئیڈیاز دیتے رہتے ہیں جن پر ہم دونوں دلجمعی سے کام کرتے ہیں۔ اس لیے اکثر و بیشتر جب ہم کہیں پکنک پہ جاتے ہیں تو لائیو کوکنگ بھی دکھاتے ہیں۔ بیٹے کے ساتھ گئی تو اس کی بھی سیر ہو گئی اور دبئی کی سیر ناظرین کو کرا دی اور میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کی ویڈیوز لوگ زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں۔ اب آپ ہمارے کانٹینٹ میں کافی چینج دیکھیں گی، لوگ دیکھیں گے کہ ثنا کوکنگ کے علاوہ کیا کیا کرتی ہے۔"

"آپ اپنے پروگرام میں گھریلو ٹوٹکے اور کھانوں کی ہسٹری بھی بتایا کریں کہ کون سا کھانا کس شہر یا کس صوبے کا ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے۔"

"جی...... جی بالکل...... ہم عنقریب ٹپس بھی دینا شروع کریں گے۔ جس میں فوڈ، ہیلتھ، بیوٹی ٹپس سب شامل ہوں گی۔ بلکہ ہر طرح کی ٹپس شامل ہوں گی۔ کھانوں میں کچھ زیادہ کم ہو گیا ہے تو اس کو بیلنس کیسے کریں گے۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہماری ویڈیوز میں کوئی نہ کوئی انفارمیٹو چیز ضرور شامل ہو۔

اور ہم کھانوں کی ہسٹری بھی ضرور بتائیں گے اور آپ نے ٹیم کے بارے میں پوچھا تھا تو جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ تین افراد پر مشتمل ہماری ایک ٹیم ہے جس میں 'میں'، میرے شوہر راحیل اور میری بہن انعم انیل شامل ہیں۔ میری بہن انعم میرے لیے مارکیٹنگ کرتی ہے میں کچن سنبھالتی ہوں تو وہ یہ دیکھتی ہے کہ لوگوں سے کس طرح رابطے میں رہنا ہے...... کس ملک کو زیادہ فوکس کرنا ہے، کون سے لوگوں کو فوکس کرنا ہے، میرے ویوز کیسے بڑھانے ہیں۔ میرے سبسکرائبرز کیسے بڑھانے ہیں، نئے آئیڈیا دیتی ہے وہ میری بہت ہیلپ کرتی ہے۔ اس طرح راحیل میری ویڈیوز شوٹ کرتے ہیں۔ ایڈیٹنگ کرتے ہیں مجھے اچھے اچھے آئیڈیاز دیتے ہیں جن پر ہم تینوں کام کرتے ہیں۔"

"اوکے ثنا راحیل ان شاء اللہ پھر بات کریں گے، وقت دینے کا شکریہ۔"

سلمان سعید

"کیسے مزاج ہیں؟"

"شکر ہے اللہ کا۔"

"شادی مبارک ہو۔ ماشاء اللہ بیگم تو بہت پیاری ہیں آپ کی......؟"

"شکریہ آپ کا۔"

"آج کل آپ کا سیریل "بھڑاس" دیکھ رہی ہوں۔ بہت ہی شریف بھائی کا رول کر رہے ہو، ورنہ زیادہ تر تو نیگیٹو رول میں ہی دیکھا ہے؟"

"جی...... جی...... میرا تو دل چاہتا ہے کہ ہر طرح کے رول کروں...... اور جب اچھے رول ملتے ہیں تو ضرور کرتا ہوں آپ صحیح کہہ رہی ہیں کہ میں نے نیگیٹو رول زیادہ کیے ہیں۔

''ویسے نگیٹو کردار کرنے میں مشکل ہوتی ہے یا رومینٹک رول میں؟''

''نگیٹو رول میں نگیٹو ہونا پڑتا ہے۔ جبکہ رومینٹک رول نیچرل انداز میں ہو جاتا ہے اور آسان بھی یہی لگتا ہے مگر چیلنجنگ رول کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔''

''کتنے سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں اور بھائی ہمایوں سعید کی وجہ سے آمد ہوئی؟''

''مجھے اس فیلڈ میں تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں اور بھائی تو کافی سالوں سے ہیں تو مجھے سب ہی جانتے ہیں تو کوئی مشکل اور پریشانی نہیں ہوئی۔''

''اداکاری کے علاوہ کن چیزوں کا شوق ہے؟''

''کرکٹ کھیلنا مجھے بہت پسند ہے اور ٹریولنگ کا تو بے حد شوقین ہوں، پوری دنیا گھومنا چاہتا ہوں اور کرکٹ بھی میں ہر ویک اینڈ پہ ضرور کھیلتا ہوں۔''

''اپنی فٹنس کے لیے کیا کرتے ہیں۔ جم یا ڈائٹنگ؟''

''مجھ پر اللہ کا کرم ہے۔ وہ مجھے موٹا نہیں ہونے دیتا اور میں ڈائٹنگ نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کھاتا ہوں اور شوق سے کھاتا ہوں۔''

''اب تک کتنے ڈرامے کر چکے ہیں ...... ہو سکے تو نام بھی بتا دیں؟''

''بہت زیادہ نہیں کیے، یہی کوئی پچیس، تیس کیے ہوں گے۔ جو نام یاد ہیں بتا دیتا ہوں آپ کو۔ ''یہ شادی نہیں ہو سکتی، بھڑاس'' آج کل چل رہا ہے۔ ''میرا دل میرا دشمن'' بہت شہرت پائی اس سیریل نے ''تکبر، مراسم، خود غرض، بھروسہ، دو بول'' وغیرہ وغیرہ۔''

''مطالعہ کا شوق ہے؟''

''نہیں، کوئی خاص نہیں...... ویسے بھی مجھے پڑھنے سے زیادہ سننا اور دیکھنا پسند ہے۔ جیسے موویز وغیرہ۔''

''اپنی عزت شہرت دیکھ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟''

''خوشی تو بہت ہوتی ہے۔ مگر ایک بات کا بہت افسوس ہوتا ہے کہ میرے والدین میرے ساتھ ہوتے تو کتنا اچھا لگتا۔''

''او کے سلمان! آپ کا کوئی نیا سیریل آئے گا تو بات کروں گی۔''

''یقیناً۔''

☆

بندھن

فضا احسن ہمراہ عابد جمیل

شاہین رشید

فضا حسن کا تعلق آواز کی دنیا سے ہے۔ ریڈیو کرتی ہیں۔ ڈبنگ بھی کرتی ہیں اور ان کا تعلیم و تدریس سے بھی تعلق ہے۔ "بندھن" کے لیے ان سے جو گفتگو ہوئی۔ آپ بھی پڑھیے۔

"کیا حال ہیں فضا!"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ گھر داری کے علاوہ؟"

"صاف بات ہے کہ گھر داری تو میں بالکل بھی نہیں کرتی۔ ساس سسر کے ساتھ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں...... ہمارے پاس چوبیں گھنٹے کے لیے "خانساماں" ہے اور دیگر ملازم بھی ہیں...... اب میرا تعلق ایجوکیشن سینٹر سے ہو چکا ہے۔ اور ایجوکیشن سینٹر میں کچھ عرصہ میں نے بچوں کی کونسلنگ کی ہے...... بنیادی طور پر میرا کام بھی کونسلنگ ہی ہے...... اس کے علاوہ میں ایڈمنسٹریٹر سائیڈ سے اسکول کی ایڈمنسریشن میں ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں "ڈبنگ" بھی کر رہی ہوں۔ "ارطغرل غازی" کے سیزن تھری میں...... اور میں نے کافی عرصے کے بعد میڈیا کو دوبارہ جوائن کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بچیاں بہت چھوٹی تھیں خاص طور پر دو بیٹیوں کے درمیان گیپ کم تھا تو ان کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔"

"بندھن کے سلسلے کا پہلا سوال اپنے بارے میں اور اپنے میاں عابد جمیل صاحب کے بارے میں بتائیں کہ کہاں سے تعلق ہے۔ مطلب فیملی بیک گراؤنڈ؟"

"میرا تعلق اردو اسپیکنگ فیملی سے ہے۔ ہم لوگ سید ہیں۔ کراچی سے تعلق ہے اور ہماری فیملی کافی مختصر سی ہے۔ میں، میرا بھائی اور والدین ہیں۔ میرے میاں صاحب عابد جمیل چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن اور ساس سسر، میں مختصر سی فیملی سے بھرے گھر میں گئی شادی کے بعد...... میرے میاں صاحب بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں...... بڑی بہن ہیں پھر دو بھائی اور پھر عابد......"

"شادی کو کتنے سال ہو گئے اور اپنوں میں ہوئی یا غیروں میں۔"

"میری شادی اپنوں میں ہی ہوئی ہے۔ شادی کو ماشاء اللہ سے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ 2010 میں شادی ہوئی تھی۔ اور ہماری ارینج میرج تھی۔ جون 2010ء میں شادی ہوئی اور جون 2021 میں پورے گیارہ سال ہو جائیں گے۔ اور ماشاء اللہ سے میری تین بیٹیاں ہیں...... بڑی بیٹی نو سال کی ہے۔ دوسری بیٹی پونے تین سال کی اور چھوٹی بیٹی ابھی ایک سال کی ہوئی ہے ان کے نام بالترتیب۔ آمنہ عابد، جمیل، فاطمہ عابد جمیل اور زینب عابد جمیل ہیں۔"

"شادی کو زیادہ عرصہ ہو جائے تو محبت کم ہو جاتی ہے؟ سمجھوتے پر زندگی گزر رہی ہوتی ہے؟ یا پھر محبت میں اضافہ ہوتا ہے؟"

"ہاں، لوگ کہتے ہیں شادی کو زیادہ عرصہ گزر جائے تو شادی پھیکی ہو جاتی ہے۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ان دس گیارہ سالوں میں، میں اور میرے شوہر ایک دوسرے کو ابھی تک (Unfold) ہی کر رہے

ہیں۔ ہمارے درمیان بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو نئی نئی پتا چل رہی ہوتی ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرے رویے میں۔ میری عادات میں بہت تبدیلیاں آگئی ہیں۔ یہی حال میرے شوہر کا بھی ہے تو ہم آہستہ آہستہ نہ صرف ایک دوسرے کو سمجھتے جا رہے ہیں بلکہ اپنے حساب سے ایڈجسٹ بھی کرتے جا رہے ہیں۔ کہیں کمپرومائز میں کرتی ہوں اور کہیں کہیں وہ بھی کرتے ہیں۔ اور زیادہ کمپرومائز میرے شوہر کرتے ہیں۔ میں آج جہاں بھی کھڑی ہوں اپنے شوہر کی سپورٹ کی وجہ سے ہوں، وہ میرا ہیلپنگ ہینڈ ہیں۔ میری فیملی میں میری امی نے مجھے موٹیویٹ کیا اور شادی کے بعد میرے شوہر نے مجھے موٹیویٹ کیا۔ جو میں سوچتی ہوں اس پر ان کا یہی جواب ہوتا ہے کہ ”ہاں بس ہو جائے گا۔“

”پہلی ملاقات کا احوال بتائیں؟“

”یہ اکثر و بیشتر ہمارے گھر آتے تھے اور ہم سلام کر کے اٹھ جاتے تھے۔ کیونکہ بڑوں میں بیٹھنا ہمارے گھر میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ پڑھائی میں فوکس رہنے کا کہا جاتا تھا تو ایسی کوئی ملاقات تھی نہیں۔

ہاں ایک شادی میں، میں نے کالے رنگ کا ڈریس پہنا ہوا تھا تو بقول عابد صاحب کے کہ جب میں نے آپ کو کالے ڈریس میں، گھٹنوں تک لمبے کھلے بالوں میں دیکھا تو میں ادھر ادھر دیکھنا ہی بھول گیا۔ اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ لڑکی کون ہے۔“ پھر میں نے اپنے کزن سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ کیا تم انہیں پہچانے نہیں؟ یہ چندا خالہ (میری دادی کو سب چندا خالہ کہتے تھے) کی پوتی ہے تو کہنے لگے کہ میں کئی بار ان کے گھر گیا ہوں۔ مگر مجھے تو دکھائی نہیں دی یہ۔ کزن نے کہا کہ تم ان سے زیادہ بات نہیں کرنا یہ غصے کی بہت تیز ہے خواہ مخواہ ”عزت افزائی“ ہو جائے گی...... بات آئی گئی ہو گئی۔

پھر جب میری دادی کا انتقال ہوا تو ان کی والدہ ہمارے گھر آئیں اور مجھے دیکھ کر کہا (میرے والدین سے) ان کی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے...... تو والدین نے کہا کہ ہماری اماں تو چلی گئیں، اب آپ بڑی ہیں آپ بتائیں کوئی رشتہ ہو تو۔

انہوں نے گھر جا کر میرا ذکر کیا کہ عابد کے لیے مجھے لڑکی بہت پسند آئی ہے...... پھر انہوں نے ہمارے گھر میں بات کی...... گھر میں کیا بات ہو رہی ہے، مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ان سے میرا رشتہ ہونے والا ہے۔ ہمیں ان کے گھر بلایا گیا...... تو ہم بھی ساتھ گئے کہ سب دعوت پر جا رہے ہیں ہم بھی چلتے ہیں...... جبکہ صبح کے وقت ہمارا ریڈیو پر پروگرام بھی تھا۔

ان کی بہن بھی آئی ہوئی تھیں، وہ ڈاکٹر ہیں اور بہت مصروف رہتی ہیں مگر اس دن خاص طور پر مجھ سے ملنے آئی ہوئی تھیں...... دعوت کھائی گھر آ گئے۔

کچھ نہیں پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے...... مگر گھر آنے کے بعد والد صاحب نے اس رشتے کے بارے میں بات کی کہ ہم یہاں آپ کا رشتہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اتنی اچانک کی بات ...... میں تو خاموش ہی رہی کہ جو ماں باپ فیصلہ کررہے ہیں۔ وہ یقیناً ٹھیک ہی ہوگا، سرخم تسلیم کردیا۔"

"گیارہ سال پہلے کی شادی اور آج کل کی شادیوں میں کوئی فرق آیا ہے کیا؟"

"اب کی شادی میں شششکے بازی (شوبازی) زیادہ ہوگئی ہے۔ پہلے ویڈیوز بنتی تھیں، ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر فوٹو سیشن ہوتے تھے۔ مگر اب دلہن دولہا کی بچپن کی تصاویر ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا، فوٹو سیشن اور ویڈیوز کے ساتھ ساتھ اب اس چیز کا بھی اضافہ ہوگیا ہے کہ دولہا دلہن آتے ہیں تو ہال کی ساری لائٹیں بند کرکے مہمانوں کے صبر کا امتحان لیا جاتا ہے اور ساری لائٹس دولہا دلہن پر فوکس ہوتی ہیں...... ہماری شادی الحمدللہ بہت سادگی سے ہوئی اور ایک بات پر مجھے بہت فخر ہے کہ میں روایتی دلہنوں کی طرح پورے دس دن مایوں بیٹھی تھی اور ان دس دنوں میں آسمان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ کسی غیر نے ہماری شکل نہیں دیکھی تھی۔ البتہ گھر میں چلنے پھرنے کی آزادی تھی۔

اور سارے لاڈ میرے چھوٹے بھائی نے خاص طور پر اٹھائے تھے۔ آج کل تو نہ سادگی کا رجحان ہے نہ روایتوں کی پاس داری ہے۔"

"ملنے یعنی ملاقات کی اجازت ہوتی تھی؟ عمروں کا فرق کتنا ہے؟"

"میرے سسر ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں اور ساس بھی بہت براڈ مائنڈڈ ہیں اور ان کا رہن سہن بالکل بھی دقیانوسی نہیں ہے۔ تو ملاقات بھی ہوتی تھی اور ڈنر بھی اور اکثر و بیشتر مجھے پک اینڈ ڈراپ دیتے تھے جب میں ریڈیو پر کام کرتی تھی اور یہ بات میرے گھر والوں کو بھی اور ان کے گھر والوں کو بھی پتا تھی۔ نومبر میں منگنی ہوئی اور جون میں شادی اور عمروں کا بھی کوئی بہت فرق نہیں ہے۔ یہ مجھ سے صرف پانچ سال بڑے ہیں۔"

"نکاح نامہ پڑھا تھا؟ اور نام چینج کیا؟"

"نکاح نامہ نہیں پڑھا تھا کیونکہ شادی کے سارے معاملات ہمارے بڑے ہی طے کرتے ہیں اور نام بھی نہیں بدلا ...... میری ساس کا دل تھا کہ میں اپنے نام کے ساتھ عابد کا نام لگاؤں۔ مگر میں نے انہیں طریقے سے سمجھایا کہ ولدیت جاتی ہے بیٹیوں کے نام کے ساتھ اور بیٹی ہونے کے ناتے میرے والد کا نام میرے نام کے ساتھ ہمیشہ لگا رہے گا۔ اگر مجھے بیگم کرکے پکارا جائے گا تو میں بیگم عابد جمیل ہوں اور اگر میرا نام پکارا جائے گا تو میں فضا احسن ہی رہوں گی۔"

"شادی کے بعد شہر بدر ہوئیں ...... اور کیا جوائنٹ فیملی ملی؟"

"شادی کرکے میں جوائنٹ فیملی میں آئی...... اور میرے شوہر گھر میں سب سے چھوٹے ہیں اور ان کے بڑے بھائی اور عابد میں تیرہ سال کا فرق ہے تو میری ساس اکثر کہتی ہیں کہ یہ میرے بڑھاپے کی اولاد ہے۔ تو مجھے تو نہ بہو سمجھا گیا نہ دیورانی بلکہ ایک چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کیا گیا۔ میری نند اور ان کے بچے مجھے اپنے سے تھوڑا سا بڑا سمجھتے ہوئے کہتے تھے کہ ایک نیا ایڈیشن آیا ہے ہمارے گھر میں۔

تو رونق اور ہلا گلا رہتا تھا گھر میں...... لہٰذا مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی...... گھر کے سارے امور ساس کے ہاتھ میں ہیں اور ملازمین ہیں ہر کام کے لیے...... اور گھر میں سب کے دل ایک دوسرے کے لیے بہت کشادہ رہے اور ہیں...... پھر کچھ عرصے کے بعد ہم سب الگ الگ ہوگئے...... ڈی ایچ اے میں جب ہمارا گھر بنا تو ہم سب الگ الگ ہوگئے۔

اور اب 2019 میں ہم سب پھر ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اور یہ خواہش میرے ساس سسر کی تھی اور اس عمر میں کوئی بھی ان کی خواہش کو رد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو پھر سے زندگی انجوائے کررہے

ہیں۔"

"ان گیارہ سالوں میں کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے سوچا کہ کاش میری شادی نہ ہوئی ہوتی؟"

"بالکل...... ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ یہ سوچتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا...... تو جب بھی حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو پھر خیال آتا ہے کہ کہ ایسا نہ ہوا ہوتا اور زندگی مزے کی گزر رہی ہوتی۔

مگر پھر سوچتی ہوں کہ اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو پھر یہ تین پیاری پیاری بیٹیاں کہاں سے آتیں؟...... اتنا پیارا سسرال نہ ہوتا اور...... لڑنے جھگڑنے کے لیے ہر عورت کو ایک شخص کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام "شوہر" ہے تو اپنی غلطیاں دوسروں کے سر ڈالنے کے لیے شوہر بھی بہت ضروری ہے (ہنستے ہوئے) لڑائی جھگڑے، اونچ نیچ زندگی کا حصہ ہیں۔ تو شادی کرنا اور گھر بسانا اچھا قدم ہے...... زندگی میں سکون اور اطمینان آ جاتا ہے۔"

"اپنے میاں صاحب کے بارے میں بتائیں کہ کس مزاج کے ہیں؟"

"مزاج کے اچھے ہیں، غصے والے نہیں ہیں...... بس کبھی کبھار لہجے میں جھنجلاہٹ آ جاتی ہے...... اور وہ بھی اس وقت جب ہم ایک دوسرے کی زندگی میں زیادہ عمل دخل کرنے لگتے ہیں...... عابد کے مقابلے میں ذرا مزاج کی تیز ہوں...... کھانے پینے کی میں بھی شوقین ہوں اور یہ بھی شوقین ہیں......

انہیں کچن سے بھی لگاؤ ہے۔ پکانے اور نئے نئے تجربات کرنے کا بھی شوق ہے اور وہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ ــ کچن میں جائیں اور ایسا کچھ پکائیں کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ مگر ایسا کبھی ہوا نہیں۔ ان کا پکایا صرف انہیں ہی پسند آتا ہے...... یا پھر ہماری بڑی بیٹی کو...... کیونکہ یہ دونوں باپ بیٹی بالکل چائنیز کی طرز کا پھیکا کھانا پسند کرتے ہیں۔"

"سوشل کون ہے؟ آپ یا وہ؟ رومانٹک مزاج کون ہے؟"

"میرا سوشل سرکل بہت محدود ہے۔ میں بالکل مختلف شخصیت کی مالک ہوں...... میرے لیے میرا گھر، میری فیملی اور میری پرائیویسی بہت اہم ہے...... جبکہ ان کا سوشل سرکل بہت ہے۔ روزانہ دوست احباب سے ملنا جلنا اٹھنا بیٹھنا بہت ہے...... اور میں رومانٹک مزاج نہیں ہوں یہ بہت ہیں...... میں بہت پریکٹیکل ہوں...... بہت آرگنائزڈ ہوں۔"

"لڑائی جھگڑے میں پہل کون کرتا ہے؟"

"لڑائی جھگڑے میں پہل میری طرف سے ہی ہوتی ہے۔ مجھے چیزیں ترتیب میں آرگنائزڈ طریقے سے چاہیے ہوتی ہیں وہ اگر ادھر ادھر ہو جائیں تو میرا موڈ بگڑ جاتا ہے۔ اور شروع شروع میں منانے میں پہل یہی کرتے تھے۔ مگر پھر انہیں اندازہ ہو گیا کہ میرا مزاج بھی خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے اور کسی کے منانے سے میں جلدی مان نہیں جاتی...... کیونکہ جب تک میں خود کو ٹھنڈا نہیں کر لیتی کسی کو نہ سمجھ پاتی ہوں اور نہ ہی سمجھا پاتی ہوں...... تو مجھے منانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور یہ بات اتنے سالوں میں یہ سمجھ ہی گئے ہیں۔ کوئی منائے تو غصہ زیادہ بڑھ جاتا ہے میرا...... مجھے ایک ٹائم چاہیے ہوتا ہے کول ڈاؤن ہونے کے لیے۔"

"چیزوں کو ترتیب سے رکھنا کس سے سیکھا۔ پھر جب گھر سے باہر ہوتی ہیں تو گھر کو کیسے مینیج کرتی ہیں؟"

سب چیزوں کو مینیج کرنا میں نے اپنی والدہ سے سیکھا ہے۔ ہم نے اپنے بچپن سے اپنی والدہ کو کام کرتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ وہ ایک ورکنگ لیڈی ہیں...... وہ ایجوکیشن فیلڈ سے وابستہ رہی ہیں اور ابھی بھی کسی پرائیویٹ اسکول میں باحیثیت پرنسپل کے کام کر رہی ہیں...... تو جب بچپن سے والدین کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو پھر اپنی لائف کے لیے بھی اس ترتیب کو سیکھا......

والدین جب گھر سے باہر جاب کے لیے جاتے تھے تو ہم دادا دادی کے ساتھ رہتے تھے اور اب

جب ہم میاں بیوی جاتے ہیں تو میرے بچے اپنے دادا دادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور میری بڑی پہلی بیٹی اگر چہ نو سال کی ہے مگر وہ بالکل میری طرح آرگنائزڈ ہے۔ میرے پیٹرن کو سمجھتی ہے...... میرے مزاج کو بھی سمجھتی ہے کہ مما کو کیا چیز اچھی لگے گی اور کیا بری لگے گی۔

''پہلی اولاد کی امید کے وقت سسرال اور میاں کا کیاری ایکشن تھا؟''

پہلی اولاد کی امید شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی لگ گئی اور میاں صاحب اس خوش خبری کو سن کو بوکھلا گئے کہ یا اللہ میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں...... میرے گھر والوں کا ری ایکشن بہت ہی مزیدار تھا۔ خاص طور پر ساس کا، بے ساختہ بولیں ''اتنی جلدی ابھی تو تم نے انجوائے بھی نہیں کیا لائف کو'' مگر وہ خوش بہت ہوئیں اور گھر میں سب ہی بہت خوش تھے۔''

''کبھی روٹھ کے میکے جانے کا موقع آیا؟''

''نہیں کبھی نہیں...... کیونکہ میرا میکہ اور میرا سسرال تقریباً ایک ہی ہیں۔ اور میری ساس ماشاء اللہ اپنی بہوؤں کے معاملے میں ایسی ہیں کہ اگر کوئی بات ہو بھی جائے تو وہ پہلے بیٹوں کے مزاج کی صفائی کرتی ہیں۔ پھر کچھ اور بات ہوتی ہے تو ہم سب کو اپنے شوہروں کی شکایت کرنی ہوتی ہے تو ہم بلا جھجک اپنی ساس سے شکایت کر دیتی ہیں اور وہ اپنے بیٹوں کے کان کھینچتی ہیں۔

ماشاء اللہ گھر کا ماحول بہت اچھا ہے۔ شوہر بہت کوآپریٹو ہیں۔ انہوں نے مجھے ناراض ہی نہیں ہونے دیا اور کبھی میں روٹھ بھی جاتی تھی تو مجھے منا کر ہی انہیں چین آتا تھا۔

''شادی کے بعد جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اس کا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟''

''میرا ماننا یہ ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کی نوبت اس لیے آتی ہے کہ آپ کے اور آپ کے پارٹنر کے درمیان کمیونیکیشن نہیں ہو رہی ہوتی۔ تیسرا شخص تو خواہ مخواہ ہی ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب آپ خود ہی ایک دوسرے کو نہیں سمجھ پائیں گے، تب ہی تو تیسرا آپ کے درمیان آئے گا۔ تو بس میاں بیوی ہی بنیاد ہوتے ہیں اور انہوں نے ہی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہوتا...... آپ کانوں کے کچے ہیں تب ہی تو تیسرا آپ کے کان بھرے گا۔ یہ تو رشتہ ہی پیار محبت، اعتماد اور بھروسے کا ہے۔''

''سسرال میں کبھی کسی نے آپ کے کام کرنے پر اعتراض کیا؟''

''ہماری سسرال میں جاب کرنا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی۔ اور میری ساس بہت ماڈرن قسم کی ساس ہیں۔ اور وہ سب کی بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بہوئیں آگے نکلیں۔ اور اپ ٹو ڈیٹ رہیں۔ اور میں نے آج کے دور میں ایسی ساسیں کم ہی دیکھی ہیں کہ جو اپنی بہوؤں کو کہیں کہ تم اچھا پہنو اور اپ ٹو ڈیٹ رہو اور آپ یقین کریں کہ بہوؤں میں سے جب کوئی تیار ہو کر آتی ہے تو وہ اپنے موبائل سے ڈھیر ساری تصاویر بناتی ہیں۔

انہیں بہت پسند ہے کہ ان کی بہوئیں پڑھی لکھی ہوں اور جاب کریں اور زمانے کے ساتھ چلیں۔ نہیں آنے جانے پر پابندی نہیں ہے...... میں خود ڈرائیو کرتی ہوں۔ ڈبنگ کے لیے جاتی ہوں۔ کبھی کبھی رات میں دیر بھی ہو جاتی ہے مگر کبھی معیوب نہیں سمجھا کبھی سوال جواب نہیں کیا۔ اور چونکہ میں چھوٹی بہو ہوں تو ساس سسر اور جیٹھانی سب نے محبت دی بے تحاشا محبت دی۔''

''کچن سے کتنا لگاؤ ہے؟''

''اگر کوئی لڑکی یہ کہے کہ مجھے کچن سے لگاؤ نہیں ہے تو میں مان ہی نہیں سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو جس خمیر سے گوندھا ہے اس کی کچھ خصوصیات ہیں۔ وہ صنف نازک ہے۔ وہ صنف نازک ہی رہے گی۔ چاہے وہ کتنی ہی مرد بننے کی کوشش کرے، اس میں نزاکت ہر حال میں آئے گی۔

اسی طرح گھر داری ہر عورت کا خاصا ہے......

ہر عورت میں اللہ نے یہ ہنر دیا ہے۔ کچھ لوگ وقت پر استعمال کرتے ہیں کچھ نہیں میرے معاملات ایسے ہیں کہ میں ضرورت پڑنے پر ہر کام کر لیتی ہوں یا آپ یہ کہہ لیں کہ کھانا پکانے سے بیکنگ تک...... برتن دھونے سے لے کر برتن لگانے تک روٹی گول پکانے سے پراٹھے پکانے تک ہر کام مجھے آتا ہے...... آٹا گوندھنا بھی آتا ہے اور یہ سب باتیں مجھے میری دادی نے سکھائیں......

ہمارا فیملی سرکل کافی بڑا ہے تو ہر ویک اینڈ پر گھر میں کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہوتا ہے۔ اور روایت کے مطابق بہوؤں کو اہتمام کرنا ہے تو ہر بہو کو "مینیو" تقسیم کر دیا جاتا کہ آپ نے یہ کرنا ہے اور آپ نے یہ ......تو میرے حصے میں بھی جو کام آتا ہے خوش اسلوبی سے کر دیتی ہوں۔"

"کوئی ایسی بات جو آپ نے دوسروں سے سیکھی اور پھر خود کو اس سے دور رکھا؟"

"دوسروں کے تجربے سے میں نے کیا سیکھنا تھا۔ میری زندگی کے بہت سے تجربات ہیں جن سے میں نے سیکھا ہے...... میں نے سیکھا ہے کہ جو غلطی ایک بار ہو جائے، اسے دہرانا نہیں چاہیے...... گھر میں اللہ تعالیٰ بزرگوں کا سایہ برقرار رکھے جو لوگ اپنے بزرگوں سے سیکھتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی سنتے ہیں، وہ نقصان کم سے کم اٹھاتے ہیں......

اپنے میکے میں دادی سے بہت سیکھا اور سسرال میں اپنی ساس سے بہت کچھ سیکھا...... ان کا شفقت کا ہاتھ ہمیشہ سر پر رہا اور ہے...... اور انہوں نے جہاں غلط ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہاں ڈانٹ بھی پڑی اور جوتے بھی پڑے۔ میکے کی طرف سے بھی اور سسرال کی طرف سے بھی...... بڑوں کا سایہ آپ کو بہت سی مشکلوں سے، بہت ساری آفات سے بچالیتا ہے۔ بزرگ بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے گھر میں بہت برکت ہوتی ہے...... اگر کوئی ان باتوں کو سمجھے۔"

"اور یہ آخری سوال کہ کمرے میں آ کر عابد صاحب آپ کے لیے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"

"مزے کی ایک بات بتاؤں۔ سچویشن یہ تھی کہ جب انہوں نے کمرے میں آنا تھا تو میں کمرے میں بیٹھی انتظار نہیں کر رہی تھی بلکہ میں وہ واحد دلہن تھی جس نے کمرے کے باہر دروازہ رکوائی میں بچہ پارٹی کا ساتھ دیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ "دھرنا" دیا تھا کہ پیسے نکالو پھر اندر جانے دیں گے...... اس وقت میں بالکل غیر روایتی قسم کی دلہن تھی۔

اور پھر جب یہ کمرے میں آئے تو سلام دعا کے بعد جو پہلا جملہ ان کے اور میرے منہ سے نکلا وہ یہ کہ "بڑی ٹائٹ بھوک لگ رہی ہے۔" سوچا یہ کہ کہیں باہر جا کر کھانا کھا کر آتے ہیں۔ مگر پھر یہ بات نامناسب سی لگی...... منہ دکھائی میں انہوں نے بڑا خوب صورت لاکٹ کا سیٹ دیا تھا۔

اور آخری بات جو میں کہنا چاہوں گی کہ رشتوں کی اہمیت انسان وقت کے ساتھ سیکھتا ہے، کوئی اسے گھول کر پلا نہیں سکتا...... سسرال میں لڑکی بہت سے خدشات لے کر آ رہی ہوتی ہے اور ان خدشات کو نارمل کرنے میں گھر والوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

سسرال والے اگر اسے بیٹی سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور اسے فری ہینڈ دیتے ہیں تو لڑکی بہت جلدی ایڈجسٹ ہو جاتی ہے۔ اور اس معاملے میں آپ کے بزرگوں کا بہت اہم رول ہوتا ہے...... اگر وہ آپ کو وارم ویلکم والا ماحول دیں تو بہت جلدی ایڈجسٹ ہو جاتا ہے...... ورنہ تو پھر سالوں لگ جاتے ہیں۔ اور لڑکی پھر اسے سسرال ہی سمجھتی ہے اپنا گھر نہیں۔

تو میں اللہ کی بڑی شکر گزار ہوں کہ اس نے محبت کرنے والے گھر میں پیدا کیا اور محبت کرنے والے گھر میں میرا رشتہ جوڑا...... اور مجھے کہیں بھی مشکل نہیں ہوئی۔

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

فہمیدہ جاوید ملتان سے لکھتی ہیں

جنوری 2021ء کا ٹائٹل لاجواب ماڈل کا میک اپ، جیولری اور لباس و انداز اور مالٹائی دوپٹا بہت ہی پیارا لگا۔ بس ایسے ہی مکمل اور تیار سے ٹائٹل دیا کریں۔ شاہین نے احتل کا پیارا سا انٹرویو لے کر دل خوش کر دیا۔ تصاویر دلکش تھیں۔ جبکہ لیلیٰ زبیری سے شاہین نے جو سوالات پوچھے، اچھے لگے کہ پہلے واقعی ڈرامے اچھے ہوتے تھے ہمارے دور کے۔ سروے میں فرخندہ خالد کی یادیں نانی امی کے گھر اچھی لگیں جبکہ عندلیب زہرا کا کزنوں کے ساتھ گزرا وقت اور پیاری زینب نور کا کلاس کا چھپکلی کا واقعہ ہاہاہا۔ بہت اچھا لگا، تنزیلہ جی کے ناول میں میرے خیال سے لاریب کا بھائی داؤد ہے اور ماں باپ میں علیحدگی ان کی ہی ہوئی تھی۔ لاریب کا سگریٹ پینا اچھا نہ لگا۔ داؤد موٹا ہے، واؤ تنزیلہ کیا انفرادی کردار نکالا تم نے۔ اچھا ہے ناول......

''عمر یسرا'' میں اس قسط کے شروع میں جو جنت نے فارس کو تنگ کیا، اچھا لگا۔ نوشین فیاض کے ناول میں نعمان پر غصہ آیا۔ جبکہ عائشہ نصیر احمد کا ناول سمپل سا تھا اور چند پیج پڑھ کر ہی اینڈ کا پتا چل گیا۔ عائشہ اگلی بار مزید اچھا ناول لانا۔ حمیرا شفیع میری پسندیدہ بن گئی ہیں۔ حمیرا کرداروں پر کمال رکھتی ہیں۔ ویسے ایک بات کہوں حیران کن اب مجھے ناول سے زیادہ افسانے اچھے لگنے لگ گئے ہیں پتا نہیں کیوں۔ ''آپا جان'' پہلے نمبر پر تھا (واقعی) بہن بھائیوں کی وجہ سے اپنے گھر کو خراب نہ کیا جائے جبکہ ''من مانی'' دوسرے نمبر پر۔ امی جی کا مٹی کے گھر بنا کر سمجھانا بہت ہی اچھا لگا اور ''آئی صاحب'' بھی ٹھیک تھا۔ چوتھے نمبر پر اور فیصلہ پانچویں نمبر تھا جبکہ یار دل دار چھٹے نمبر پر۔ ہاں مجھے فیصلہ اور یار دل دار بالکل بھی پسند نہیں آئے۔ ہاں یاد آیا۔ مجھے کرن، شعاع، خواتین کے اسکیچز تمام رسالوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں، دل کرتا ہے اسکیچز میں چلی جاؤں ہاہاہا۔ شائستہ اور جنید انصار کا انٹرویو کریں۔

ج: پیاری فہمیدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا سروے اور خط شامل نہ ہو سکا۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ ایسی زیادتی نہ ہو۔ بہت شکریہ کہ آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی قارئین بہت عزیز ہیں اور ان کی ناراضی ہمیں گوارا نہیں ہے۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہم تمام خط شامل نہیں کر پاتے۔

تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی بہت اچھا کرتی ہیں بہت شکریہ۔

زاہدہ راجپوت لکھتی ہیں

حمد سے آغاز کیا۔ میں کراچی کے ایک مدرسہ میں تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھاتی ہوں۔ ہم سات اساتذہ ہیں۔ میرے ساتھ میری عزیز دوست نور جہاں کی دو بیٹیاں بھی قرآن مجید پڑھاتی ہیں۔ قارئین سے دعاؤں کے لیے التماس ہے کیونکہ ثمینہ آریجو کی گردہ کی پیوندکاری ہوئی ہے اور الماس آریجو کی مارچ میں شادی متوقع ہے، دونوں ہی میرے دل کے بہت قریب میری دوست اور بیٹیوں کی طرح عزیز ہیں۔

احتل عزیز کا بندھن خوب صورت باتوں اور تصاویر

سے مزین تھا۔ حسین، جمیل لیلیٰ زبیری کی باتیں اچھی لگیں سلویٰ صاحبہ نے ماجد سے جو "فیصلہ" کروایا۔ وہ بالکل ٹھیک لگا۔ "تعلق کا گھر" سوچ کے نئے دروازے وا کر گیا "یار دلدار" افشین ہر مہینے لکھا کریں، فرح انیس کی آپا جان کو عقل دیر سے آئی چلو دیر آید درست آید "عمر یسرا" حسنہ حسین اُفف...... بہت ہوگئی نفرت۔ اگلی قسط میں محبت کا جھونکا آنا چاہیے "نورالقلوب" خوش الحان لگتا ہے لاریب کے ہاتھوں تمہاری شامت آنے والی ہے رخسانہ صاحبہ "شام کی حویلی میں" "اب صبح کردیں" "شب آرزو" میں مریم مجازی محبت کے ہاتھوں کھلونا بن گئی نفس کی غلام بن کر عزت جیسے گوہر سے محروم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ سب بچوں کو ہدایت کے راستے پر رکھے۔ مریم کا معمولی شکل و صورت سے حسن کی دولت سے مالا مال ہوجانا حیرت میں مبتلا کرگیا۔ نعمان کا مریم کے واپس کیے تحائف کو اتنا سنبھال کر رکھنا...... سمجھ سے باہر ہے۔

ج: پیاری زاہدہ! آپ بہت اچھا کام کررہی ہیں قرآن پاک کی تعلیم دینا بلاشبہ سب سے بہترین کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی دوستوں کو صحت کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت سے نوازے۔ آمین۔

تبصرہ بہت اچھا ہے۔ ہم آپ سے متفق ہیں عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ جو غلط راستوں پر چلتے ہیں انہیں کبھی منزل نہیں ملتی۔ مریم حسین نہیں تھی۔ سعید کی محبت نے اسے حسین بنادیا تھا۔ نعمان نے خط سنبھال کے اس لیے رکھے کہ چاہے جانے پر اسے فخر تھا۔

بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ڈاکٹر فریال خان، ڈی جی خان سے شریک محفل ہیں

نیا سال شروع ہوتے ہی شدید بیمار بخار اور الرجی ہوگئی۔ مریض بھی چیک کررہی تھی۔ اماں نے اگلے دن کہا، گھر بیٹھ کے آرام کرو میرا سر نہ کھایا کرو۔ میں نے کہا اماں ایک آپ کا سر ہی تو مزیدار ہے۔ باقی سب کے سر تو کڑوے ہیں، ہاہاہا۔ بس پھر تو اماں شروع کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

رسالہ رکشہ والے کو کہہ کر منگوایا اور پھر وہی پڑھنے کا مسئلہ، شکر تھا اس بار کوئی مہمان نہیں تھا گھر میں، میں نے الرجی اور بخار کی میڈیسن لی، رسالہ اٹھائے تھوڑی دیر گزری۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کوشش کے باوجود ہاتھ سے رسالہ لڑھک لڑھک جارہا تھا، آنکھ کھول کھول کے تھک جاؤں۔ ہائے اللہ پھر سمجھ آیا یہ اینٹی الرجی کا اثر ہے۔ بس پھر سمجھیں چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ خیر رات کو جب جاگی تو پڑھ لیا۔

اچھا ایک اور بات، اس وقت تو کلینک آئی ہوئی ہوں بس ایک دن کی چھٹی کی۔ آج پھر حاضر، بات یہ تھی کہ ہم لوگ پاکستانی کب اس انگریزی کے کمپلیکس سے نکلیں گے ابھی ایک پیشنٹ کو بتایا کہ بلڈ پریشر ایک سو اکسٹھ ہے اب اس کو یہ نہیں پتا تھا کہ ایک سو اکسٹھ کیا ہوتا ہے وہ بے وقوفوں کی طرح ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی کہ مجھے انگریزی میں بتاؤ، دل چاہ رہا تھا یہ پیڈ اس کے سر میں دے ماروں۔

میں خود ڈاکٹر ہوکر اردو بولنے کو پسند کرتی ہوں، اپنی سرائیکی کو پسند کرتی ہوں۔ اور بہت انجوائے کرتی ہوں اپنی زبان کو۔ اب آجائیں شعاع پہ۔ مجھے یہ بتائیں آپ کی رائٹرز کے پاس اتنے اچھوتے موضوع کہاں سے آتے ہیں اور کیسے لکھ لیتی ہیں۔ اب تو دل چاہتا ہے ڈاکٹری گئی بھاڑ میں، میں تو رائٹر بنتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی تو بن ہی جاؤں گی۔ ہاہاہا۔

میں تصور کرکے خوش ہورہی ہوں کہ آپ میرے لیے پھولوں کا ہار لے کے آرہی ہیں ہاہاہا۔ سب سے پہلے ون اینڈ اونلی حسنہ حسین واہ واہ کیا بات ہے "عمر یسرا" کمال کردیا۔ اب میں جب بھی آئی تو حسنہ کے لیے بہت ساری دعائیں لاؤں گی، کھانا تو آپ سے ہی کھاؤں گی۔ میں کھانے کی بہت شوقین ہوں۔

ج: پیاری فریال! آپ کی طبیعت خرابی کا جان کر افسوس ہوا۔ آپ کی عیادت کے لیے کال ضرور کریں گے۔ ہم نے آپ کا نمبر محفوظ کرلیا ہے۔ آپ کی خوش مزاجی کا تو پتا تھا (خطوط میں ہاہاہا اتنی بار جو ہوتا ہے) اب آپ کی "معصومیت" کے بھی قائل ہوگئے۔ اینٹی الرجی کھانے کے بعد رسالہ ہاتھوں سے لڑھک رہا ہے۔ آنکھیں نہیں کھل رہیں، تب ڈاکٹر صاحبہ کی سمجھ میں آیا کہ

یہ اینٹی الرجی کا اثر ہے۔

انگریزی کا کمپلیکس تو ہماری قوم پر اس حد تک سوار ہے کہ اگر ہمارے لیڈر اردو جو ہماری قومی زبان ہے غلط بولیں تو کوئی ان پر تنقید نہیں کرتا۔ اگر انگریزی میں کوئی غلطی کر دیں تو سارا میڈیا شور و غوغا کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔

رائٹر بنا چاہتی ہیں، ضرور لکھیں لیکن اپنی رائٹنگ کے بجائے ٹائپ کر کے بھجوائیں۔ آپ کی جناتی رائٹنگ پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

کھانا کھانے ضرور آئیں۔ ہم تو خود ان لوگوں میں سے ہیں جو کھانے کے لیے جیتے ہیں۔ مزے دار کھانوں کے بغیر تو زندگی بے مزہ لگتی ہے ہمیں۔

حافظہ حفصہ صدیقی رسول نگر گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

اس دن میں بہت پریشان تھی لیکن خط شائع ہونے کی خبر سنتے ہی میری پریشانی خوشحالی میں بدل گئی۔ یہ خبر بھی مجھے میری پیاری دوست اسماء نے دی اللہ اس کو بھی لاتعداد خوشیاں دے۔

ج: پیاری حفصہ! پریشان نہ رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہے نا، وہ ہم سب سے بہت محبت کرتا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین

فضہ گل، امانگڑھ نوشہرہ

جنوری کا شعاع آیا، جھٹ سے اٹھا لیا کیونکہ بہن اس وقت موبائل میں لگی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے ”نور القلوب“ پڑھی بہت اچھی تحریر لگ رہی ہے۔ افسانوں میں ”یار دل دار“ پڑھ کر مزا آیا۔ باقی فیصلہ، آپا جان اور آئی صاحب بھی اچھی تحاریر تھیں اور ہاں من مانی بھی اچھی سبق آموز کہانی تھی۔

سروے میں زینب نور آپی کے جوابات پڑھے چھپکلی والا واقعہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی ویسے چھپکلی سے مجھے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

چلیں، اب میں اپنے بارے میں بھی کچھ بتاتی چلوں۔ جی تو خواتین اور شعاع پڑھتے ہوئے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا چھٹی کلاس میں تھی جب میری بہن اپنی دوست سے ڈائجسٹ لے آتی تھی تو میں بھی چپکے سے پڑھ لیتی تھی لیکن مجھ سے میری بہن لڑنے بیٹھ جاتی تھی کہ تم یہ نہیں پڑھو گی حالانکہ وہ مجھ سے صرف دو سال ہی بڑی ہے لیکن پھر بھی ......

وہ تو اچھا ہوا کہ امی نے کہا کہ اس میں ایسا کچھ بھی برا نہیں ہے کہ فضہ نہ پڑھے۔ اب آٹھویں کلاس میں ہوں تو اب پچھلے سال سے باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔

ج: پیاری فضہ! آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ آپ کی لکھائی بھی بہت اچھی ہے، ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی کلاس میں فرسٹ آتی ہوں گی۔ آپ کی امی کو داد دیں گے جنہوں نے آپ کی حوصلہ افزائی کی اور مطالعہ سے نہیں روکا۔ آپ ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دیں۔

شائستہ اینڈ اقصیٰ امان کوٹلہ جام ضلع بھکر

شعاع کے سارے سلسلے ہی بہت زبردست ہیں سب سے زیادہ مدیرہ کے محبت بھرے جواب متاثر کرتے ہیں شعاع کی ہر تحریر ہی لاجواب ہے، چاہے شب تاب ہو یا شام کی حویلی۔ نازنین ہو یا شہرزاد اک دیا رہنے دیا ہو یا بن پائی مدتوں اپنے سحر میں جکڑنے والی تحریریں ہیں۔ افشین نعیم کا یار دلدار بہترین سلسلہ ہے، اس کو ہر ماہ شامل کریں، صائمہ اکرم چوہدری جلد ہی انٹری دیں ڈاکٹر فریال جی ”تیرا غم میرا غم ایک ہے صنم“۔ ہم بھی چھپ کر پڑھتے ہیں۔ خیر لڑکیوں سے تو نہیں چھپتے۔ شام کی حویلی بہت زبردست جا رہی ہے پلیز موحد کشف کے ساتھ برا نہ کرنا۔ تنزیلہ ریاض کو پڑھنے کا پہلا موقع ہے۔ تحریر اچھی ہے کچن سے ویسے تو دلچسپی نہیں موسم کے پکوان پھر بھی اچھا ہے۔

ج: پیاری شائستہ اور اقصیٰ! اتنی پابندیوں کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت شکریہ۔ اپنے ابو کو پرچے میں سے باتوں سے خوشبو آئے اور پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر سنائیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ رسالوں میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں۔

ثانیہ مرتضیٰ ...... ترنول اسلام آباد

زندگی میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں (امتحانات کو

چھوڑ کر) تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آغاز کیسے کروں۔ بچپن میں گاؤں سے خالہ لوگوں نے خط بھیجا تھا (ارے نہیں بھئی اتنی پرانی نہیں ہوں۔ 2005 کی بات ہے) ان دنوں کشمیر میں موبائل کا استعمال شروع نہ ہوا تھا۔ تب پہلی بار خط پڑھا تھا اور آج پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو آپ سے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ثانیہ مرتضیٰ ہے۔ عمر کتنی ہے؟ ان شاء اللہ اس سال زندگی کی چوبیسویں بہار دیکھوں گی۔ دو سال پہلے بی ایس سی کر چکی ہوں اور اس کے بعد سے گھر میں ہی ہوتی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق جڑے ہوئے اس جنوری میں پورے دو سال ہو گئے ہیں اور شعاع کو فروری میں پورا ایک سال ہو جائے گا۔ ان رسالوں نے بہت کچھ سکھایا ہے آپ سب لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ ہمیں اتنی اچھی اچھی باتیں سکھانے کے لیے۔ شعاع پر تبصرہ کرنے سے پہلے آپ سے دو سوال کرنا چاہ رہی ہوں، پلیز ان کے جواب دے دیجیے گا۔ میں نے اکتوبر میں اپنا ایک افسانہ بھیجا تھا ''نشانے باز'' کے نام سے، اس کے بارے میں صرف اتنا بتا دیں کہ وہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال یہ کہ اگر کسی کا افسانہ یا ناول وغیرہ شائع ہو جائے تو کیا اس کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے کہ نہیں؟

ستمبر میں، میں نے اپنا پہلا افسانہ ''راہ راست'' کے نام سے بھیجا تھا جو کہ خوش قسمتی سے اکتوبر کے خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو گیا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرا افسانہ پہلی دفعہ میں ہی چھپ گیا اور وہ بھی خواتین ڈائجسٹ میں۔

ج: پیاری ثانیہ! سب سے پہلے تو ہماری جانب سے شادی کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہماری دعا ہے کہ زندگی کا یہ موڑ آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ شاد رہیں، آباد رہیں۔

آپ کا افسانہ ''نشانے باز'' تو ہمیں نہیں ملا لیکن آپ کے تین افسانے ضرور موصول ہوئے ہیں۔ تینوں قابل اشاعت ہیں۔ افسانوں کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

ان دنوں تو آپ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ آپ نے وقت نکال کر خط لکھا اور اتنا اچھا تبصرہ کیا۔ اس کے لیے شکریہ۔

آپ کی دوستوں نے بالکل صحیح خطاب دیا ہے۔ اب تو واقعی آپ پکی پکی رائٹر بن گئی ہیں۔

ہانیہ ہارون ...... بھاول نگر

سب سے پہلے ''خط آپ کے'' آپ کا جواب پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔ بابا جانی کو بھی آپ کا جواب پڑھایا۔ وہ بھی مسکرا دیے۔ اب تبصرہ۔

سب سے پہلے ''عمر یسرا'' پڑھا۔ بہت خوب۔ ''شام کی حویلی میں'' کشف کا کردار حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔

''میری راہیں تیرے تک ہیں'' بہت خوب صورت تحریر لگی۔ ''شب آرزو'' بہت خوف زدہ ہوگئی تھی محبت کا مسخ شدہ روپ دیکھ کر۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ ''تعلق کا گھر'' پڑھ کر ذہن کی الجھی ڈور سلجھ گئی۔ قرۃ العین جی کا بہت شکریہ۔ کیا قارئین مجھ سے دوستی کریں گی؟

ج: پیاری ہانیہ! قارئین آپ سے دوستی کا رشتہ ضرور استوار کریں گی۔ بس آپ اچھے اچھے خط لکھتی ہیں۔

مریم خان پھلروان سرگودھا سے اپنے شہر کا تعارف لے کر آئی ہیں

ہمارا پھلروان، ویسے ہمیں تو یہ علاقہ بھی اپنا پھلروان شہر ہی لگتا ہے۔ اب دیکھیں نا ایسی جگہ جہاں اسکول ہوں۔ وہ بھی ڈھیر سارے یعنی سرکاری و نیم سرکاری، ساتھ پرائیویٹ اسکولوں کی بھرمار اور کالجز (لڑکے اور لڑکیوں کے الگ الگ) ٹیوشن سینٹرز، اسپتالیں، ڈھیروں کلینک، ہر گلی میں پارلر، بے شمار بوتیک، کئی پرنٹنگ پریس، چھوٹی بڑی مسجدیں، ریلوے اسٹیشن، موٹروے کی سہولت، انٹرنیٹ کیفے، جم، ایک بڑی سی فوڈ سٹریٹ مزیدار کھانوں کے ساتھ اور تو اور ایک پارک بھی، یہ الگ بات ہے کہ وہ بند ہی رہتا ہے زیادہ تر۔ آپ بتائیں! ایسی جگہ کو گاؤں یا قصبہ کہیں گے یا شہر۔

ہمارے جو رشتہ دار ملتان، سرگودھا یا کراچی وغیرہ میں رہتے ہیں وہ ہمارے علاقے پھلروان کو گاؤں کہتے ہیں۔ ''گاؤں سے شہد منگوایا ہے...... دیسی گھی بھجوایا ہے۔''

گاؤں میرے خیال میں وہ ہوتا ہے جہاں کچے پکے مکانات اور جدید سہولتوں کا فقدان ہو۔ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک پلازہ ہے۔

ہاں ہمارے علاقے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی نہر اور دو چھوٹی نہریں بہتی ہیں۔ اور چاروں طرف مالٹوں اور آموں کے باغ بھی ہیں۔ نہروں میں گرمیوں میں ذوق وشوق سے نہانے کا شوق پورا کیا جاتا ہے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے بڑے شوق سے نہر پر نہانے جاتے ہیں۔ بھئی ایسا ٹھنڈا میٹھا پانی تو بڑے بڑے واٹر پارکس میں بھی میسر نہ ہو اور پھر تازہ کا تازہ۔ اور اگر پیدل جائیں تو واک کی واک اور سیر کی سیر اور ہاں ایک شادی ہال بھی ہے ہمارے شہر میں۔

تو میں بتا رہی تھی کہ پھلروان میں لاک ڈاؤن کا کوئی خاص پتا نہیں چلا، ڈھونڈے سے بھی کیونکہ بیچ شہر کے بیچوں بیچ بنے تین بڑے بڑے چوک میں کھیلتے اور بڑے سب اپنی اپنی دکانوں کے شٹر بند کیے (بھئی پولیس کے ڈر سے) دکانوں کے باہر اور اندر، جی ہاں اندر گاہک اپنی شاپنگ کرتے۔ وہ ایسے کہ باہر سے تالا لگایا اور اندر سے گاہک کو فارغ کر کے باہر نگرانی کرنے والے کو اشارہ دیا اور تالا کھول کر گاہک اور دکاندار دونوں باہر، دوبارہ تالا لگایا اور بیٹھ گئے انتظار میں۔ کس کے بھئی، آنے والے گاہک کے۔ تو یہ تھی ہمارے شہر کی لاک ڈاؤن میں صورت حال۔ جبکہ یہاں کے تمام لوگ ایک دوسرے کو ناموں سے اس طرح جانتے ہیں جیسے گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو اور کرونا کا تو یہاں سے گزر بھی نہیں ہوا۔

ج: پیاری مریم! آپ کا شہر واقعی بہت خوب صورت ہے۔ اس کو گاؤں کہنا واقعی زیادتی ہے۔ اتنی سہولیات تو بہت سے شہروں میں بھی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر ہانیہ خان راولپنڈی سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے ''شام کی حویلی'' بڑی اچھی کہانی ہے۔ ''عسر یسرا'' بہت خوب صورت ناول ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ویری گڈ حسنہ حسین اور بہت شکریہ۔ ''نور القلوب'' بہت بہت اچھی کہانی ہے تنزیلہ ریاض جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ ''شب آرزو'' واؤ زبردست۔ کیا کہانی لکھی ہے۔ نوشین فیاض نے ''میری راہیں تیرے تک'' معذرت کے ساتھ مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ ''احساس'' اچھا ناولٹ تھا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف ''یار دل دار'' ہمیشہ کی طرح شاندار، آپا جی بہت اچھا افسانہ تھا۔ سلویٰ علی بٹ کا افسانہ اور دیگر افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔ پہلی شعاع میں صحیح لکھا ہے کہ وقت اچھا ہو یا برا گزر جاتا ہے۔ خوشی، غم، بچپن اور جوانی سب اپنا جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے اعمال درست کرنے چاہئیں تاکہ آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ بندھن میں اٹل عزیز شہزاد سے مل کر اچھا لگا۔ ''دستک'' میں لیلیٰ زبیری سے ملاقات اچھی تھی۔

گزشتہ موسم اور نیا سورج میں سب کے جواب اچھے تھے۔ لیکن زینب نور کے جواب بہت اچھے تھے۔

ج: ڈاکٹر ہانیہ! یاد آوری کا شکریہ۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس ماہ شعاع کی تحریریں آپ کو پسند آئیں۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

حسنہ حسین کے پیارے سے ناول عسر یسرا کی اسٹوری تو اچھی جا رہی ہے مگر ابھی تک اس کی کہانی واضح نہیں ہو سکی ہے دوسری بات حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے ہوئے اس جملے کو کچھ زیادہ ہی بار بار دہرایا گیا ہے جو کہ ہماری ناقص رائے کے مطابق مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے ہمیں یہ ناول بہت بہترین لگ رہا ہے۔

اور جناب میری راہیں تیرے تک ہیں، عائشہ نصیر احمد نے محنت سے لکھا ہے اسے اوسط درجے کا ناول کہہ سکتے ہیں اور شام کی حویلی میں بہت دل لگ رہا ہے۔

افسانوں میں آپا جان سرفہرست رہا۔ فرح انیس نے مکمل اور بالکل درست نقشہ کھینچا اور مریم شہزاد نے ''من مانی'' بھی عمدہ لکھا اور اس کے علاوہ قرۃ العین خرم ہاشمی کا تعلق کا گھر ایک شاندار تحریر لگی۔ تجھ سے ناتا جوڑا میں (ط۔غ) کا آخری جملہ بہت دل کو لگا سچی بات ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی

بقیہ صفحہ نمبر 246

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔ فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

رخسانہ نگار عدنان

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑالیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آ جاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آئی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آ جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جو ابا وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پر تکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساسِ زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئر پورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی

پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کرلیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہوجاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کررہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مرجائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہوجاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کردی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آزر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پوچھتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر چونک جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔

کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

چھبیسویں قسط

وہ مین روڈ کے کنارے ایک ہلکا سا بیگ سائیڈ پر رکھے جیسے منتظر کھڑی تھی۔

کندھے پر شولڈر بیگ ڈالے۔ بالوں کو کیچر میں جکڑے۔ ہوا سے اڑتے دوپٹے کو بار بار سر اور کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ بظاہر پُراعتماد تھی۔

مگر اس کے اندر جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔

وہ ایک بہت بڑا قدم اٹھانے جا رہی تھی اپنی زندگی کا رخ بدلنے، بڑی سی سیاہ گاڑی اس کے قریب آ کر رکی تھی۔

وہ بس لحہ بھر کو متزلزل سی ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ جو قدم اٹھ چکے تھے اسے ان پر اب پچھتانا نہیں تھا۔

موحد نے کسی معمول کی طرح اُتر کر اس کا سامان ڈگی میں رکھا۔ اتنی دیر میں وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور گاڑی پھر سے چل پڑی۔

دونوں بالکل خاموش تھے، جیسے جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔ سب کچھ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔

"آنی کو بتا کر آئی ہو؟" شہر سے باہر نکلتے ہوئے موحد نے لمبی چپ کو توڑا۔

"نہیں۔" اس کا ابھی بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ لحہ بھر کو ٹھٹکا۔ کچھ غصہ بھی آیا۔

"عجیب لڑکی ہے جو جی میں آئے — کر گزرنے والی۔"

"وہ پریشان ہوں گی۔" موحد کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"اس سے زیادہ نہیں جو کچھ میں کر چکی ہوں۔" وہ بدستور سامنے دیکھ رہی تھی۔ سورج کی روشنی سارے میں پھیل چکی تھی۔

صبح کے دھندلکے میں شہر کے مضافات جو مٹے مٹے سے تھے اب نمایاں ہوتے ہوئے جیسے دور جاتے جا رہے تھے۔

اس کی نظریں دور سڑک پر کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔

"پھر بھی تمہیں انہیں بتا کر آنا چاہیے تھا۔" وہ جانے کیوں مصر تھا۔

"تو آپ کے خیال میں وہ مجھے خوشی خوشی آنے دیتیں اگر میں انہیں بتا کر آنا چاہتی۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چڑ کر بولی۔

"مگر......" موحد کچھ بولنے لگا تھا۔

"پلیز اب ان باتوں کے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، جو ہونا تھا ہو چکا۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت ہے نہ میں ایسا چاہتی ہوں۔" وہ بات کو سمیٹتے ہوئے عجیب روکھے پن سے بولی۔

اس نے لحہ بھر کو کشف کے بے تاثر چہرے کو دیکھا۔

شاید کوئی دکھ، پچھتاوا، غم کچھ تو ہوگا۔

بظاہر کچھ بھی نہیں تھا یا شاید بہت کچھ تھا۔ اس کا ضبط کمال کا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ کچھ دیر بعد پھر بولا۔ جواب میں وہ پھر خاموش تھی۔

"یہ فیصلہ کر کے کیا تم مطمئن ہو؟" وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔

"میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔" وہ سکون سے بولی۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟" وہ چڑ سا گیا۔

"اگر میں مزید وہاں رکتی تو شاید الجھنیں زیادہ بڑھ جاتیں مجھے یہی ٹھیک لگا جو میں نے کیا میں جانتی ہوں،

میں اپنی ماں کی جھولی میں دکھ اور ڈھیر سا ملال چھوڑ آئی ہوں لیکن مجھے یہی ٹھیک لگا۔ ہم دونوں کے لیے جو میں نے کیا۔"

عجیب سر پھری سی تھی وہ۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں بھی تو کچھ کم سر پھرا نہیں۔" دوسرے لمحے اسے خیال آیا تو وہ مبہم سا مسکرا کر رہ گیا۔

کشف ابھی بھی دور فضاؤں میں اس غیر مرئی نقطے کو گھورے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"آخر کیوں مما! آپ کو یہیں کیوں میرا رشتہ کرنا ہے۔"

سلیمان ماں کی اس بے جا ضد سے بری طرح سے چڑ گیا تھا۔ جس طرح سلیمان کو رشتے کے لیے پیش کیا جا رہا تھا وہ اس کے نزدیک کچھ اور بھی توہین آمیز تھا۔

وہ عجیب خفت بھری کیفیت سے گزر رہا تھا۔

مگر شائستہ پر جیسے کچھ بھی اثر نہیں کر رہا تھا۔

وہ اس طرح سکون سے اپنے ہاتھوں کو بڑی نرمی سے مساج کریم سے سہلا رہی تھیں جیسے اس سے ضروری اور کوئی کام ہی نہ ہو۔

"میں طاہرہ خالہ کو زبان دے چکی ہوں۔" وہ اسی سکون سے بولیں۔

"مگر میں یہ رشتہ کسی صورت نہیں کرنا چاہ رہا اور مما! آپ کو یہاں رکنا ہے تو شوق سے رکیں میں اگلے ہفتے تک جا رہا ہوں واپس، وہاں دس کام ہیں جو میری غیر موجودگی سے رکے ہوئے ہیں۔" سلیمان کی برداشت کی حد ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" شائستہ کا لہجہ عجیب جتانے والا تھا۔

وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔

شائستہ کو ہر موقع پر ٹھیک پتا پھینکنا آتا تھا۔

"میں اکیلی ہوں۔ تمہارے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں تم مجھے چھوڑ دو گے تو میرے لیے دنیا ختم ہو جائے گی۔ اس دن میں اس دنیا سے ناتا توڑ لوں گی۔"

یہ وہ مخصوص جملے تھے جو وہ شوہر کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً سلیمان کے سامنے دہراتے ہوئے اپنے آنسوؤں اور بے چارگی سے اسے بلیک میل کرتی رہی تھیں وہ بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"پلیز ماما! آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں، میرے لیے یہ رشتہ کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ہے۔" اس نے عافیت نرمی میں جانی اور ماں کا ہاتھ محبت سے تھام کر انہیں سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"رمشا میری ہم عمر نہیں۔ آئی مین مجھ سے کافی چھوٹی ہے۔ دوسرے وہ نہیں چاہتی ایسا کوئی رشتہ جوڑنا تو پلیز، مما! سمجھنے کی کوشش کریں۔ بے کار کی ضد اور خواہش بعد میں بہت سے مسئلے پیدا کر سکتی ہے۔" وہ رک رک کر ماں سے کہہ رہا تھا کہ شاید کوئی ایک بات انہیں اپنی فضول خواہش سے ہٹا دے۔

"یہ بے کار کی ضد نہیں ہے، میرے دل کی خواہش بھی ہے اور میں تین بار استخارہ کر چکی ہوں، تینوں بار مجھے واضح طور پر رمشا کا اشارہ ملا ہے۔ ردا کی دفعہ ہر بار مجھے پریشان کن اشارے ملے، میں نے تم سے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن اس بار مجھے یہ خوش خبری کے طور پر نظر آ رہے ہیں، میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

یہ تو سلیمان کو معلوم تھا۔ اس کی ماں طرح طرح کے وظائف پر یقین رکھتی ہے اور انہوں نے ردا سے نکاح کے وقت اور رشتے کے وقت بھی بڑے جوش سے سلیمان کو بتایا تھا کہ استخارہ سلیمان اور ردا کے رشتے کے حق میں

آیا ہے اور آج وہ اپنے بیان سے پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ سلیمان چاہتے ہوئے بھی انہیں یہ سب یاد نہیں کرا سکتا تھا۔

"بہر حال ابھی طاہرہ خالہ کی طرف جانا ہے تم نہیں جانا چاہتے تو بے شک رک جاؤ۔ میں واپسی پر تم سے اس پر تفصیل سے بات کروں گی اور میری جان! اس بات کا یقین رکھو، تمہاری ماں تمہارے لیے کبھی بھی غلط خواہش نہیں کرے گی۔ مجھے اپنے بیٹے کی خوشی اس جہان کی ہر نعمت سے بڑھ کر عزیز ہے اور میں کسی طور پر بھی اس سے پیچھے ہٹ نہیں سکتی بس تم خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو کیونکہ مجھے یہ رشتہ لازمی کرنا ہے نکلتی ہوں میں۔"

وہ خود فیصلہ سنا کر اس کا جواب سنے بغیر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

سلیمان پریشان سا بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

یہ سچ ہے وہ دل سے ردا کو پسند کرنے لگا تھا اور اس حادثے نے اس کی دنیا جیسے ہمیشہ کے لیے تاریک کر دی تھی۔

وہ فوری طور پر یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا مگر شائستہ نے اسے بہانے سے روکے رکھا۔

اور اب ان کی نیت کھل کر سامنے آ چکی تھی وہ دل سے رمشا کے لیے خود کو تیار کر چکی تھیں۔

اور سلیمان کو یہ بھی معلوم تھا وہ جس بات کا تہیہ کر لیتی ہیں۔ اس سے پیچھے نہیں ہٹتیں۔

وہ پریشان سا بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

☆☆☆

زینب جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھر رہی تھی۔

اس نے کئی بار کشف کا نمبر ملایا اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ اس نے تنگ آ کر موحد کا نمبر ملایا۔

فون بج بج کر بند ہو گیا مگر موحد نے کال ریسیو نہیں کی۔

"اس کا مطلب ہے کشف موحد کے ساتھ ہی گئی ہے۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ اسے کیسی پریشانی دے گئی تھی۔

زینب کو اپنی دنیا تاریک ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

ایسا نہیں ہو سکتا کشف کچھ کہے بغیر چلی گئی ہو۔

یہ خیال آتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر کشف کے کمرے میں گئی۔ اس کی کتابیں، رائٹنگ ٹیبل الماریاں سب کچھ کھنگال ڈالا۔

وہ مایوس ہو کر باہر جانے لگی جب بیڈ کے تکیے کے نیچے اسے کچھ محسوس ہوا اس نے جھپٹ کر تکیہ اٹھایا۔

اس کا خیال درست تھا وہاں ایک کاغذ پڑا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کھولا، اس کی ٹانگیں اس کا وزن سہارنے سے عاری تھیں وہ وہیں بیٹھ گئی۔

جان سے پیاری آنی......!

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آپ کو یوں مخاطب کرنا پڑے گا اور اپنے دل کا حال اس خط کے ذریعے آپ تک پہنچانا پڑے گا۔ مجھے نہیں پتا میں نے کس جذباتی پن میں موحد کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا، مجھے اس وقت یہ بالکل ٹھیک لگا۔ ہر اس شخص سے انتقام لینے کے جیسا لگا جو مجھے لوٹ کا مال سمجھتا تھا۔ اس سے آپ کیا مطلب لیتی ہیں میں سمجھا نہیں سکتی اتنا کہوں گی۔ آپ اتنے سالوں سے اس معاشرے میں جس طرح اکیلی سروائیو کر رہی ہیں اس کا مطلب بخوبی سمجھ سکتی ہیں۔ آنی آپ بہت بہادر ہیں۔ میں بہت کمزور بہت بزدل ہوں، میں آپ کی طرح لڑنا چاہتی تھی بہادر بن کر جینا چاہتی تھی لیکن میں پہلے ہی قدم پر ہار گئی۔"

یہاں آنسو کا ایک قطرہ گرا تھا۔ زینب کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''لوگ پتھر دل ہیں اور دنیا بہت ظالم۔ آنی! میں حیران ہوں آپ کیسے اس ظالم بے حس دنیا سے لڑتی رہیں میں تو...... جو کچھ آزر انکل نے کیا جو کچھ ثمینہ آنٹی نے۔''

''آنی! میں چاہوں بھی تو بھول نہیں پاتی۔ اس نے مجھے موحد کا ہاتھ تھامنے پر مجبور کیا مگر سب سے زیادہ برا تو آپ نے کیا میرے ساتھ۔''

پھر ایک آنسو کا نشان تھا۔

''ایک ایسے شخص کو میرا باپ ڈکلیئر کر دیا جو مجھے جانتا تک نہیں، اس دن سے آنی! مجھے اپنے آپ سے گھن آرہی ہے، کیا کروں لاکھ سمجھاتی ہوں خود کو بہلاتی ہوں، آپ کی بے لوث بے ریا محبت کی چادر میں خود کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن مجھے اپنے ہی وجود سے ایسی بدبو، ایسی سٹرانڈ نکلتی محسوس ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے خود کو ختم کر لو۔ یا اس دنیا کو!

تو میں نے اس کے درمیان کا رستہ چنا۔ وہ رستہ جس سے میری سزا تو کم نہیں ہوگی۔ میں جیتی رہوں گی اور خود سے گھن کھاتی رہوں گی یہی میری سزا ہے میں موحد کے ساتھ جا رہی ہوں۔

''کیوں؟''

اس کا جواب آپ کو دے چکی ہوں میں نے اپنا فون بند کر دیا ہے۔ اگر کبھی آپ کی یاد آئی۔ اگر بھول سکی آپ کو تو شاید اپنی ضد کے آگے ہار جاؤں لیکن ابھی میں سب سے دور، بہت دور اکیلے میں رہنا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں دوبارہ آپ سے ملتی ہوں یا نہیں مگر میری سوچوں، میرے خیالوں اور میری بصارتوں میں پہلی شبیہہ آپ کی ہے اور رہے گی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا بھول جائیے گا مجھے۔

...... کشف

زینب کسی پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی۔

کاغذ پھڑپھڑا کر اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گیا۔

وہ کب اتنی خود مختار ہوئی، کب اس کی سوچ اتنی آزاد ہوئی کہ اس نے زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ زینب سے پوچھے بغیر کر لیا۔

''لیکن نہیں مجھے اتنا حیران نہیں ہونا چاہیے وہ پہلے ہی بڑا قدم اٹھا چکی تھی نکاح والا...... دوسرا قدم اٹھانا تو اس کے لیے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔'' اس نے آنکھ کے کنارے پر اٹکا آنسو انگلی سے صاف کیا۔

''میں بھول جاؤں تمہیں۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کشف! تم تو میرے پاس وجہ زندگی تھیں۔ میرے ہونے کا سبب میں کیسے بھول سکتی ہوں تمہیں میری جان۔''

وہ بولتے ہوئے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس اکیلے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کے رونے کی آواز سنتا یا اسے کسی کی وجہ سے اپنے آنسوؤں پہ بند باندھنا پڑتا۔

ذرا دیر میں اس کی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا کوئی بہت عزیز، قریبی رفیق مر گیا ہو یا شاید زینب خود ہی مر گئی ہو۔ وہ روتے ہوئے ایسے بین ڈال رہی تھی۔

گھر کے سنسان کمرے اور ویران برآمدے دم سادھے اس کی چیخیں اور اس کے بین سن رہے تھے۔

☆☆☆

سونیا بے چین و بے قراری جلے پیر کی بلی کی طرح اس کمرے کے بند دروازے کے باہر ادھر ادھر چکرا رہی

تھی۔
ایک گھنٹے سے اوپر ہو گیا تھا اس کمرے کو بند ہوئے۔
اس کی پریشانی غلط نہیں تھی۔
آزر، شائستہ اور طاہرہ اندر سر جوڑے کیا کھچڑی پکا رہے تھے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا سونیا کو!
وہ رمشا اور سلیمان کے رشتے کے بارے میں یقیناً پلاننگ کر رہے تھے تو وہ جو رمشا کی ماں تھی۔ اس کو اس مشاورت سے کیوں دور رکھا جا رہا تھا۔
سونیا نے چائے اسنیکس کے ساتھ لا رکھی۔
طاہرہ نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور آزر کو اشارے سے کچھ کہا تھا۔
"تم جاؤ میں نکال لیتا ہوں چائے۔" آزر نے حکمیہ انداز میں اسے کمرے سے بے دخل ہونے کو کہا تھا۔
وہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی آزر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔
اب گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا۔ دو تین بار اس کا جی چاہا وہ دروازہ کھول کر اندر چلی جائے۔
مگر پھر ٹھٹھک کر رک جاتی۔
اگر آزر نے اس شائستہ کے سامنے اسے ذلیل کر دیا اور طاہرہ تو پہلے ہی اس کے خلاف دل میں زہر بھرے بیٹھی تھیں، وہ بھی ساتھ مل جاتیں تو کیا ہوتا۔ یہی سوچ کر وہ ہر بار رک گئی۔
"مما یہاں کیوں اتنی دیر سے کھڑی ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں تھک جائیں گی۔" رمشا کی احساس بھری آواز سے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
وہ کیا کہتی اسے کہ اندر اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے اور اس کی بے بس ماں یوں ٹہل ٹہل کر اس فیصلے کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہے۔
"رمشا! تم اس رشتے کے لیے بالکل نہیں مانو گی، چاہے تمہارے پاپا، دادو جتنا بھی تمہیں پریشرائز کریں۔" وہ بے یقینی سی اس کے دونوں ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں تھام کر اسے سمجھا رہی تھی۔
رمشا کا رنگ فق سا ہو گیا۔
"مما جتنی خود ڈرپوک ہیں انہوں نے کیسے سمجھ لیا کہ ان کے بطن سے جنم لینے والی ان کی بیٹیاں ان کے برعکس بہت بہادر ہوں گی۔" رمشا دل میں سوچ کر رہ گئی۔
"تمہیں بننا پڑے گا بہادر، اپنی بہن، اپنی ماں کی طرح بزدل نہیں بننا رمشا!" سونیا نے اس کے دل کی آواز سن لی تھی۔
"ماما! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" وہ چاہتے ہوئے بھی ماں کو جھوٹی تسلی نہ دے سکی۔
"میں تمہارے ساتھ ہوں ہر جگہ، ہر وقت، تمہیں بس ڈٹ کر اس رشتے سے انکار کرنا ہے۔ کرو گی ناں میری جان! میں تمہیں ردا کی طرح کھونا نہیں چاہتی۔ وہ تو بہت دور چلی گئی تمہیں نہیں جانے دوں گی میں، پرامس کرو تم کہیں نہیں جاؤ گی مجھے چھوڑ کر۔" وہ اب رونے لگی تھی۔
رمشا ماں کو گلے لگا کر بے بسی سے رو پڑی اسے ماں کو اس طرح دلاسا دینا سمجھ میں آیا تھا۔ وہ اور کیا کرتی بزدل ماں کی بزدل بیٹی۔

☆☆☆

"کون تھا وہ شیرازی؟" بلال ماتھے پر بل ڈالے ناگواری سے سیل فون میں مصروف ثمینہ سے پوچھ رہا تھا۔

وہ صرف لمحہ بھر کو چونکی تھی پھر فون میں مصروف ہوگئی تھی۔

"ماما! میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ سے۔" وہ ضبط کے آخری قدم پر کھڑا تھا۔

"تمہارے کتنے دوست ہیں۔ کتنے لڑکے، کتنی لڑکیاں، کن سے ملتے ہو، کن سے نہیں۔ میں نے آج تک تم سے نہیں پوچھا تم مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔"

وہ سیل فون ایک طرف رکھتے ہوئے پوری خوداعتمادی سے بولی۔

"کیوں نہیں حق رکھتا۔" وہ دو بدو بولا۔

"یہ حق تو میں نے کبھی تمہارے باپ کو نہیں دیا۔" اندر آتے حیدر کے قدم وہیں ٹھٹھک گئے تھے۔

"یہ ان کی غلطی ہے کہ انہوں نے یہ حق استعمال نہیں کیا لیکن مجھے ان کی طرح سمجھنے کی غلطی نہیں کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے وہ شخص جس کا آپ بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ گئیں کون تھا۔"

بلال کا ایسا روپ ثمینہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ تو اسے حیدر کا ڈپلی کیٹ سمجھتی سب کچھ جان کر بھی انجان بن کر فقط گزارہ کرنے والا شخص۔

"میرا دوست تھا۔ تمہیں کیا پرابلم ہے اس سے؟" وہ زچ آ کر بولی۔

"پرابلم مجھے اس سے نہیں آپ سے ہے۔" وہ اسی طرح ترش تھا۔

ثمینہ اسے گھور کر رہ گئی۔ اٹھ کر اس کے مقابل کھڑی ہوگئی۔

"شادی ہونے والی ہے تمہاری جلد، اپنے دل میں وسعت پیدا کر دایمان یوں بھی باہر کی فضاؤں کی پروردہ ہے اتنی تنگ دلی کا مظاہرہ کرو گے تو تمہاری لائف ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گی۔ شادی کے شروع میں ہی۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی اسے متنبہ کر رہی تھی۔

"اور پھر آپ کو لگتا ہے ایک سمجھوتے کا دور شروع ہو جائے گا۔"

وہ طنز سے بولا حیدر ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"آف کورس۔" وہ خوداعتمادی سے کندھے اُچکا کر رہ گئی۔

وہ اب ثمینہ کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔

"شادی کے معاملات اعلا ظرفی سے، کشادہ دلی سے چلتے ہیں تمہیں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے۔"

"تو پھر زینب آنٹی سے بابا کے ملنے میں یا میرے کشف سے ملنے میں آپ نے اتنی تنگ دلی کا مظاہرہ کیوں کیا۔ آپ بھی وسعت دکھاتیں۔ برداشت کرتیں جیسے بابا آپ کو آپ کے سوکالڈ لبرل دوستوں کے ساتھ اتنے سالوں سے برداشت کرتے چلے آرہے ہیں۔"

وہ بھی آج مقابلہ کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ ثمینہ کا ماتھا شکن آلود ہوا۔

"وہ گھٹیا عورتیں۔" ثمینہ کو غصہ آگیا۔

"مائنڈ یور لینگویج ماما! ورنہ گھٹیا زبان مجھے بھی بولنی آتی ہے اور آپ سے زیادہ اچھی طرح سے۔" وہ حیدر نہیں تھا۔

حیدر کو پہلی بار باہر کھڑے انہونی سی خوشی کا احساس ہوا۔

"تم...... تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔" ثمینہ تڑپ کر رہ گئی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں نے دھمکی دی کب ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

ثمینہ نے بغور اسے دیکھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔" وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''جو آپ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔''
''بلال پہلیاں نہیں بجھواؤ مجھے جانا ہے باہر لیٹ ہو رہی ہوں میں۔'' وہ اس سے کترا کر جانے لگی۔
''مجھ سے بات ختم کیے بغیر آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔'' وہ اس کے سامنے کسی چٹان کی طرح کھڑا تھا۔
ثمینہ نے پہلی بار بے بسی سے اسے دیکھا۔
''تم چاہتے کیا ہو بلال۔'' قدرے تحمل تھا اس بار لہجے میں۔
''اگر آپ اپنی ان نام نہاد دوستیوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گی۔'' وہ اسے دھمکانے جا رہا تھا۔
''تم ہوتے کون ہو مجھے یہ دھمکی دینے والے۔'' وہ حلق کے بل چیخی۔
''آپ کا بیٹا......اگر آپ نے اپنی روش نہ بدلی تو مجھے کچھ سوچنا ہوگا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔
''کیا بکواس کر رہے ہو بلال؟''
''میں ایما سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ کی یہ دوستیاں ختم نہ ہوئیں تو۔'' اس بار اس کے لہجے میں واقعی صرف دھمکی نہ تھی۔
ثمینہ نے کچھ پریشانی سے اسے دیکھا۔
''تم ہوش میں تو ہو۔'' دوسرے لمحے وہ پریشانی چھپا کر بولی۔
''چاہتا ہوں، آپ ہوش میں آجائیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔
''یہ سب پٹیاں تمہارے باپ نے تمہیں پڑھائی ہیں نا۔''
''وہ اگر ایسا کچھ کرتے تو بہت پہلے یا تو آپ کی زندگی سے یہ دوستیاں جا چکی ہوتیں یا آپ اس گھر سے۔'' وہ آج کوئی بھی لحاظ رکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
''بس کرو بلال! میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کروں گی۔'' وہ آخر میں غصے سے چلائی۔
''یہی میں بھی آپ سے کہنے والا ہوں کہ میری برداشت بس یہیں تک تھی اب آپ کو کوئی فیصلہ لینا ہوگا اپنے سو کالڈ لبرل لائف اسٹائل کو بدلنا ہوگا یا۔''
وہ جان بوجھ کر رکا تھا۔
''کہنا کیا چاہتے ہو۔'' اس کا لہجہ بھی کڑوا ہو چکا تھا آج تک کسی نے اس سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔
''یا پھر آپ کو اگر ہمیں چھوڑ کر جانا ہے تو بے شک چلی جائیں یہاں کسی کو آپ کے جانے سے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔''
''بلال!'' اس نے پہلی بار بلال کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ وہ گنگ کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

ان کا پورا دن سفر میں گزر گیا۔
دن میں صرف ایک جگہ وہ چائے اور اسنیکس کے لیے رکے۔
''کھانا کھا لیتے ہیں رک کر پہلے۔'' موحد نے دو تین بار کہا۔
''آپ کو کھانا ہے تو کھالیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ بے رخی سے ہر بار صاف انکار کر گئی۔
''کتنی دیر تک نہیں کھاؤ گی؟'' وہ آخری بار کچھ جتانے کے انداز میں بولا تھا۔
''جب تک جی نہیں چاہے گا۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔
وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ہاں چائے سے اس نے انکار نہیں کیا خالی پیٹ کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح ......اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

اس لیے زینب نے اسے کبھی بھوکے پیٹ اسکول، کالج نہیں جانے دیا تھا۔اس کے دل سے ہوک سی اٹھی۔

اب یہ یادیں تو قدم قدم پر زنجیر بننے والی تھیں۔

"آئی یاد آرہی ہیں ناں......" وہ چائے پیتے ہوئے شاید اس کے چہرے کا مشاہدہ کررہا تھا۔

"نہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"کشف! آپ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہیں، میں نے کوئی زبردستی نہیں کی آپ کے ساتھ۔" اس کے روکھے جواب پر وہ جتا کر بولا تھا۔وہ باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں ڈھلتی شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اور فضاؤں میں پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔

اس کی منزل کہاں ہے وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ کو بڑی جلدی خیال نہیں آ گیا یہ جاننے کا۔" وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔

"میرا ارادہ تو رات بھر سفر کا تھا لیکن تھکاوٹ بہت ہو جائے گی اور پھر شاید اندھیرے کی وجہ سے رستہ نہ بھٹک جائیں سو رات میں کہیں رکنا ہوگا ہمیں۔"

"جانا کہاں ہے؟" اس نے پھر نہیں بتایا۔

"راستے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ابھی بھی باہر ہی دیکھ رہی تھی۔

اس نے جواب دیے بغیر گاڑی پھر سے اسٹارٹ کر دی۔

ایبٹ آباد پہنچ کر اس نے کشف سے مشورہ لیے بغیر اچھے سے ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی۔

وہ اس طرح بیٹھی رہی۔

"اترو بھئی میں اس سے زیادہ ڈرائیو نہیں کر سکتا، تھکاوٹ سے برا حال ہو چکا ہے میرا ہاں اگر تم ڈرائیو کر سکتی ہو تو میں پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ جاتا ہوں۔ تم ڈرائیو کر لو۔" اس کا لہجہ سراسر تپانے والا تھا اگر کشف کو ڈرائیونگ کی تھوڑی بہت بھی شدبد ہوتی تو وہ یہ چیلنج قبول کر لیتی۔

وہ دل میں کڑھتی اتر گئی۔

لگاتار سفر سے اس کی بھی کمر اکڑ چکی تھی۔

باہر کی فضا میں خنکی تھی اسے اپنا دوپٹہ کھول کر کندھوں کے گرد لپیٹنا پڑا۔موحد اندر ریسپشن کی طرف جا چکا تھا۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر خنک فضا میں گہرے سانس لینے لگی۔

☆☆☆

"اس وقت تم نے مجھے بلایا زینب! خیریت تو تھی ناں؟" سونیا گہری شام میں گھر میں داخل ہوئی، سامنے کھڑی زینب کو دیکھ کر بولی۔

وہ کچھ بولے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ کیا سارے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ لائٹ نہیں ہے کیا؟" سارے گھر میں اندھیرا دیکھ

کر سونیا گھبرا سی گئی۔
ردا کے جانے کے بعد اسے اندھیرے سے بہت محسوس ہونے لگی تھی۔ زینب نے خاموشی سے صحن کی لائٹ چلا کر دی۔
مغرب کی اذانیں بہت پہلے ہو چکی تھیں۔ اس وقت سارے میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔
دونوں برآمدے میں بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔
کمروں کی لائٹیں ابھی بجھی بند تھیں۔
تاریک کمروں کو دیکھ کر خوف سا آ رہا تھا۔
"پلیز لائٹس تو آن کرو کمروں کی، کیوں اتنا اندھیرا اچھا کر کھا ہے۔" زینب نے اٹھ کر اسی خاموشی سے ساری لائٹیں آن کر دیں۔
"کیا ہوا زینب! اتنی خاموش کیوں ہو؟ میرا دل گھبرا رہا ہے تمہاری چپ سے۔"
سونیا نے اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ زینب سر جھکائے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
"بولنے کو کچھ رہ نہیں گیا سونیا!" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے نکلی تھی۔
سونیا نے اسے چونک کر دیکھا۔
"کیا ہوا ہے سب خیریت ہے ناں اور یہ کشف کہاں ہے ابھی گھر نہیں آئی کیا؟"
زینب نے جواب میں حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ سونیا پریشان ہو گئی۔
"بتاؤ ناں زینب! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا حمزہ مجھے اتنی مشکل سے لے کر آیا جس طرح ایمرجنسی میں تم نے مجھے بلایا اور اب بالکل خاموش ہو بتاؤ تجھے کیا ہوا ہے؟"
زینب سر ہلا کر اٹھ کر اندر چلی گئی۔
واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں وہ کاغذ تھا۔ کاغذ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
"منہ سے بتانے کی ہمت ہے نہ حوصلہ تم خود پڑھ لو۔" وہ بے دم سی ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، سونیا حیران سی پڑھنے لگی۔

☆☆☆

ہوٹل کا کمرہ کافی کشادہ اور لگژری تھا۔
وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔
موحد کے فون آ رہے تھے، وہ سننے کے لیے باہر ٹیرس پر کھڑا تھا اشتہا انگیز کھانے سے ٹیبل بجی ہوئی تھی۔
موحد نے اس کے انکار پر کھانا کمرے میں ہی منگوالیا تھا۔
شاید وہ بھوکی ہی سو جاتی مگر اب سامنے سجے کھانے کو دیکھ کر مسلسل انکار کرنا کفران نعمت کے برابر تھا۔
"کیا بات ابھی تک شروع نہیں کیا؟" وہ فون سے فارغ ہو کر آیا تو بے تکلفی سے یوں بولا جیسے وہ نا معلوم کتنے وقت سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔
"اور اب پلیز یہ نہیں کہنا کہ مجھے بھوک نہیں ہے تم نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا یا اگر آپ چاہتی ہیں کہ نیو لی میرڈ کپل کی طرح میں لقمے بنا کر آپ کے منہ میں ڈالوں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں یہ بھی کر لیتا ہوں۔" وہ پلیٹ میں چاول نکال کر سالن ڈالتے ہوئے چمچہ اس کی طرف بڑھانے لگا۔
"پلیز......" وہ خائف سی ہو کر پیچھے ہٹی۔
"تو پھر شرافت سے یہ پلیٹ پوری صاف کرنی ہوگی ورنہ میں زبردستی کرنے کا بھی حق رکھتا ہوں۔" اس

نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے اسے دھمکایا اور پلیٹ اسے پکڑا دی وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"تمہیں یہ سب اپنی ماں سے نہیں کہنا چاہیے تھا بلال۔" حیدر کے لہجے میں افسردگی تھی۔
لیپ ٹاپ پر کام کرتے بلال نے ہاتھ روک کر سامنے کھڑے کافی کے دو مگ لیے حیدر کو دیکھا۔
وہ مگ ہاتھ میں لے کر خاموشی سے کافی پینے لگا۔
"میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں بلال!" وہ خفگی سے بولے۔
"وہ سب جو آپ کو بہت پہلے ان سے کہہ دینا چاہیے تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر مجھے کہنا پڑا اور اب! مجھے کہنے دیں، ماما کی اس حالت تک پہنچنے میں بہر حال کچھ ہاتھ آپ کا بھی ہے۔"
حیدر نے اسے چونک کر دیکھا۔
"میں نے تو ہمیشہ اسے جو کچھ چاہیے تھا، لا کر دیا، کرنے دیا۔"
"یہی آپ کی سب سے بڑی غلطی تھی، آپ نے ان کی مرضی کو حرف آخر سمجھ کر پہلے دن سے اپنی کمزوری ان کے ہاتھ میں دے دی تو پھر وہ کیوں گھر میں آپ میں، مجھ میں دلچسپی لیتیں۔"
وہ بہت سنجیدہ تھا۔
"بابا! عورت کو ہمیشہ من چاہی زندگی نہیں چاہیے ہوتی، اسے کچھ ایسا بھی چاہیے ہوتا ہے جو اس کے شریک زندگی کو پسند ہو، اس کی مرضی ہو۔ آپ نے ان سے شادی کر کے اپنی خواہش، مرضی سب کچھ پیچھے ڈال دیا۔ انہیں عادت پڑ گئی، کچھ اپنی منوانے کی۔"
وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔
"تمہارے سامنے میں نے جب بھی ایسا کرنا چاہا تو نتیجہ کیا نکلا۔ گھر میدان جنگ بن جاتا تم اور اماں کے ساتھ اس کا جو سلوک ہوتا، اس جنگ میں، میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"
وہ افسردگی سے بولے۔
"یہی آپ کی غلطی تھی، جسے انہوں نے آپ کی کمزوری سمجھ لیا مگر میں انہیں اب یہ سب نہیں کرنے دوں گا۔" اس کے لہجے میں عزم تھا۔
"تمہیں لگتا ہے، وہ تمہاری بات مان لے گی۔" وہ کچھ جتا کر بولے۔
"انہیں ماننی ہوگی۔" پتا نہیں اس کے لہجے میں مان تھا۔
"اللہ نہ کرے میرے بیٹے تمہارا یہ مان ٹوٹے۔" حیدر نے دل سے دعا کی۔
"تمہیں ایما کے ساتھ شادی نہ کرنے کی دھمکی نہیں دینی چاہیے تھی۔" وہ کچھ دیر بعد بولے۔
"اسی وجہ سے تو وہ پیچھے ہٹیں گی۔" وہ یقین بھرے لہجے میں بولا۔
"وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گی۔ تم لکھ لو میری بات۔"
حیدر کے لہجے میں کچھ تھا، بلال لمحہ بھر کو خاموش رہ گیا۔
"تو پھر ٹھیک ہے، اگر انہیں ہماری پروا نہیں، ہماری خوشی کا احساس نہیں تو میں بھی کبھی ان کی خوشی پوری نہیں کروں گا۔"
باہر کھڑی ثمینہ الجھ کر رہ گئی۔ بلال کے لہجے میں کچھ تھا، وہ پریشان ہو گئی۔

☆☆☆

سونیا کے ہاتھ اس کاغذ کو پکڑے جیسے شل ہو گئے۔

اس کاغذ کا بوجھ اس سے نہیں اٹھایا جا رہا تھا، جیسے اس کے ہاتھ میں کاغذ نہ ہو کوئی سل جیسا بھاری پتھر ہو۔
زینب کرسی سے ٹیک لگائے یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔
''تم نے اسے یہ سب کیسے کرنے دیا؟'' بہت دیر بعد وہ جیسے بیٹھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔
''اس نے کچھ بھی کرنے سے پہلے مجھے خبر نہیں ہونے دی۔ بتاؤ میں کیا کرتی اور اب بھی رات بھر...... میں تو جاگتی رہی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی وہ خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔''
بند باندھتے باندھتے پھر اس کے آنسو بہہ نکلے۔
''میں ابھی جا کر منصور بھائی سے بات کرتی ہوں، وہ اپنے بیٹے کے ٹھکانے کو جانتے ہوں گے، ابھی جاتی ہوں میں۔'' وہ چپلیں پیروں میں ڈال کر اٹھنے لگی۔
''کوئی فائدہ نہیں سونیا! ان دونوں نے نکاح کر رکھا ہے اور مجھے نہیں لگتا، منصور کا سوتیلا بیٹا اسے کسی قابل سمجھتا ہے۔ اس نے تو شاید انتقام میں کشف سے شادی کی ہے۔ شاید وہ منصور سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔'' زینب رک رک کر بول رہی تھی۔
''تم مجھے نہیں روکو، میں ابھی جا کر بات کرتی ہوں منصور بھائی سے بلکہ نہیں۔'' وہ بولتے ہوئے رک گئی۔
اس نے فون نکال کر منصور کا نمبر ملایا۔
''منصور بھائی! میں ادھر زینب کی طرف ہوں، آپ اپنی بیوی کو لے کر فوراً یہاں آئیں۔''
''سونیا کیا کر رہی ہو، تم ہوش میں تو ہو؟'' زینب اس کا فون چھیننے لگی۔
''ایمرجنسی ہی سمجھیں، بہت ضروری ہے اور زریں بھابھی کو ساتھ لے کر آئیں، ابھی اسی وقت۔''
کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
''تم پاگل تو نہیں ہو گئیں، کیوں بلایا ہے انہیں یہاں۔'' وہ غصے میں اس سے پوچھنے لگی۔
''اب یہ ضروری ہو گیا تھا زینب! انہیں بھی تو پتا چلے ان کا وہ خبیث بیٹا کس حد تک گرا ہوا ہے اور اگر انہوں نے کشف کو نہیں بلوایا تو میں......'' وہ جوش میں بولتے ایک دم سے چپ کر گئی۔
''تو کیا کر لو گی، پولیس کو انفارم کرو گی اور اگر آزر کو پتا چل گیا، تم یہاں ہو اور یہ سب جو ہو رہا ہے......'' زینب تیز لہجے میں بولی۔
''آزر اسلام آباد کے لیے نکلے ہیں۔ کل شام یا رات میں واپس آئیں گے۔ اسی لیے تو میں اس وقت یہاں آ گئی۔'' وہ مطمئن تھی۔

☆☆☆

بلال کا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔
ایما کی کال تھی۔
اور اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے یا کسی سے بھی بات کرے۔
تیسری بار فون آنے پر مجبوراً اسے کال ریسیو کرنی پڑی۔
''کیا بات ہے، کہیں بزی تھے بلال تم؟'' وہ تحمل سے پوچھ رہی تھی۔
''میں ذرا فرینڈز کے ساتھ تھا، کوئی ضروری بات کرنی ہے ایما تمہیں؟'' وہ اسی کے لہجے میں جواباً بولا۔
''نہیں، کچھ ایسی ضروری بھی نہیں۔ تم سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ چلو، اگر تم بزی ہو تو ہم رات میں بات کر لیں گے، ٹھیک ہے نا؟'' وہ فوراً رضامند ہوتے ہوتے بولی۔
''رات میں نہیں، کافی لیٹ ہو جاؤں گا۔ میں کل کسی وقت تم سے خود کانٹیکٹ کر لوں گا، پلیز۔''

اس نے عذر گھڑا۔
''اوکے، ایزیو وش۔'' اس نے افسردگی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔
''اس وقت تو میں نے بہانا گھڑ دیا، اس نے مان بھی لیا مگر شادی کے بعد جب ہر وقت کا ساتھ ہوگا تو میں اپنی فیلنگز کیسے اس سے چھپاؤں گا اور کیسے اس کے ساتھ سمجھوتا بھری زندگی گزاروں گا۔ یہ بہت بہت مشکل ہوگا۔'' وہ افسردہ سا پوچھنے لگا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک ہی کمرے میں دو اجنبیوں کی طرح لیٹے تھے۔ جیسے ہی موحد بیڈ پر آیا، وہ تکیہ اٹھا کر صوفے پر چلی گئی۔
اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔
''پلیز ابھی میں کسی بھی تعلق کو نبھانے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اتنا ٹائم تو دیں گے کہ میں خود کو نئے حالات کے مطابق ایڈجسٹ کر سکوں۔'' اس نے پورے دن میں سب سے طویل جملہ بولا۔
''نو پرابلم۔'' موحد نے سر ہلا دیا۔
''میں سمجھ سکتا ہوں، ہم جن حالات میں ساتھ ہوئے ہیں اور تم جس طرح گھر چھوڑ کر آ گئی ہو، ایک دم سے ایڈجسٹ ہونا مشکل ہے بہت...... جب تک تم ایزی فیل نہیں کرتیں۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا۔'' وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔
کشف کو قدرے سکون سا محسوس ہوا۔
لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ ایک کمرے میں کسی اجنبی کے ساتھ جسے وہ کاغذوں میں اپنا شریک سفر مان چکی ہے، اس طرح الگ الگ سونا کتنا مشکل ہے۔
موحد تو شاید دن بھر کی ڈرائیونگ کی تھکاوٹ سے چند منٹوں بعد ہی گہری نیند میں چلا گیا اور کشف کو لگا، جیسے اسے آج کے بعد کبھی نیند آئے گی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔
پتا نہیں، آنی کیا سوچ رہی ہوں گی، انہوں نے میرے بغیر کیسے دن گزارا ہوگا۔
اور اب رات وہ اکیلی کیسے گزاریں گی۔
میرے خدا یہ میں نے کیا کر دیا۔ اتنی جلد بازی کیوں دکھائی میں نے...... مجھے کچھ تو ٹائم دینا چاہیے تھا آنی کو، خود کو......
عجیب طرح کے پچھتاوے تھے جنہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔
وہ موحد کو گہری نیند میں سوتے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے یوں ہی گہری نیند میں سوتا چھوڑ کر چپکے سے یہاں سے بھاگ جائے۔

☆☆☆

حمزہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر باہر کی طرف جانے لگا، جب اسے لگا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔
وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا پھر طاہرہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔
طاہرہ بیڈ سے اتر کر شاید باہر آنا چاہ رہی تھیں جو دروازے سے ذرا فاصلے پر گری ہوئی تھیں۔
''دادو کیا ہوا ہے آپ کو، ٹھیک ہیں آپ۔'' اس نے جھک کر بمشکل طاہرہ کو اٹھایا۔
جن کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ان کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔
''آپ ٹھیک ہیں نا دادو! کیا فیل ہو رہا ہے۔''

اس نے طاہرہ کو پانی دیتے ہوئے رمشا کو آواز دی۔
"چکر...... بہت تیز چکر آرہے ہیں مجھے۔" وہ کمزور آواز میں بمشکل بولیں۔
"آزر...... میرے آزر کو بلاؤ فوراً...... آزر......" وہ نقاہت زدہ آواز میں بول رہی تھیں۔
"پاپا تو اسلام آباد گئے ہیں دادو!" رمشا نے پاس آ کر کہا۔
"اسے بلاؤ، اس سے کہو میرا آخری وقت آ گیا ہے سونیا...... سونیا...... کہاں ہے؟" وہ عجیب عیب باتیں کررہی تھیں۔
وہ دونوں ڈر گئے۔
"ماما کو تو میں زینب آنی کی طرف چھوڑ کر آیا تھا، اب لینے جا رہا تھا۔" وہ آہستہ سے رمشا سے بولا۔
"نہیں پلیز...... تم کہیں مت جاؤ۔ میں اکیلی نہیں سنبھال سکتی دادو کو۔ انہیں کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گی۔" رمشا گھبرا کر رونے لگی۔
"آزر...... آزر...... میرے بچے......" طاہرہ غنودگی میں آنکھیں بند کیے بول رہی تھیں۔
"سونیا! ادھر آؤ...... میرے ہاتھ پکڑو۔ میرے ہاتھوں پیروں سے جان نکل رہی ہے...... آ گیا میرا وقت...... آزر...... میرے بچے......" وہ آنکھیں بند کیے، ایک طرف ان کی گردن لڑھک گئی، رمشا کی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

"اگر بلال نے ایمان سے شادی سے انکار کیا تو خدا کی قسم میں اپنی جان لے لوں گی۔ تم جا کر اسے اپنی زبان میں سمجھا دو۔"
وہ حیدر کے سر پر کسی بلا کی طرح نازل ہوئی تھی۔
وہ اپنے آگے پڑی فائل الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت بھری حالت دیکھ کر لمحہ بھر کو کچھ بول نہیں سکا۔
"بہتر ہے، تم خود اس سے جا کر بات کرلو۔ وہ بھی تمہارا بیٹا ہے۔ تمہارے علاوہ کسی کی بات نہیں سمجھے گا۔" حیدر نے اپنی جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔
"بیٹا وہ میرا ہے، مگر بات اسے صرف تمہاری سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اسے لگتا ہے، تم نے میری وجہ سے بڑی تکلیف بھری زندگی گزاری ہے تو وہ صرف تمہاری بات سمجھے گا اور سنے گا اور تمہیں یہ کام کرنا ہوگا حیدر!" اس کا وہی لہجہ تھا جس میں وہ پہلے بھی اسے دھمکایا کرتی تھی۔
"ثمینہ! وہ میری بات کب سنتا ہے۔" حیدر بے بسی سے بولا۔ "تمہاری طرح...... وہ بھی ضدی ہے۔"
"وہ کس کی طرح ضدی ہے، یہ میں نہیں جانتی۔ اسے ایما سے شادی کرنا ہوگی اور اس کے لیے تم اسے راضی کروگے۔" وہ حکم دینے والے انداز میں بولی۔
"ٹھیک ہے، میں کہہ دوں گا اس سے۔" حیدر نے ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

زریں حیرت بھری نظروں سے اندرون شہر کی رونقوں کو دیکھ رہی تھی، اس کے گمان میں بھی کہیں نہیں تھا کہ کہیں اتنی مصروف، روشن اور لوگوں سے بھری ہوئی گلیاں اور بازار بھی ہوسکتے ہیں۔
وہ انہیں رک رک کر دیکھنے میں محو ہوجاتی اور منصور کو بار بار اس کے لیے رکنا پڑ رہا تھا۔
"پلیز، جلدی قدم اٹھاؤ، ابھی کافی راستہ باقی ہے۔" وہ اس کے پاس آ کر جھلا کر بولا، وہ کڑاہی سے گرم

گرم جلیبیاں نکلتی دیکھ کر حیران سی کھڑی تھی۔
''یہ کیا ہے منصور؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
''جلیبیاں میٹھی ہوتی ہیں، سوئٹس کی طرح۔ اب چلو۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔
''یہ لے کر دیکھیں ہم۔'' وہ بچوں کی طرح وہیں کھڑی تھی۔
''افوہ، واپسی پر لے لیں گے، تم ابھی تو چلو۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ساتھ لے گیا۔
''ہمیں ایما کو بھی ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اس کے لیے بھی یہ سب کچھ بہت ایکسائٹڈ ہوتا۔ ہے نا منصور۔'' وہ ابھی بھی اسی طرح اٹک اٹک کر چل رہی تھی، بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رستے میں ہی کھڑی ہو جاتی۔
''اگلی بار لائیں گے، ایما کو بھی ساتھ۔ اب تم تو چلو۔''
وہ اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر ساتھ لے گیا۔

☆☆☆

شاید آدھی رات گزر چکی تھی یا ابھی رات کا پہلا دوسرا پہر تھا۔
باہر بارش برس رہی تھی۔
شاید اس بارش کی آواز سے ہی موحد کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ چند لمحے بے حس سا بستر پر اسی طرح پڑا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کہاں ہے۔
''کشف صوفے پر تھی، اسے سردی لگ رہی ہوگی۔'' اس خیال کے آتے ہی وہ چونک کر سیدھا ہوا۔
صوفہ خالی تھا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔
اس کا دوپٹا بھی صوفے پر نہیں تھا، اگر وہ واش روم گئی ہوتی تو دوپٹا نہیں ہوتا۔
''کشف!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اٹھ کر واش روم گیا، وہ بھی خالی تھا۔ پانی گرنے کی آواز بھی نہیں تھی۔
اس نے دروازہ کھول کر دیکھا، وہ وہاں نہیں تھی۔
وہ ٹیرس کی طرف گیا۔ باہر تیز بارش برس رہی تھی اور ٹیرس خالی تھا تو وہ چلی گئی۔ اس کا ہینڈ بیگ بھی غائب تھا اس نے کمرے میں آ کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔
شاید پورا دن جو وہ خاموش رہ کر سوچتی رہی تھی تو اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

طاہرہ کا بلڈ پریشر خطرناک نمبرز کو چھو رہا تھا۔
آزر اور سونیا دونوں سے ہی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔
رمشا اور حمزہ بری طرح سے بوکھلائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ابھی چیک کر کے گیا تھا۔
''انہیں فوراً ہاسپٹل لے جائیں اگر انہیں ہاسپٹل موو نہ کیا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ جاتے ہوئے کہہ گیا تھا۔
حمزہ بار بار آزر کا نمبر ملا رہا تھا۔
اس کا نمبر آف تھا۔
''کیا پتا حمزہ! پاپا کے فون کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہو۔'' رمشا فکر مندی سے بولی۔
''ماما کیوں فون نہیں اٹھا رہیں۔'' جھنجلا کر بولا۔
''ماما کا فون تو ان کے روم میں ہی رہ گیا ہے، میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں۔'' وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"اب کیا کریں ہم، انہیں ہاسپٹل لے جائیں۔" حمزہ ایمبولینس کو کال کرنے لگا۔
"آزر...... آ گیا آزر...... کہاں ہے؟" طاہرہ نے نیم بے ہوشی میں ہاتھ ہلایا اور ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ ان دونوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور ان کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ دونوں ششدر سے کھڑے رہ گئے۔

☆☆☆

منصور ناگواری سے زینب کو دیکھ رہا تھا۔
"اس بات کا مجھ سے یا زریں سے کیا تعلق ہے۔ اگر تمہاری بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے تو۔"
اس کے لہجے میں وہی بے حسی، رکھائی اور بدلحاظی تھی جو ہمیشہ سے ہوتی تھی۔
"اس بات کا تعلق تمہارے بیٹے سے ہے منصور بھائی! اس نے کشف کو ورغلایا اور تمہارا انتقام لینے کے لیے اس نے کشف کے ساتھ یہ حرکت کی۔" سونیا سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بھی غصے میں بول اٹھی۔
"میرا کس بات کا انتقام اور میرا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے؟" وہ مزید بے لحاظی سے بولا۔
"بیٹی سمجھا ہو گا وہ کشف کو آپ کی، اسی لیے آپ سے بدلہ لینے کے لیے اس نے کشف کو ورغلا کر پہلے اس سے نکاح کیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" سونیا غصے میں بولی' زینب تو ان کے درمیان سر پکڑے بیٹھی تھی۔
"تم لوگوں کو الزام لگانے کے لیے میرا ہی بیٹا ملا تھا۔ میرا بیٹا اتنی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا، سنا تم نے۔" زریں بھی غصے میں چلائی۔
"کیوں نہیں کر سکتا، جس طرح منصور بھائی نے آپ کی زندگی میں جگہ بنائی، وہ پہلے دن سے اس طرح کی منصوبہ بندی کر کے یہاں آیا تھا۔" سونیا جلدی سے بولی، منصور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔
"شٹ اپ۔ تم لوگ میرے بیٹے پر ایسا الزام نہیں لگا سکتے۔"
"تمہارا بیٹا کیا دودھ کا دھلا ہے، اسے ابھی فون کرو۔ کشف کو لے کر آئے ورنہ......" زینب کی برداشت کی حد یہیں تک تھی شاید۔
"ورنہ کیا کرو گی، تم اپنی اس ناجائز بیٹی کے لیے ہمیں تھانے میں گھسیٹو گی۔"
"منصور بھائی!" سونیا زور سے چیخی۔
"آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا، میری پاک باز بیٹی پر اس طرح کا ذلیل الزام لگائیں۔" وہ غصے میں جیسے پاگل ہو گئی تھی اور باہر کھڑا آزر ششدر سا رہ گیا۔
"تمہاری بیٹی، واہ۔ اب تم یہ کھیل کھیلو گی اس زینب کی محبت میں اس کے گناہ کو چھپاؤ گی۔" منصور تمسخر سے دونوں کا مذاق اڑا کر بولا۔
"اس زینب سے بڑھ کر کسی سے کیا محبت کروں گی جس نے میری جائز اولاد کو، میری بیٹی کو ساری عمر اپنی اولاد بنا کر پالا اور آج آپ کا بیٹا وہ ذلیل شخص میری بیٹی کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ کریں فون ابھی اسے، اسی وقت لے کر آئے کشف کو اسی وقت۔"
سونیا کی نظر اندر آتے آزر پر پڑی۔ وہ شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فریحہ اشتیاق

ماں اور سائباں

وہ روئے جا رہی تھی اور ہاتھ والا نلکا زور زور سے چلاتی کپڑے نتھارے جا رہی تھی۔ کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا جو اس کی ماں دھونے کے لیے رکھ گئی تھی۔ لکڑی کی ڈوئی سے اس شدت سے اس کی ماں نے ضربیں لگائی تھیں کہ دونوں بازو درد سے شل ہو گئے تھے۔ مگر وہ ڈھیٹ بنی دکھتے بازوؤں سے کپڑے دھو بھی رہی تھی اور ہینڈ پمپ بھی چلا رہی تھی۔

اماں اس کی عزت افزائی کر کے حسب معمول محلے کے دورے پر روانہ ہو چکی تھی۔ اب دن ڈھلے گا تو اماں چوکٹ پار کرے گی۔ وہ غصے سے جلتی بھنتی، بس نہ چلتا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ بات یہ تھی کہ اس کی اماں باقی ماؤں سے جدا تھی۔ مائیں تو اپنے بچوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتیں۔ اپنے منہ میں نوالہ ڈالنے سے پہلے اپنی اولاد کا پیٹ بھرنے کی فکر میں مبتلا۔ کم از کم اس نے تو اپنے ارد گرد محلے میں رشتے داروں میں ایسی ہی مائیں دیکھی تھیں۔ مگر اس کی ماں جیسی تو کوئی ایک بھی نظر سے نہ گزری۔

اتنی پتھر دل کہ بد دعائیں اور کوسنے دینے پر آتی تو اپنی کوکھ جنی بیٹیوں کو ایسی بد دعاؤں سے نوازتی کہ

سننے والا حیرت سے اپنی انگلیاں چبا ڈالے۔ اماں کام چور، اوپر سے ظالم اور بدزبان، دو بیٹیاں اور تین بیٹے اور سب سے بڑی یہی کم بخت ماری 'فاخرہ'۔

سارے گھر کا کام فاخرہ کے ذمے، اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتی، کبھی کبھی وہ سوچتی اماں نہیں بلکہ وہ خود ان چار بچوں کی اماں ہے۔ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی جب اماں نے گھر کے کاموں کا رونا رو رو کر اس کا اسکول چھڑوا دیا۔ وہ باہر کے دروازے پر بیٹھی روز اپنی سہیلیوں کو اسکول جاتے دیکھتی تو ہوکا سا بھر کر اندر آ جاتی۔

پڑھنے کا بڑا شوق تھا اسے مگر اماں کا کیا کرتی وہ ابا اس کے مرنجان مرنج قسم کے اماں کی ایک آواز کر سہم کر منہ دیوار کی طرف کر کے سو جاتا۔ ان حالات میں وہ بھی چپ کر کے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

"مرن جوگی کیڑے پڑیں تیری قبر میں کہہ کر گئی تھی ہانڈی روٹی کر لینا مگر ہڈ حرام پیٹ کا درد پال کر بیٹھی ہے۔ اب میں کیا کھاؤں تیرا کلیجہ؟ یہ منحوس مارے الگ میری جان کھا رہے ہیں۔"

اماں نے بھوک سے روتے سات سالہ ٹیپو کو ایک مکا جڑا۔

"کمینی! تجھے تو ایسے گھر میں بیاہوں گی میں کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کے کھانا بنائے تو۔ اتنے ٹبر میں دوں گی تجھے کہ روٹیاں تھاپتے ہی عمر نکل جائے گی۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہے تو۔ ہر روز تیری ساس اور تیرا گھر والا ایسی مار لگائے تجھے کہ ہوش ہی بھول جائے اپنا۔"

وہ پیٹ کے درد سے دہری ہوتی چارپائی پر پڑی تھی۔ اسی وجہ سے رات کے کھانے کا بھی کچھ نہ کر سکی تھی نہ گھر کی صفائی کی، نہ بچوں کے کپڑے دھوئے اور برتنوں کا انبار بھی دھونے والا رکھا تھا۔

اماں نے آتے ہی پہلے خوب دھنائی کی اور اب حسب معمول منہ بھر بھر کے بددعائیں دے رہی تھی۔ ایسی بددعائیں اپنے لیے سن کر وہ پیٹ کا درد بھول بھال اب اس غم سے رو رہی تھی کہ اللہ نے یہ کیسی ماں دی ہے۔ میری ہی اماں ایسی کیوں ہے؟ یہ ساتھ والی سونیا کی اماں کیسا دھیما اور میٹھا بولتی ہے۔ سارا کام خود کرتی۔ کبھی سونیا کو کچھ کرنے ہی نہ دیتی تھی۔

"ارے یہی تو دن ہیں شرارتیں کرنے، ہنسنے کھیلنے کے، بے فکری کی زندگی، ساری عمر کام ہی کرنے ہیں۔ اگلے جانے کیسا سلوک کریں یہاں اپنے گھر تو بیٹی کو سکون دوں۔"

سونیا کی اماں کے ایسے خیالات سن کر کبھی تو اسے لگتا اس کی اماں سوتیلی اماں ہے۔ اصلی والی نہیں ہے۔ ورنہ ایسا ظالمانہ سلوک کیوں کرتی۔

☆☆☆

"زندگی جیسے کوئی ٹرین ہے اور ماہ و سال اس کے مسافر، فاخرہ کی عمر نے بھی چھبیسواں چکر پورا کیا اور ستائیسواں سال شروع ہوا۔ نہ اس کی اماں بدلی نہ اماں کے اطوار۔ اس کی چھوٹی بہن بیاہ کر اپنے گھر سدھار چکی تھی اور اب دو بچوں کی اماں کہلاتی تھی۔ ایک بھائی شادی کر کے بیوی کے ساتھ سسرال جا بسا تھا۔ سبب یہی اماں کی زبان......

اس سے چھوٹا اپنی محنت اور کوشش سے مسقط چلا گیا۔ اور سب سے چھوٹا ادھر ادھر جو بھی کام ملتا کر لیتا اور پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ سب بہن بھائیوں میں چھوٹا ٹیپو ہی ایف اے تک پہنچ سکا تھا۔ اور کیسے یہ بھی ایک الگ داستان تھی۔

فاخرہ کے ساتھ کی سب لڑکیاں بیاہی گئی تھیں۔ لیکن فاخرہ ابھی تک اماں کو ہی بھگت رہی تھی۔ بے شمار رشتے آئے مگر اماں نے ہونے نہ دیے۔

کبھی کوئی وجہ کبھی کوئی اعتراض۔ اب تو آس پاس والے بھی کہنے لگے تھے کہ "رشیدہ نے نہ بیاہنی اپنی بیٹی، اگر بیاہ دیا تو گھر کے کام کاج کون کرے گا۔ چھوٹی سی تھی جب سے گھر کے کاموں میں بے چاری کی جان کھپائی ہوئی ہے۔ پڑھنے بھی نہ دیا۔ باقی اس کے بچے اپنی اماں کے آگے زبان چلاتے،

جیسے وہ بولتی ویسے ہی منہ توڑ جواب دے دیتے جبکہ فاخرہ دبوسی ہے اپنے ابا کی طرح بس اللہ بچی کے نصیب جلد کھولے۔"

کہنے والے کمال کا تجزیہ پیش کرتے اور اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے۔

☆☆☆

ان ہی بے زار سے دنوں میں سے وہ ایک جاتی گرمیوں کا دن تھا۔ جب ابا کے دوست اپنے کسی جاننے والے گھر سے ایک رشتہ لائے۔ لوگوں کی باتوں سے تنگ آئے ابا نے اماں کے واویلے کی ذرا پروانہ کی۔ اور ہاں بول دی۔

اماں نے پہلے تو خوب چیخ چلا کر تماشا لگایا بعد میں اسے بددعاؤں سے نوازا اور بددعائیں بھی وہی اپنی مشہور زمانہ ساس اور شوہر کے مظالم اور مار کٹائی والی۔ فاخرہ بھی رونے لگ جاتی کبھی خود کو کاموں میں الجھالیتی۔

ان ہی حالات میں وہ فیضان کی دلہن بن کر اس کے گھر چلی آئی۔ اور اماں کی بددعائیں سے قطعاً الگ اس کا شوہر اور ساس نرم مزاج اور حلیم تھے۔ وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی۔ اور پھر شکر ادا کرتی کہ اسے اماں کی بددعائیں نہیں لگیں۔ ساس صدقے واری جاتی اور شوہر جان نثار۔

دبلی پتلی سی فاخرہ عمر چور واقع ہوئی تھی۔ عمر ستائیس، اٹھائیس مگر لگتی۔ بیس، بائیس کی۔ صاف رنگت اور چھوٹے چھوٹے دل کو بھا جانے والے نین نقش، کئی مہینے نکل جاتے مگر وہ میکے کا رخ نہ کرتی۔

ساس اور شوہر کہہ کہہ کر اس کو میکے جانے کو تیار کرتے۔ اس دن بھی وہ میکے جانے کی تیاری میں تھی کہ اس کی اکلوتی نند رابعہ اپنے بچوں کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر فروٹ اٹھائے صبح ہی آن پہنچی۔ اس نے بہتیرا کہا کہ میں پھر ہو آؤں گی میکے سے آج رابی آئی ہے کیا سوچے گی؟ کہ میں آئی اور بھابھی محترمہ خود میکے روانہ ہو گئیں مگر اس کی ساس نہ مانی۔

"ارے چار ماہ ہوئے تمہیں گئے، جاؤ مل آؤ اپنی ماں سے، یہ رابی تو آتی جاتی رہتی ہے۔ تم جاؤ شاباش۔ ماں تمہاری راہ دیکھتی ہوگی۔"

وہ چپ کر کے تیار ہونے چل دی کہ کیا بتاتی اماں کے خیالات اس کے بارے میں تا حال ویسے ہی تھے۔ برقع پہنے تیار وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ چکی تھی جب اس کی ساس تیزی سے ایک بڑا سا شاپر اٹھائے آئیں۔

"ارے رکو فیضان بیٹا...... ابھی نہ چلانا گاڑی اے بیٹی یہ پکڑو۔ وہاں باوا کے گھر جا کر کھانا اور دھیان رکھنا اپنا۔ اور دیکھو یاد سے کھالینا بھول نہ جانا۔"

اس کی گود میں شاپر رکھتے اس کی ساس نے تلقین کی۔

"مگر امی جی یہ ہے کیا؟" فیضان کی دیکھا دیکھی وہ بھی انہیں امی جی پکارنے لگی تھی۔

"وہ رابی چھل اور خشک میووں کی پنجیری بنا کر لائی ہے خالص دیسی گھی والی، تازہ ہے کھالینا تم، ہفتہ بھر بعد میں واپس آؤ گی اس لیے میں نے سوچا ساتھ کر دوں تمہارے کھالینا۔"

اسے ساتھ لگا کر نقاب کے اوپر سے ہی ماتھا چوما اور اندر چلی گئیں۔ فیضان نے بھی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھ الجھ جاتی۔ جب سے ہوش سنبھالا اماں کی بددعائیں ہی سنی تھیں دل دہلا دینے والی بددعائیں۔ کبھی کبھی اسے لگتا اماں اس کی ساس تھی اور امی جی اس کی حقیقی امی ہے۔ خدا نے اسے ساس کے روپ میں پیار برسانے والی ماں سے نواز دیا ہے۔

دو آنسو گرے اور اس کے اسکارف میں جذب ہو گئے۔ یونہی ایک سوچ ذہن میں آئی کہ ایویں لوگ ساس کو بدنام کرتے ہیں جن کو شکایت ہو وہ میری ساس سے ایک بار مل لے۔ میری زندگی کے تو سارے حساب الٹے۔ ماں ساس جیسی اور ساس اماں جیسی۔

حمیرا شفیع

حاشر کو آج بھی آفس میں کام کرتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ یوں تو پورا ماہ دسمبر ہی آڈٹنگ اور کلوزنگ کی وجہ سے بہت مصروف گزرا تھا مگر یہ آخری ہفتہ تو سب سے زیادہ بھاری ثابت ہو رہا تھا۔

نیا باس بہت باریک بین اور نکتہ چیں واقع ہوا تھا۔ خود بھی الجھا رہتا اور سارے اسٹاف کو بھی الجھائے رکھتا۔ اس کے شادی شدہ کولیگ کے پاس تو کبھی بچہ بیمار اور کبھی بیوی بیمار جیسے ہزار سچے جھوٹے بہانے موجود ہوتے تھے جن کا وہ بھرپور فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے مگر وہ بے چارہ ابھی کنوارا تھا۔ اس لیے بغیر چوں چرا کیے کام میں جتا رہتا۔

آج بھی فارغ ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا، جب دوبارہ میسج ٹیون سنائی دی۔ اس نے نظر انداز کر دیا۔ جب وہ پارکنگ سے بائیک نکال رہا تھا تو میسج ٹیون پھر بجی۔

''ہیں...... یہ کون ہے؟ جو اتنا اتاؤلا ہو رہا ہے۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اسکرین روشن کی۔ اس کے بھتیجے سنی کا پیغام تھا۔

''چاچو...... جلدی آؤ۔ آج کچھ موج مستی کا پروگرام ہے۔''

''ہیں۔ کیسی موج مستی......'' وہ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے حیران ہوا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو اس نے اپنی سالگرہ خوب گل غپاڑے کے ساتھ منائی تھی۔

پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اف...... آج تو دسمبر کی تیس تاریخ تھی۔ یقیناً کل نئے سال کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا۔ وہ زیرلب مسکرا دیا مگر زیادہ پرجوش نہ ہوا۔

آج سے چند سال پہلے تک وہ ایسے ہلے گلے والے پروگراموں کا شیدائی ہوا کرتا تھا اور بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اب تو ٹین ایج کب کی گزر چکی تھی۔ طبیعت میں شوخی اور شرارت کی جگہ سنجیدگی اور متانت نے لے لی تھی۔ مزاج میں اچھا خاصا ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ اس لیے اب یہ رنگینیاں دل کو زیادہ لبھاتی نہیں تھیں۔ مگر کیا کرتا...... ڈھیر سارے بھتیجے بھتیجیوں کا اکلوتا چاچا تھا۔ ہر حال میں ان کا بھی ساتھ نبھانا پڑتا تھا۔

وہ سوچوں میں غلطاں موٹر سائیکل چلاتا ہوا جب اوور برج کراس کر رہا تھا تو موبائل نے ایک بار پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے بٹن دبا کر کال کاٹ دی۔ پانچ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ پھر بجنے لگا۔ وہ بھنا اٹھا۔ بائیک سڑک کے کنارے روک کر موبائل نکالا۔ ارادہ تو سنی کی طبیعت صاف کرنے کا تھا مگر جب اسکرین پر نظر پڑی تو چونک گیا۔

سنی کے بجائے اس کے دوست واصف کی کال تھی۔ جھٹ بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔ واصف سخت گھبرایا ہوا تھا۔

''ہیلو حاشر! ابا کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔ فوراً یوسف ہسپتال پہنچو۔''

اس کا ماتھا ٹھنکا۔ واصف کے والد انیمیا کی بیماری میں مبتلا تھے۔ علاج جاری تھا مگر اس کے باوجود مہینے میں ایک دو بار ضرور انہیں خون کی بوتل چڑھانی پڑتی تھی۔ واصف ہمیشہ اپنے ان تمام

دوستوں سے رابطے میں رہتا تھا جن کا بلڈ گروپ اس کے والد کے بلڈ گروپ سے میچ کرتا تھا۔ آج یقیناً اس سلسلے میں اس کی ضرورت آن پڑی تھی اور وہ دل و جان سے مدد کے لیے تیار تھا کیونکہ اسے واصف کے والد سے بہت عقیدت تھی۔ ایک تو وہ اس کے مرحوم والد کے دوست ہوا کرتے تھے اور دوسرے ایک

زمانے میں وہ اس کے اسکول ٹیچر بھی رہ چکے تھے۔

اس لیے پہلے اس نے میسج کرکے سنی کو تمام صورت حال واضح کی اور پھر یوٹرن لے کر بائیک کا رخ ہسپتال کی جانب موڑ دیا۔

وہ ہسپتال پہنچا تو صورت حال اچھی خاصی نازک تھی۔ واصف کے والد خون کی کمی سے نڈھال تھے اور وہ خود اکیلا ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھا تھا۔

حاشر کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر خون کی بوتل لگوانے سے لے کر باقی دوا دارو کا انتظام دونوں نے مل کر کیا۔ صبح کی پہلی اذان کے ساتھ ہی مریض کی حالت پرسکون ہوگئی۔ اس کی لال انگارہ آنکھیں اور مضمحل وجود کو دیکھ کر واصف نے اسے زبردستی گھر بھیج دیا۔ جب وہ گھر آرہا تھا تو تھکن کے ساتھ ساتھ شدید بھوک کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اگرچہ رات کو واصف کے گھر سے کھانا آگیا تھا مگر اس کے والد کی خرابی طبیعت سے پریشان وہ بامشکل چند لقمے ہی زہر مار کر سکا تھا۔

گیٹ کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے بائیک گیراج میں کھڑی کی اور تھکے تھکے قدموں سے اندر داخل ہوا۔

سارے گھر پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ لاؤنج میں بے ترتیبی ہی بے ترتیبی تھی۔ صوفے کے کشن کارپٹ پر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

جگہ جگہ نمکو اور بسکٹ کے ریپر، جوس کے خالی پچکے ہوئے ڈبے اور بہت سارا مزید پھیلاوا دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کافی کھل کر موج مستی کی گئی ہے۔

کچن کی بتی جل رہی تھی۔ اس نے واش بیسن سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر آٹے کے کنستر پر دھرے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا۔ ٹھنڈی برف، مڑی تڑی سی ایک چپاتی پڑی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر ہاٹ پاٹ بند کر دیا۔ پھر اس کی نظر سامنے شیلف پر پڑی۔ ٹرے میں کچھ ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے دسترخوان ہٹایا۔ ایک مشہور ہوٹل کی بریانی کا ایک ڈبا موجود تھا اور ساتھ ہی ایک پلیٹ میں بڑا سا ٹکڑا کیک کا اور دو چھوٹے ٹکڑے پیزا کے رکھے تھے۔

شدید بھوک میں یہ بھی غنیمت تھا۔ اس نے ڈبا کھولا اور پاس پڑی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر چاول کھانے لگا۔ یوں تو جو کھانا اس وقت اس کے سامنے موجود تھا، وہ آج کل کی نوجوان نسل کا مرغوب تھا۔ مگر اس کا معاملہ ذرا الٹ تھا۔ وہ بچپن سے ہی گرم چپاتی کا عادی تھا۔ گول گول، گرما گرم، خوشبودار، بھاپ اڑاتی، سنہری رنگت کی چپاتی اس کی من پسند چیز تھی۔

اس کے والدین کے لیے یہ بات نہایت اطمینان بخش اور خوش آئند تھی کہ جہاں گھر کے دوسرے بچے نوڈلز، پزا، برگر اور بریانی کے دیوانے تھے، اسے ہر حال میں بھوک مٹانے کے لیے فقط چپاتی چاہیے ہوتی تھی۔ گرما گرم توے سے اترتی چپاتی کا وہ اس قدر رسیا تھا کہ اگر کبھی سالن موجود نہ بھی ہوتا تو وہ خالی چپاتی سے ہی گزارا کر لیا کرتا تھا۔

اس کی ماں اس کی پسند کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ باقی سارے بچوں کے لیے ایک بار ہی روٹیاں پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیتیں مگر وہ جب منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آتا تو اس کے لیے تازہ گرم گرم چپاتی اتارتیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ گیس لوڈشیڈنگ کی وجہ سے گیس مخصوص اوقات میں ہی میسر ہوتی تو بچت کے خیال سے ماں دو تین وقت کی روٹیاں اکٹھی ڈالنے لگیں مگر اس کے لیے ایک چھوٹا سا سلنڈر خرید لیا گیا اور اسے تازہ روٹی ملتی رہی۔

پھر ماں گزر گئی تو ان کی جگہ بڑی بھابھی نے لے لی۔ وہ خالہ زاد بھی تھیں، اس لیے اس کی عادت سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے بھی اس چیز کا خیال رکھا۔ پھر بھائی کی جاب مسقط میں ہوگئی تو وہ ان کے ہمراہ چلی گئیں مگر جاتے جاتے دونوں چھوٹی بھابھیوں کو تاکید کر گئیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ تو خیال رکھا۔ پھر بچوں کی مصروفیت میں گھر کر بھول بھال گئیں۔

وہ بھی ہاٹ پاٹ میں رکھی روٹی کا عادی ہوگیا۔ کبھی کبھار عین روٹیاں پکنے کے وقت پر آجاتا تو گرم گرم چپاتی کی عیش بھی ہوجاتی اور ماں کی یاد بھی تازہ ہوجاتی۔

☆☆☆

یوں ہی سوچوں میں ڈوبے ڈوبے اس نے چاولوں کی پلیٹ ختم کی۔ کیک کا ٹکڑا کھا کر چولہے پر چائے تیار کرنے کے لیے پانی چڑھا دیا۔ اتنے میں ڈور بیل بجی۔

"ہیں...... اتنی سویرے کون آ گیا؟"

اس نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے کھیس میں لپٹے لپٹائے مالی بابا کھڑے تھے۔

"بابا...... اتنی صبح؟" وہ کچھ حیران ہوا اور ایک سائیڈ پر ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

"بس حاشر بابو! باجی نے کہا تھا کہ آج پودوں کی کانٹ چھانٹ بھی کرنی ہے اور کچھ نئے بیج بھی بونے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے میرے ساتھ آئیں۔ گرما گرم چائے کا ایک کپ ہوجائے۔" وہ انہیں لیے کچن میں چلا آیا۔ وہ بچپن سے ہی اس کے گھر میں کام کررہے تھے۔ اس لیے وہ ان سے بہت مانوس تھا۔ اس نے بیٹھنے کے لیے اپنی کرسی پیش کی اور خود ابلتی ہوئی چائے میں ایک کپ دودھ مزید انڈیل دیا۔ پھر دو کپوں میں چھان کر چائے نکالی اور ایک ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"حاشر پتر! میری گھر والی کے بھائی کا چہلم تھا۔ وہ کل سے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ میرا ابھی خالی گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ سوچا سویرے ہی چلا جاؤں اور لان کا سارا کام کرلوں۔" وہ سادگی سے بتا رہے تھے مگر وہ ٹھٹکا۔

"اوہو...... پھر آپ نے ناشتا تو نہیں کیا ہوگا۔ آپ یہ لیں۔" اس نے پزا کے دو ٹکڑے ان کی طرف بڑھائے۔

"ہاٹ پاٹ میں روٹی تو موجود ہے، مگر وہ بہت ٹھنڈی ہے۔" اس نے کہا۔ ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ کے اثرات نمودار ہوئے۔ پھر وہ نرمی سے بولے۔

"کوئی بات نہیں پتر! تم مجھے یہ ٹھنڈی روٹی ہی دے دو۔" پھر اس سے لے کر ٹھنڈی روٹی کے ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے گرم چائے میں بھگو بھگو کر مزے سے کھانے لگے۔

وہ کچھ دیر تک انہیں دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

"بابا...... آپ اتنی ٹھنڈی روٹی کیسے کھا رہے ہیں۔ مجھ سے تو کھائی نہیں جاتی۔"

"دیکھو حاشر پتر! رزق ٹھنڈا یا گرم نہیں ہوتا۔ رزق تو رزق ہوتا ہے۔ شکر ہے اس مالک کا جس نے رزق دیا۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ روک کر اپنی بات مکمل کی اور وہ پھر دوبارہ کھانے لگے اور وہ انہیں کھاتے ہوئے غور سے دیکھنے لگا۔

آج سال نو کی پہلی صبح تھی اور وہ ہر چیز سے بے نیاز باسی روٹی چائے کے ساتھ یوں خوشی خوشی کھا رہے تھے جیسے کوئی ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اسے ان کے بوڑھے چہرے پر عجب سا وقار اور نور نظر آیا جو یقیناً اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے احساس کی دین تھا۔ رب تو اپنے بندوں کو ڈھیروں ڈھیر نعمتوں سے نوازتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ بدنصیب من و سلویٰ میں بھی نقص نکالتے ہیں اور کچھ خوش نصیب عام کھانے کو بھی من و سلویٰ سمجھ کر کھاتے ہیں اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں جو انعام کے طور پر انہیں سکون اور قناعت کی دولت سے مالا مال کردیتا ہے۔

اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر رشک سے اس چٹے ان پڑھ شخص کی طرف دیکھا جس نے سال کی پہلی صبح اسے ایک خوب صورت سبق سکھایا تھا اور یہ سبق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری کا تھا۔

☆

جبیں چیمہ

گرمیوں کے دن تھے، دوپہر ڈھل چکی تھی۔ جب فاطمہ ماچھن نے چارپائیاں سائے میں لاکر بچھانی شروع کیں۔

اماں جی باہر نکل کر سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ تب ہی ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ صابن سے مل مل کے اپنے پاؤں دھو رہی تھی۔ پاؤں دھونے کے بعد وہ اپنے جوتے دھونے لگی اور پھر ہاتھوں کی باری آئی۔ وہ بار بار صابن رگڑتی۔ ہاتھوں پر پانی بہاتی اور پھر سے صابن رگڑنے لگتی۔

سکندر کی بیوی اور گھر میں کام کرنے والی بچیاں جانے کب سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جانے کچھ عرصے سے اسے یہ کیسا وہم ہو گیا تھا۔ کہ اس کے ہاتھ پیروں اور جسم پر کوئی ان دیکھی نجاست لگ گئی ہے۔ جو کسی صابن، کسی پانی سے اتر کے نہیں دے رہی تھی۔

انہوں نے اسے کافی دم کروائے۔ منتیں مانیں۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، ان کی یہ بیٹی بہت شوخ اور چنچل تھی۔ ہر وقت رونق لگائے رکھتی۔ مگر اب کچھ عرصے سے وہ ایسی گم صم ہوئی تھی کہ لگتا وہ بات کرنا بھول گئی ہے۔

وہ جو اباجی کی لاڈلی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی۔

پڑھائی چھوڑے بھی سال بھر ہو گیا تھا جو رشتہ بھی آتا۔ وہ واپس چلا جاتا۔ خاص طور سے طلعت کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد وہ یا تو اپنے اوپر پانی بہائے جاتی۔ یا پھر گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اس وقت بھی ساری دوپہر پانی بہانے کے بعد وہ پاس پڑی لوہے کی کرسی پر بیٹھی کہیں کھو چکی تھی۔

☆☆☆

بھائی سکندر حیات کی مہندی کی رات تھی۔ حویلی

ناولٹ

کی دیواریں، منڈیریں اور اردگرد کے درختوں، پودوں اور پھولوں کی جھاڑیوں کے علاوہ اردگرد کی عمارتوں پر بھی چراغاں کیا گیا تھا۔

پھوپھی بخت آور جانے کس بات پر روٹھی بیٹھی تھیں کہ اباجی، بھائی سکندر اور اماں کے جانے پر بھی آنے کو تیار

65

نہیں تھیں۔ انہیں رہ رہ کے اس زمین کا قلق اٹھتا تھا۔ جو دادا کے مرنے پر اس کے ابا نے اپنے نام کروالی تھی۔ اب اگر ابا کو اک بہن بھی بھتیجے کی شادی میں شامل نہ ہوتی۔ تو ساری برادری منہ جوڑ جوڑ کے باتیں کرتی۔

ان ہی باتوں سے بچنے کے لیے ابا آخری بار اسے لے کر پھوپھی بختے کے گاؤں گئے تھے۔

پھوپھی کے قدموں میں کندھے سے چادر اتار کے رکھ کے ابا نے اسے بھی پھوپھو کے قدموں میں بٹھا دیا تھا۔

''راضی نامہ تو ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے۔ یا میری زمین واپس کرو یا نورالعین کا رشتہ شوکت محمود سے کردو۔'' پھوپھی بختے نے دوٹوک کہا۔

''اچھا تم چلو تو سہی، وہاں بیٹھ کے بات کرلیں گے۔ عینی کی ماں بھی سامنے ہوگی۔ اب گھر آ کے تو بیٹی کی بات کرتے اچھے نہیں لگتے۔ بس اٹھو تیار ہو جاؤ۔ جو ہوگی۔ ہو جائے گا۔'' ابا نے بات سمیٹی۔

''لو ایسے کیسے اٹھ کے چل پڑوں، کل آؤں گی۔ تیاری کے ساتھ آخر اپنی بیٹی کا شگن بھی کرنا ہے۔'' انہوں نے نورالعین کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

''اف شوکت محمود...... نہیں...... کبھی نہیں۔'' اس نے جھرجھری لی۔

پھوپھی بختے کا شوکی انتہا درجے کا بدتمیز، گالیاں بکنے والا، کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ وہ سب بہن بھائی اس کا بے حد ریکارڈ لگاتے۔

پھوپھی بختے جب بھی گاؤں آتیں۔ بھائی سکندر شوکی کا سر گنجا کروا دیتے اور پھر اکثر ٹیوب ویل پر اسے دھوکے سے کڑوا تیل سر کی مالش کے لیے دیتے اور وہ اکثر اس حال میں گھر آتا۔ کہ سر منہ پیٹ رہا ہوتا۔

''ہائے وے شوکیا ایہہ کی کر ریا ایں۔ ہائے شوکے یہ کیا کر رہے ہو۔'' امی انجان بنتیں۔

مامی پا سکندر نے مینوں کوڑا تیل لا دتا اے۔

مامی! بھائی سکندر نے مجھے کڑوا تیل لگا دیا ہے۔

تب ہی پھوپھی بختے کسی کمرے سے برآمد ہوتیں۔

''ہائے نی میں مرگئی۔ شوکت پرویز کا یہ حال کس نے کر دیا ہے۔'' وہ دہائی دیتیں۔

شوکت کا پہلا نام تو شوکت ہی رہتا۔ مگر اس سے اگلا نام کبھی جاوید کبھی پرویز کبھی رشید کبھی حمید اور کبھی محمود ہو جاتا۔ وہ بہن بھائی شوکت کو شوکا ہی کہتے بھائی سکندر اور خضر اکثر گرمیوں میں شوکے کی چارپائی باہر والے صحن میں رکھ آتے۔ اکثر توے سے اس کا منہ کالا کر دیتے۔

وہ کھانے پینے کا بھی بے پناہ شوقین تھا۔ جو ملتا کھا کے دم لیتا۔ بھائی سکندر اور خضر اس کا ناک میں دم کیے رکھتے کہ بھئی تم تو کچھ کھاتے ہی نہیں۔

اور اب اسی شوکت پرویز یا شوکت محمود کا نام اس کے نام کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ وہ جو ایف اے پاس تھی اور شوکا دسویں فیل۔

''خیر ابا کی منتوں، ترلوں کے باوجود پھوپھی پھوپھا، شوکا، اپیا پروین کل آ رہے تھے۔ آج نہیں مگر آج تو بھائی سکندر کی مہندی تھی اور مہندی پر جتنے گانے تیار کیے تھے۔ اس کی کاپی بھی نورالعین کے پاس تھی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم تھا اور مہمان تھے کہ مسلسل آ رہے تھے۔''

اس لیے وہ دوپہر کو ہی ابا کے ساتھ واپس اپنے گاؤں روانہ ہوگئی۔

نورالعین سے بڑی طلعت تھی، جس کا اسی علاقے کے ایک بہت معزز گھرانے سے رشتہ آیا ہوا تھا۔ اٹھارہ سال کی طلعت اور سترہ سال کی نورالعین دو ہی بہنیں تھیں اور اکیس سال کے سکندر بھائی اور بیس سال کا خضر یہ دوان کے بھائی تھے۔

سکندر بھائی کی شادی ان کی برادری میں ہی میٹرک پاس راحیلہ سے ہو رہی تھی۔ سکندر بھائی اور خضر بھائی دونوں ہی میٹرک کے بعد زمینوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ طلعت کا جہاں سے رشتہ آیا تھا۔ وہ لوگ بھی اس شادی میں آنے والے تھے نہ انہوں نے ابھی لڑکی کو دیکھا تھا اور نہ ان میں سے کوئی ابھی ان کے گھر گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ طلعت کو پسند کرلیں گے۔ تو یہ بھی رسمی طور پر چکر لگا آئیں گے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ ان سے ہر لحاظ سے کافی بہتر تھے۔ اس

گھرانے کا رعب اور دبدبہ سارے علاقے میں تھا۔ ان کے گھوڑوں کی دھوم کافی دور دور تک تھی۔

خیر شام کے جھٹپٹے میں وہ لوگ گاؤں کے نزدیک پہنچے تو ابا تانگے سے اتر گئے۔ انہیں کچھ اور کام بھی سنبھالنے تھے۔ وہ راجباہ کے پل سے نیچے اترے تو دور دور تک پھیلے سونے سے رنگے کھیتوں کے دوسری طرف ٹالوں کے سبز درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ گندم کٹائی کے لیے تیار تھی اور ان سنہری کھیتوں اور سبز پھل دار درختوں کے بیچوں بیچ اس کے ابا کی حویلی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ روشنیوں سے نہائی ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف خوشیاں اور رونقیں برس رہی ہوں۔

تانگہ آہستہ آہستہ حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا اور جوں ہی وہ حویلی کے سامنے جا کر رکا اور نور العین نے تانگے سے اترنے کے لیے پائیدان پر قدم رکھا۔ ایک گھوڑ سوار جانے کہاں سے گھوڑا بھگاتا ہوا تانگے میں جتے گھوڑے کے سامنے آگیا۔ گھوڑا ڈر کر بدکا اور نور العین سنبھلتے سنبھلتے بھی پائیدان سے پاؤں پھسلنے کی وجہ سے نیچے گر گئی۔

وہ جو بھائیوں اور باپ کی بے پناہ لاڈلی تھی۔ وہ جو اپنے گاؤں کی حد تک اپنے آپ کو کسی شہزادی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ وہ جہاں سے گزرتی۔ لوگ راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے۔ اس کے سامنے کس کی مجال تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار آئے اور اس کے تانگے میں جتے گھوڑے کو ڈرا دے۔ وہ پریشان سے زیادہ حیران تھی اور فضل کوچوان تھر تھر کانپتا ہوا منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔

کہ بی بی کو اس طرح زمین پر گرے دیکھنا بہت معیوب تھا۔ وہ اٹھنے کو تھی۔ جب ایک مردانہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔

''مجھے افسوس ہے۔ میرے گھوڑے کے اتھرے پن کی وجہ سے آپ گر گئیں۔ یہ کبھی کبھی میرے قابو سے بھی باہر ہو جاتا ہے...... آئیے!'' وہ چوڑا اور مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

اس نے نگاہ اٹھا کے اوپر دیکھا، وہ جو کوئی بھی تھا۔ کالے شلوار قمیص میں سفید گھوڑے کی ایک ہاتھ سے لگامیں کھینچے ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھائے گھوڑے پر جھکا ہوا تھا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ سفید سلیشن کے گھیر دار کپڑوں میں سیاہ بالوں کا ڈھیر لیے وہ اٹھ گئی۔

وہ چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر نور العین نے حویلی کا چھوٹا گیٹ کھلتے دیکھا۔

''نور بی بی! آؤ چھیتی کرو۔ بی بی جی کلے ای صبح دے لگے نیں۔ نور بی بی جلدی آؤ۔ بی بی جی صبح سے اکیلی ہی لگی ہوئی ہیں)''

وہ جلدی سے اندر داخل ہونے لگی۔ جب وہ پھر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

''میں ٹاہلی والے سے آیا ہوں۔ گھر سے کسی مرد کو بھجوائیں۔''

''اوہ!'' وہ چونک کے پلٹی، وہاں سے ہی تو طلعت کے لیے رشتہ آیا تھا۔

''آپ اکیلے آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے خواتین آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔'' اس نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''خواتین بھی پہنچنے والی ہیں۔ بس میں یہ دیکھنے کے لیے کہ موٹر پہلے پہنچتی ہے یا میرا گھوڑا، میں اکیلا ہی پہنچ گیا۔''

''آپ اندر آئیں، میں بھائی کو بھیجتی ہوں۔''

وہ اندر آئی تو سامنے ہی سکندر بھائی آرہے تھے۔

''بھائی! وہ باہر آپ کے مہمان کھڑے ہیں۔'' وہ انہیں اطلاع دے کر اندر بڑھ گئی۔

جانے یہ کون ہے، نام کیا ہے کتنا شان دار لگ رہا تھا۔ کیسا ہیرو سا لگ رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس شاندار بندے کو ایک نظر پھر دیکھے مگر اب وہ وہاں نہیں تھا۔

اور پھر رات کو جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تالیاں پیٹ پیٹ کے ہاتھ سرخ کر رہی تھی اور ٹاہلی والے سے آئی ہوئی خواتین بڑی دلچسپی سے ان کے ساتھ ماہیے اور ٹپے گا رہی تھیں۔ وہ اچانک ہی خضر بھائی کے ساتھ حویلی کے

چھوٹے دروازے سے اندر آ گیا۔

"بنو تیرے باوا کی اونچی حویلی بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا۔"

گاؤں کی پڑھی لکھی لڑکیوں نے نئی تان لگائی۔ اس کی آواز سب سے اونچی تھی۔

تب ہی اسے اپنے اوپر جمی نظروں کا احساس ہوا۔ وہ قریب ہی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے فوراً تالیاں پیٹتے ہاتھ نیچے کر لیے اور بغیر وجہ کے ہی دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

"آصف بھائی! آئیں۔ کمرہ خالی ہو گیا ہے۔" خضر بھائی اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اچھا تو موصوف کا نام آصف ہے۔

اور اگلے دن بارات چڑھنے سے پہلے جب پھوپھو بمعہ اہل وعیال پہنچیں اور آتے ہی نورالعین کا رشتہ یہ کہہ کر مانگا کہ کل بھائی ان سے وعدہ کر آئے تھے تو سب ہکا بکا رہ گئے۔

اور نورالعین جس نے ساری رات کسی کے سپنوں میں گزاری تھی۔ اس کے لیے سب سے تکلیف دہ مرحلہ اس وقت آیا۔ جب طلعت کو ساتھ بٹھا کے آصف اور سعدیہ نے ایک موٹا سا لفافہ سلامی کے طور پر اسے دیا۔

آصف کے گھر سے دو عورتیں سعدیہ اور بشریٰ آئی تھیں۔ بشریٰ آصف اور تنویر کی بہن تھی۔ جبکہ سعدیہ آصف کی بیوی تھی۔

جانے سعدیہ کو آصف کے ساتھ بیٹھے دیکھ کے نورالعین کے اندر کیسی آگ بھڑکی کہ وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے اندر ایک سناٹا سا اتر آیا تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ہر چیز کو تہس نہس کر دے یہ کیوں آیا تھا۔ میرے راستے میں، اس کے اندر سے بار بار کوئی چیخ رہا تھا۔

کیا واقعی پہلی نظر میں ہی محبت ہو جاتی ہے۔ وہ جو ناداں تھی۔ بالی عمر تھی، ناتجربہ کاری تھی آنے والے کی شخصیت کے سحر میں ڈوب گئی تھی اور دوسری طرف جو مرد تھا۔ زمانہ شناس تھا، گھاگ تھا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا۔ مگر اثر اس پر بھی یقیناً نورالعین کی خوب صورتی اور معصومیت کر چکی تھی۔

تب ہی تو اس شام جب سکندر بھائی کی بارات چڑھی اور ہر کوئی بارات دیکھنے میں مگن تھا اور وہ اپنے گھیردار آف وائٹ لباس اور میرون چنے ہوئے دوپٹے میں کہیں کی مہارانی لگ رہی تھی۔ جانے کیسے سب کی نظروں سے بچتا ہوا وہ اس سے آ ٹکرایا۔

"یہ رکھ لو۔" اس نے اس کی مٹھی میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دبایا۔

"تم بہت خوب صورت ہو، کتنی؟ یہ میں تمہیں رات کو بتاؤں گا۔"

اور وہ جس طرح بھیڑ چیرتا ہوا آیا تھا۔ اسی طرح واپس لڑکوں میں گھل مل گیا۔

اسے لگا جیسے ہر کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ جیسے پوری کائنات کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہیں۔ وہ سختی سے مٹھی بند کیے لوگوں سے ٹکراتی اپنے کمرے میں بھاگی اور اپنے ہاتھ کی بند مٹھی کھولی تو اس میں آصف کا موبائل نمبر تھا۔

"کیا سمجھتا ہے وہ مجھے۔" اس کا دماغ چیخا۔

"وہ شادی شدہ ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنی بیوی کو کیا عزت احترام دیتا ہے اور دوسری لڑکیاں صرف دل پشوری کے لیے۔"

"پھاڑو اسے اور باہر پھینکو۔ یہ کاغذ کا ننھا سا ٹکڑا نہیں ہے۔ بلکہ یہ زہریلا سانپ ہے جو تمہارے ہاتھ میں آ گیا ہے۔"

"دھیرج بھئی دھیرج۔" دل نے دماغ کو سمجھایا۔ "دیکھیں تو سہی رات کو کہتا کیا ہے اس کے بعد نمبر ڈیلیٹ کر دیں گے۔" اور پھر ایسے معاملات میں دماغ کی کون سنتا ہے۔ نرا خشک زاہد ناصح۔

☆☆☆

بارات قریبی قصبے میں جانی تھی۔ مگر رات کے آنے اور جانے میں اور رات کو دولہا دلہن کو ان کے کمرے تک پہنچانے تک نورالعین پر دو آنکھیں نگران رہیں۔ وہ جہاں بھی جاتی۔ اسے لگتا دو گہری

براؤن آنکھیں اس کا تعاقب کررہی ہیں۔
رات کے ہنگاموں سے نبٹتے نبٹتے جانے رات کو کون سے پہر اس کی آنکھ لگی۔ مگر پھر فون کی تیز آواز سے کھل گئی۔ اس نے جھنجلا کے فون بند کرنا چاہا مگر اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کے وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔
"کون ہوسکتا ہے۔" اس نے سوچا۔
"ہیلو" وہ سوئی سوئی سی آواز میں بولی۔
"سو رہی تھیں۔" ایک اجنبی اور بھاری آواز ابھری۔
"جی کون بول رہا ہے۔" وہ سنبھل کے بیٹھی۔
"کون ہوسکتا ہے۔ بوجھو تو جانیں۔" ادھر سے مزا لیا گیا۔
"کس کی جرأت ہے۔ جو میرے نمبر پر کال کرے۔" وہ چیخی۔
"آرام سے آرام سے اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ میں آصف بول رہا ہوں۔ میری نیندیں حرام کے خود سوگئی تھیں۔" وہ ناراض ہوا۔
"آپ نے شاید غلطی سے کوئی رانگ نمبر ملا لیا ہے۔ اپنی بیوی کو بتائیں اپنی بے تابیاں۔ مجھ سے آپ کا کیا لینا دینا۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔
"نور۔ کیا میں اتنا برا ہوں کہ تم سے چند باتیں بھی نہیں کرسکتا تم مجھے اچھی لگیں اور بے پناہ اچھی لگیں۔ کیا تم یقین کروگی کہ سارا دن مجھے سوائے تمہارے کسی کا ہوش تھا نہ خیال، کیا یہ میرا قصور ہے۔ کیا چاہت پر کسی کا ختیار ہوتا ہے۔ کیا پیار سوچ سمجھ کے کیا جاتا ہے۔ میں کیا کروں نور! تم نے اس دل کو بے اختیاری بخش دی ہے۔ میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔"
"نور العین! میں تمہارے پیار میں سر سے پاؤں تک سلگ رہا ہوں۔ بس چند لمحوں کے لیے باہر بالکونی میں آجاؤ۔ میں لان میں کھڑا ایک نظر تمہیں دیکھ لوں گا اور بس اس میں تمہارا کیا جائے گا۔"
"گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ آرام سے کمرے میں جائیے اور آرام کیجئے۔ خواہ مخواہ کہانیاں بنوانے کا کیا فائدہ۔" اس نے موبائل بند کیا۔ اسے سرہانے رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اگلے دن ولیمہ تھا۔ وہ بھائی، بھابھی کے ساتھ تصویریں بنوانے اسٹیج پر آئی تو جانے کہاں سے وہ بھی سٹیج کے سامنے آ گیا اور بظاہر بھائی بھابھی کی تصویریں لیتا ہوا اس کی کتنی ہی تصویریں لے گیا۔

"اور اس شام وہ سب واپس جا رہے تھے۔ اب ہم لوگ یہاں اکثر آتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم یہاں اپنی امانت چھوڑ کے جا رہے ہیں۔" اس نے سکندر بھائی کے ہاتھ پکڑے۔

"جم جم آؤ بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے۔" اماں جی بولیں۔

"چاچی! آپ لوگ کب آئیں گے ہمارے گاؤں۔" وہ اماں جی سے پوچھ رہا تھا اور دیکھ نور العین کو رہا تھا۔

"بس چند دنوں تک چکر لگاتے ہیں۔" اماں جی بولیں۔

"سب لوگ آئیں گے نا۔" وہ اسے دیکھ کے دلکشی سے مسکرایا۔

"دیکھو، کون کون آتا ہے۔" بھائی سکندر بولے۔

"میں، ابا جی اور اماں جی تو ضرور آئیں گے اور کا کہہ نہیں سکتے۔"

تب ہی سعدیہ اس کے گلے آ لگی۔ "نور! تم بھی آنا۔" اس نے اسے دعوت دی۔

"دیکھیں جیسے اماں جی چاہیں گی۔" اس نے آصف کی نظروں سے بچتے ہوئے کہا۔

وہ سب اپنی جیپ میں بیٹھ گئے مگر وہ راجکمار جو سفید گھوڑے پر آیا تھا۔ وہ بوسکی رنگ کے سوٹ پر کالی واسکٹ پہنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، ان سب پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ چند لمحوں تک گھوڑے کے سموں سے اڑتی ہوئی گرد اور اس کی ٹاپ کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گھوڑا اپنے سوار کو لے کر جا چکا تھا۔

اب پیچھے مہمانوں سے بھری ہوئی حویلی میں نور العین تہی دل اور تہی دامن کھڑی تھی۔ کس سراب کی چاہ میں اس نے ہاتھوں میں انگارے بھر لیے تھے۔

وہ دن کافی لمبا ہو گیا تھا۔ زندگی بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی ہو گئی تھی جانے سارا دن وہ کن خیالوں میں کھوئی رہی۔ وہ بار بار سورج کی طرف دیکھتی۔ کب غروب ہو، رات آئے وہ اپنے کمرے میں جائے اور پھر وہ اس کی آواز سنے۔ وہ جو خواب تھا یا خیال تھا۔ وہ جو سفید گھوڑے پر کسی دوسرے دیس سے آیا تھا اور اس کو اس سے ہی چرا کر لے گیا تھا۔

اس دن اور آنے والے بہت سے دنوں میں گھر والوں اور مہمانوں نے ہر کام میں اس کی عدم دلچسپی، اس کی بے خواب آنکھوں کے گرد بڑھتے حلقے اور اس کی ہر وقت کھوئی کھوئی سی کیفیت نوٹ کی تھی۔ وہ کچھ بھی کر رہی ہوتی۔ دھیان کسی اور طرف ہوتا۔ وہ کھانا کھاتے ہی کمرے کی طرف دوڑ لگا دیتی۔ اور وہ بھی شاید گھڑیاں گن رہا ہوتا۔ اس کے آن لائن ہوتے ہی وہ شروع ہو جاتا۔

"کیا کر رہے تھے۔" وہ پوچھتی۔

"کیا تمہیں نہیں پتا۔" وہ ہنس کے پوچھتا۔

"مجھے کیا پتا، میں اپنے گھر، آپ اپنے گھر۔" وہ بے رخی سے کہتی۔

"میں اپنے گھر کہاں، میں تو تمہارے گھر ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے اردگرد ہی دیکھو۔ تمہارے آس پاس ہی ہوں۔"

"مجھے تو کہیں نظر نہیں آ رہے۔" وہ ہنستی۔

"اپنے دل میں جھانکو۔ کیا وہاں بھی نہیں۔" وہ کہتا۔

"پہلے آپ بتائیں، آپ کے دل میں کون ہے۔" وہ پوچھتی۔

"نور، نور اور نور میرے دل میں ہی نہیں۔ میرے چاروں طرف نور ہی نور ہے۔"

"اور سعدیہ!" وہ جیسے کڑوا بادام چباتی۔

"وہ میرے گھر میں ہے اور کہیں نہیں۔" وہ تسلی کرواتا۔

"یہ جو آپ ساری رات فون پر لگے رہتے ہیں۔ وہ پوچھتی نہیں کہ یہ آپ ہر وقت کس سے باتیں کرتے ہیں۔"

''اچھا۔اماں جی اور ابا جی چند دنوں میں آپ کے گاؤں آ رہے ہیں۔شگن کے لیے۔'' اس نے آصف کو بتایا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا نور کہ دونوں بہنوں کا شگن اکٹھا ہو جائے اور اکٹھی ڈولیاں آئیں۔'' وہ بڑی حسرت سے کہتا۔

''بھئی۔تنویر بھائی تو کنوارے ہیں۔ان کی ڈولی آنی تو بنتی ہے۔دوسری ڈولی کس کی۔'' وہ اسے چڑاتی۔

''کیا شادی شدہ ہونا اتنا بڑا جرم ہے۔کہ اس کے بعد انسان کے دل میں محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔جبکہ پہلی شادی بھی مارے باندھے کی ہو۔'' وہ آہیں بھرتا۔

اور جس رات اماں جی۔ابا جی اور سکندر بھائی آصف کے گاؤں جانے والے تھے۔اس نے اس کو اتنا زچ کیا۔کہ وہ بھی ان کے ساتھ آئے اور وہ جو سارا دن اسی کے سپنے دیکھتی تھی۔وہ بھی دل سے چاہتی تھی کہ وہ جائے اور ایک دفعہ پھر اسے دیکھے۔اس کی آواز روبرو سنے۔وہ دیکھے کہ اسے دیکھ کر اس کا کیا حال ہوتا ہے۔

وہ بھی جانے کے لیے ضد کرنے لگی کہ تنویر بھائی سے وہ خود ملنا چاہتی ہے۔

''نہیں، کنواری لڑکیاں ایسے نئے رشتے داروں کے ہاں لے جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔'' ابا جی نے کہا۔

مگر وہ اماں جی کے اتنا پیچھے پڑی کہ اماں جی کو کہتے ہی بنی۔

''کیا ہوا جو وہ جانا چاہتی ہے۔اس کا بھی تو رشتہ طے ہو گیا ہے۔لڑکیوں کو شوق ہوتا ہے۔بہنوں کا گھر دیکھنے کا اور اس کی تو ایک ہی بہن ہے۔''

وہ چاہتے تو نہیں تھے کہ وہ کنواری بیٹی کو ساتھ لے جائیں۔مگر اماں جی کے کہنے پر خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

وہ بہاروں سے لدی ایک خوب صورت سہ پہر تھی۔جب وہ دو گاڑیوں پر لدے پھندے طلعت کی ہونے والی سسرال پہنچے۔

وہ خوب صورت کالے کڑھائی والے سوٹ میں دمک رہی تھی۔ان کی گاڑی آصف کے گھر سے کچھ فاصلے پر رکی۔تو ان سے آگے ایک جیپ آ کر رکی۔

جیپ میں سے نکلنے والے دو لوگ تھے۔ان میں ایک کو دیکھ کے ایک دفعہ تو آنکھوں کے چراغ جل اٹھے۔مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ساتھ ساتھ پورے استحقاق سے چلتے دوسرے فرد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔نہ صرف آنکھیں بجھیں بلکہ اس کے چہرے پر تاریکی سی چھا گئی۔وہ جو بہت پر جوش تھی۔جس نے تیار ہونے میں اتنا وقت لگایا تھا۔اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ کس سراب کے پیچھے صحرا میں بھاگتی جا رہی ہے۔

سعدیہ اماں جی سے گلے مل رہی تھی۔آصف، سکندر بھائی اور ابا جی سے ملتے ہوئے پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔مگر وہ دھواں دھواں چہرہ لیے ان کے گھر جانے کو بالکل تیار نہیں تھی۔

''کاش وہ نہ آئی ہوتی۔'' اس نے کڑھ کے سوچا کم از کم بھرم تو رہ جاتا۔

وہ اماں جی کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی ان کے گھر پہنچی۔مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکرے پیچھے نوکر اٹھائے اندر آ رہے تھے۔گھر کے دروازے پر آصف سے چھوٹے تنویر نے ان کا استقبال کیا۔وہ بھی اچھی شکل کا مالک تھا۔مگر آصف والی بات کہاں۔

گھر کے اندر آصف کی اماں جی اس کی بہن بشریٰ اور نوکرانیوں کی فوج نے ان کا استقبال کیا۔گھر میں خاص مہمان آنے کی وجہ سے مخصوص ہلچل شروع ہو گئی۔

آپس میں بولتی ہوئی عورتیں کچن سے صحن اور صحن سے کچن کے چکر لگا رہی تھیں۔

جلد ہی ان کے لیے چائے لگا دی گئی۔وہ اور اس کی اماں جی نے گھر کی عورتوں کے ساتھ مل کر چائے پی اور مردوں نے مردان خانے میں۔گھر میں کچھ دیر کے بعد تنویر کسی کام سے آیا۔تو سعدیہ نے اسے آواز دے کر پاس بلا لیا۔

وہ اس کی اماں جی کے پاس بیٹھ کے ان سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اسے اس سے کچھ بھی غرض نہیں تھی۔ اس کی نظریں چاروں طرف جس کو ڈھونڈ رہی تھیں، وہ وہاں نہیں تھا اور ابھی ابھی جانے کہاں سے وہ اپنی بیوی کے ساتھ لوٹا تھا۔ وہ سوچ سوچ کے جل رہی تھی۔

''آپ لوگ کہاں گئے ہوئے تھے؟'' اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے سعدیہ سے پوچھا۔

''بس یوں ہی ذرا شہر تک گئے تھے۔ آصف کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ذرا گھومنے جائیں۔'' وہ بلاوجہ ہی ہنسی اس کا دل چاہا، وہ اس سے پوچھے کہ کیا وہ اسے بہت چاہتا ہے۔

مگر اسے لگا۔ اس سوال کا جواب آنے سے پہلے وہ خود جل کے خاک ہو جائے گی۔

''آؤ، میں تمہیں گھر دکھاؤں۔'' وہ اسے لیے ہوئے باہر آ گئی۔

''یہ اماں جی کا کمرہ ہے اور بشریٰ بھی زیادہ تر یہیں رہتی ہے وہ لاؤنج ہے اور لاؤنج کے دوسری طرف بشریٰ کا کمرہ ہے اور وہ باہر والا کمرہ مہمان خواتین کا ہے اور گھر کے اوپر بنے ہوئے دو دو کمرے اور ایک ایک بیٹھک ہماری اور تنویر کی ہے۔''

وہ اسے اپنا کمرہ دکھانے لے آئی۔ سامنے ہی دولہا دلہن بنے سعدیہ اور آصف کی تصویر اس کا دل جلانے کے لیے کافی تھی۔ کمرہ بہت اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔

جانے کیا نکالنے کے لیے سعدیہ نے الماری کھولی۔ تو دونوں کے کپڑے اندر ہینگروں پر لٹکے نظر آ رہے تھے۔

گویا دو لوگ بہت سے لوگوں کے سامنے اور ان کی رضا اور خوشی سے ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن چکے تھے۔ اس میں کسی تیسرے کی گنجائش کہاں نکلتی تھی۔

وہ گھبرا کے ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ مگر دروازے کے باہر کھڑے آصف کو دیکھ کے وہ اتنا ٹپٹائی۔ کہ پھر واپس کمرے میں آ گئی۔

سعدیہ اپنے دھیان میں میز کی دراز سے کچھ نکال رہی تھی۔

''آخاہ! بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔'' آصف مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

''بھئی، ان کی کوئی خاطر داری کرو۔ دیکھو تو کمرے میں کون آیا ہے۔'' وہ سعدیہ سے مخاطب تھا۔ مگر دیکھ اسے رہا تھا۔ جو بہت بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیسے ان دونوں کو غائب کر کے یہاں سے بھاگ نکلے۔

''بھئی، کوئی منہ ہی میٹھا کرائیں۔ کچھ تو خاطر کریں۔'' وہ پھر بولا۔

''آ جائیں نیچے، کھانے میں تھوڑی دیر ہے۔ میں پھل کاٹ کے لاتی ہوں۔''

وہ دراز بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے آئی۔ تب وہ ایک دم لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جیسے کمرے میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہو۔

رات اماں جی بستر پر لیٹتے ہی سو گئیں۔ مگر اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ اوپر کمرے میں موجود تھا اور اس کے ساتھ وہ نہیں بلکہ دوسری عورت تھی وہ اس سے کیا کہتا ہوگا۔ کس طرح کی باتیں کرتا ہوگا۔

کیا وہی سب کچھ جو وہ اس سے کہتا ہے۔ وہ سب کچھ وہ پہلے اپنی بیوی سے بھی کہہ چکا ہوگا۔

اس کے بستر پر انگارے جل اٹھے تھے اور وہ اب اسے بھی بری طرح جلا رہے تھے۔ وہ شاید عقل کو تھام ہی لیتی کہ تب ہی اس کا فون بج اٹھا۔ اور اس سے پہلے کہ اماں جی جاگ جاتیں۔ اس نے فون سائلنٹ پر کر دیا۔

تب ہی اس کا میسج آ گیا۔

''کیا ہوا، ناراض ہو۔ مگر کس بات پر؟ کوئی گستاخی ہوئی ہے۔''

وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔

''نور! اگر اب بھی جواب نہ دیا۔ تو میں کمرے کے باہر آ کر بیٹھ جاؤں گا اور تب تک نہیں ہلوں گا۔

جب تک تم باہر آ کر مجھے ناراضی کی وجہ نہ بتاؤ، وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔

''نور! میں دس تک گنوں گا۔'' اس نے دھمکی دی۔

''گنتے رہیں، مجھے کیا۔'' اس نے لکھا۔

''غصہ کس بات پر ہے اور لاتعلقی کیسی۔'' پوچھا گیا۔

''مجھے کوئی غصہ نہیں اور آپ کے ساتھ تعلق بھی کوئی نہیں۔ جب کوئی تعلق نہیں تو لاتعلقی کیسی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کل تک تو سارے تعلق مجھ سے ہی تھے۔ آج یہ اتنا بڑا انقلاب کیوں؟'' ادھر سے پوچھا گیا۔

''بس رات گئی بات گئی۔ کل کی بات کل کے ساتھ تھی۔'' اس نے لکھا۔

''یہ کل اور آج میں ایسی کیا نئی بات ہو گئی کہ سارے تعلق ہی ختم کر دیے۔'' پھر سوال کیا گیا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں فون بند کرنے لگی ہوں۔'' اس نے اکتا کے لکھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج تو تمہیں میرے ساتھ جاگنا پڑے گا۔'' اس نے ضدی لہجہ اختیار کیا۔

''آپ کی شادی کی تصویر بہت خوب صورت ہے۔ سعدیہ بھابھی کے ساتھ۔'' اس نے سعدیہ بھابھی چبا کے کہا۔

''ہیں! وہ تمہاری بھابھی کب سے ہو گئی بھئی۔'' اس نے اسے ایک سمائلی بھیجی۔

''اچھا تو اس وجہ سے اپ سیٹ ہو۔ بھئی، وہ تم سے پہلے تھی۔ تمہارے بعد اگر یہ نظر کہیں بھٹکے تو میں مجرم۔ جو دل چاہے سزا دینا۔ مگر پہلے گناہوں کی تو توبہ قبول کرو۔'' وہ یقیناً دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔

''میں آپ کو کسی کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔'' اس نے گویا سسکی لی۔

''بانٹنا تم نے کہاں ہے بانٹے گی تو وہ بے چاری جو پہلے یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔''

''نہیں، میں ایسے نہیں رہ سکتی۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اور میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چھوڑ دو۔ مجھے مرنے کے لیے چلو ٹھیک ہے۔ مر جانے دو مجھے۔ تم صرف اپنے بارے میں سوچو، میری یا میرے دل کی تمہیں کیا پروا ہے۔ توڑ دو میرا دل اور مجھے بھی۔'' وہ گویا کربلا رہا تھا۔

''میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''تم کچھ نہ کرو۔ بس انتظار کرو۔ میں خود گھر میں تمہارے بارے میں بات کروں گا اور پھر ہم اپنی علیحدہ دنیا سجائیں گے۔ جہاں نور ہو گی اور میں ہوں گا۔''

''اور سعدیہ؟'' اس نے اسے درمیان سے ٹوکا۔

''سعدیہ کو بھی دیکھ لیں گے۔ پڑی رہے گی کسی کونے میں۔ تمہارا کیا جاتا ہے اس سے۔'' اس نے اس کی تسلی کروائی۔

اگلے دن واپسی پر وہ کافی دور تک انہیں چھوڑنے اپنے گھوڑے پر ساتھ ساتھ آیا۔

سکندر بھائی آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھاتے رہے۔ اور وہ اپنے گھوڑے پر ساتھ ساتھ بھاگتا رہا اور پھر جلد آنے کا وعدہ کر کے وہ پیچھے رہ گیا۔ اپنے گھر لوٹ گیا اور وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔

راستے میں اماں جی، آپا جی اور بھائی سکندر ان کی تعریفیں کرتے رہے اور وہ چپ چاپ کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے منظر پر نظر ٹکائے باہر گھورتی رہی۔

☆☆☆

وہ گھر واپس آ چکی تھی۔ اور اس کی راتیں اسی موبائل کے آسرے پر گزر رہی تھیں۔ وہ جانے راتوں کو دور بیٹھے اس کے کانوں میں کیا سحر پھونکتا کہ وہ سارا دن سرشاری اپنے آپ میں مگن پھرتی۔

''جانتے ہیں، کل کون سا دن ہے۔'' اس نے بڑے ناز سے پوچھا۔

''کل......'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''یاد نہیں آ رہا۔ کل 16 تاریخ ہے اور ہفتہ ہے۔ مگر اس میں خاص بات کیا ہے۔ مجھے نہیں پتا، تم بتاؤ۔''

''ہار گئے نا۔'' وہ کھلکھلائی۔

''پہلے دن سے پہلے لمحے سے۔'' اس نے

اعتراف کیا۔

"جناب کل میری سالگرہ ہے۔ مگر ہمارے گھر میں مناتا کوئی نہیں۔ بس میری سہیلیاں واٹس ایپ پر پھول اور دعائیں بھیج دیتی ہیں۔"

"ہیں کل تو واقعی خاص دن ہے۔ خاص طور سے میرے لیے۔"

"کہ تمہیں زمیں پر بلایا گیا ہے میرے لیے۔" وہ گنگنایا۔

"چلو پھر کچھ خاص کرتے ہیں۔" وہ بولا۔

"مثلاً کیا۔" وہ متجسس ہوئی۔

"دیکھتے ہیں۔ کل تم فیروزی کپڑے پہننا اور کانوں میں جھمکے۔" اس نے فرمائش کی۔

"کیوں آپ ملنے آئیں گے۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آ بھی سکتا ہوں۔ بھئی، اس گھر میں میری امانت ہے۔ مجھے کوئی روک سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں۔" وہ بولی۔

اور اگلا سارا دن وہ لاشعوری طور پر اس کی منتظر رہی فیروزی کپڑوں کے ساتھ جھمکے پہن کے اس کا خیال تھا کہ سیلفی لے کر اسے بھیج دے گی۔ کہ اس کا میسج آ گیا۔

"فیروزی چوڑیاں بھی پہنو۔"

"اگر پہن بھی لیں تو سیلفی میں نظر نہیں آئیں گی۔" اس نے لکھا۔

"آ جائیں گی، بس تم پہنو اور کمرے میں ہی رہنا۔"

"کیوں آپ کیا واقعی میں آنے والے ہیں۔" وہ خوف زدہ ہوئی۔

"آنے والا نہیں آ چکا ہوں۔ گاؤں سے تھوڑی دور سڑک کے ساتھ امرودوں کے باغ میں ہوں۔ تم کسی طرح سے باہر نکلو۔ میں تمہیں پک کرنے کے لیے آس پاس ہی ہوں گا۔"

اور یوں چور دروازے اور چور راستے ہمیشہ تباہیوں کو دعوت دیتے ہیں۔ مگر جوانی چونکہ اندھی ہوتی ہے اس لیے عشق و محبت کے نام پر وہ جس راستے پر چاہے ڈال دے۔ اس رات اس کے لیے بھی چور دروازہ کھل گیا۔

رات گیارہ بجے اچانک بجلی چلی گئی۔ گاؤں میں ویسے بھی لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔

وہ چپکے سے کالی چادر اوڑھ کے باہر نکلی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی کبھی سناٹے کو توڑ دیتیں۔ وہ سہج سہج قدم اٹھاتی گلی کے نکڑ تک آئی۔ تو ایک ہیولے کو اس نے اپنی طرف بڑھتے دیکھا آؤ۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس نے چند لمحوں کی جھجک کے بعد اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا گاؤں سے کچھ دور اس کی جیپ کھڑی تھی۔ وہ اسے لیے ہوئے جیپ میں بیٹھ گیا۔

جیپ میں کیک، موم بتیاں اور اس کا گفٹ پڑے تھے۔ ان دونوں نے جیپ میں بیٹھ کے کیک کاٹا، کھایا۔ وہ اور بھی بہت کچھ لایا تھا۔ مگر وہ اس سے شرما رہی تھی۔ اس سے کچھ کھایا ہی نہیں جا رہا تھا اور وہ خوف زدہ بھی تھی۔ وہ ہر دوسرے منٹ اس سے واپسی کا کہہ رہی تھی۔ اور پھر جب رات آدھی سے زیادہ ڈھل گئی تو وہ اسے اسی خاموشی سے چھوڑ آیا۔

گاؤں کی گلیاں ویران تھیں۔ فجر کی اذان ہونے میں دیر تھی۔ اس لیے چند آوارہ کتوں اور چند گھروں کی ٹمٹماتی روشنیوں کے سوا اسے کسی نے نہ دیکھا۔ وہ اس سے وہ تحفہ لینا تو نہیں چاہتی تھی۔ کہ جانے اس میں کیا تھا اور وہ اسے کہاں چھپاتی۔

مگر رخصت کے وقت اس نے اسے وہ بھی زبردستی پکڑا دیا "خدا حافظ!" وہ جو اسے بہت احتیاط سے گھر تک لایا تھا۔ گھر کے باہر ہی سے لوٹ گیا۔ وہ دروازہ کھول کے بلی کی چال چلتی کچن میں گھس گئی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے کئی گلاس پانی کے پی گئی۔

جوتے ہاتھ میں پکڑے اور دوسرے میں گفٹ پیک پکڑے وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے چادر اتار کے پلنگ پر رکھی۔ واش روم میں جا کر پاؤں دھوئے۔ اور پھر شیشے میں اپنی شکل دیکھی۔

وہ جیسی اس کے ساتھ گئی تھی۔ ویسی واپس نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے اسے بار بار چھوا تھا۔ اس کی نظروں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا تھا اور اس کی باتوں نے اسے آسمانوں پر پہنچا دیا تھا۔

وہ اسے کیسے پھولوں کی طرح تھام کے لے گیا تھا۔ کیسے جیپ میں بٹھایا تھا اور پھر اس کی بے قراری کی داستانیں...... اس کی آنکھوں میں کاجل پھیل چکا تھا۔ بالوں کی لٹیں کلپ سے نکل کر اس کے چہرے کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ کئی دفعہ اس کے ہاتھ ہٹاتے ہٹاتے اس کی چوڑیاں ٹوٹیں۔ مگر وہ ابھی بھی اسی نشے میں تھی۔ مدہوش اور مستی میں چور۔ وہ سارا وقت اسی کو سوچتی رہتی۔ ہر کام کرتے وقت اسے لگتا۔ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

جنوری کی یخ بستہ رات تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ جب اس نے اسے میسج کیا کہ وہ حویلی کی پچھلی طرف ہے۔ حویلی کی پچھلی طرف مالٹوں کا باغ تھا۔ اور باغ کے بعد نہر اور نہر کی دوسری طرف بانسوں کے جھنڈ کے پاس ان کا امرودوں کا باغ تھا۔

اس نے اپنے آپ کو کمبل میں چھپایا۔ چپل پہنی اور کچن میں آگئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ اس نے اچھی طرح سے بند کر دیا تھا۔ وہ کچن کا دروازہ کھول کے باہر آئی۔ تو باہر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے احتیاط سے باہر جھانکا۔ اور پھر چھوٹے گیٹ کا دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

وہ اس کے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ وہ اسے لیے ہوئے اپنی جیپ تک آیا۔ جو بانسوں کے جھنڈ میں کھڑی تھی۔ وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے۔ کبھی کبھی وہ لائٹر جلا کر اسے دیکھ لیتا۔ وہ جیپ میں بیٹھے مستقبل کے پلان بناتے رہے۔

"آصف! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" نور نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"اور میں بھی نہیں۔" اس نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رگڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر دیر کس چیز کی ہے۔ اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں بھیج رہے۔" وہ ٹھنکی۔

"وہ تو کل ہی آجائیں۔ مگر تمہارے گھر والے کیسے راضی ہوں گے۔" وہ بولا۔

"انہیں بھیجیں تو سہی۔ گھر والوں کو میں منالوں گی۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"پکی بات۔"

"ہاں پکی۔"

"چلو پھر اس ہفتے ہی بھیجتا ہوں۔ میں تو صرف تنویر اور طلعت کی شادی تک رکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا۔ ایک دفعہ یہ شادی ہو جائے۔ تو ہمارے لیے راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر اگر تمہیں جلدی ہے تو یونہی سہی۔" وہ مذاق میں اس کی طرف جھکا۔

"کیا آپ کو جلدی نہیں ہے؟" اس نے اسے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل بھی نہیں۔" وہ ہنسا۔ "جو مزا ایسے ہے۔ وہ شادی کر کے گھر لے جانے میں کہاں۔"

"نہیں، ایسے کسی دن پکڑے جائیں گے۔" وہ کانپ گئی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" اس نے اسے دلاسا سا دیا۔ اور اس کے بار بار کہنے پر اسے حویلی کی پچھلی دیوار کے پاس چھوڑ گیا۔

☆☆☆

چند دن بعد جب اماں جی نے گاؤں کی عورتوں کو گندم صاف کرنے کے لیے بلوایا۔ تو حنیف قصائی کی بیوی خاصی دیر سے آئی۔

اماں جی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ حنیف شہر گیا ہوا تھا بکرے خریدنے۔ اس رات وہ شہر سے پیدل ہی مویشیوں کے ساتھ گاؤں آیا۔ مگر بانسوں کے جھنڈ میں اس نے کوئی نوری مخلوق دیکھی۔ جہاں کبھی روشنی ہو رہی تھی۔ اور کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ جب روشنی ہوتی۔ تو وہاں ایک بڑی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ جس کے اندر سے ہنسنے بولنے کی آوازیں

آتیں۔ ایسے لگتا جیسے ایک مرد اور ایک عورت باتیں کر رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔

بی بی وہ تو اتنا ڈرا کہ بکروں کی پرواہ کیے بغیر گھر بھاگ آیا۔ تب سے ایسا تاپ چڑھا ہے کہ سدھ بدھ ہی نہیں۔

''ہاں تے ہور کی۔'' بیدی نائن بولی۔ ''وہ تو میرے ابے نے بھی دیکھا ہے۔ مولی صاب کی بیوی بتا رہی تھی کہ وہ تہجد کے لیے اٹھے۔ تو انہوں نے حویلی کے پچھلی طرف ایک عورت اور ایک مرد کو آدھی رات کے وقت ہاتھوں میں ہاتھ دیے نہر کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ بی بی جی! بانسوں کے جھنڈ میں تو اب لوگ دن کو نہیں جاتے۔ وہاں کچھ ضرور ہے۔''

گاؤں کی عورتیں بڑھ چڑھ کے بول رہی تھیں۔ اور وہ جو حویلی کے صحن میں کرسی ڈالے کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ یہ سب سنتے ہی ساکت ہو گئی۔ جیسے مٹی کا بت۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے وہ سب سن رہی تھی۔ اپنے اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ۔

''بی بی جی! باجی ہوراں نوں تے ویکھو، پیلے زرد ہو گئے ہیں ڈر دے مارے۔''

اماں جی نے اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ ہوش میں آئی۔ اور رسالہ منہ پر رکھ کر اندر آ گئی۔

''اتنے لوگوں نے ہمیں دیکھا ہے۔ اگر جو پکڑے گئے تو پھر......''

اور پھر اس دن وہ اپنے لمبے خوب صورت بالوں میں تیل لگائے طلعت کے ساتھ بیٹھی مالٹے کھا رہی تھی۔ جب بغیر اطلاع دیے آصف، سعدیہ اور آصف کی امی ان کے گھر آ پہنچے۔

وہ شادی کی تاریخ طے کرنے آئے تھے۔

طلعت انہیں دیکھ کے بیک وقت خوش اور شرما رہی تھی۔ وہیں وہ آصف کو سامنے دیکھ کے پتھر کا بت بن گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا مالٹا نیچے گر چکا تھا۔ اور وہ چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ طلعت سے مل کے دونوں خواتین بوکھلائی ہوئی نور کی طرف مڑیں۔

''ارے بھئی، آپ کے ہاں سلام دعا کا رواج نہیں۔ یا آپ نے دن میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔ جو اس طرح ساکت بیٹھی ہیں۔'' آصف اسے چھیڑ رہا تھا۔

تب بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹ کے وہ کھڑا ہونے کے قابل ہوئی۔

طلعت دونوں مہمان خواتین کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ اور وہ مالٹوں کی ٹرے اور پلیٹیں اٹھائے ادھر ہی کھڑی تھی۔

''اس طرح اچانک، اگر میرا دل بند ہو جاتا تو۔'' اس نے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بند ہوتا۔ اسے میں نے حفاظت سے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔'' وہ بولا۔

''آپ کو بتا کے آنا چاہیے تھا۔'' وہ بظاہر مالٹے ٹرے میں ڈال رہی تھی۔ جو بار بار نیچے گر رہے تھے۔ اور آصف اپنا سامان نکلوا رہا تھا۔ اور بظاہر اس کا سارا دھیان اپنی جیب کی طرف تھا۔

''اگر بتا کے آتا تو جو چہرے پر اتنے رنگ آ اور جا رہے تھے، وہ کیسے دیکھتا۔''

''لاؤ باجی! میں اندر لے جاؤں۔'' کام والا لڑکا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ٹرے اسے پکڑائی۔ اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے نہا کے اپنا شاندار سوٹ پہنا۔ دونوں، بازوؤں میں بھر بھر چوڑیاں پہنیں اور اپنے لمبے سیدھے بالوں کو کھلا چھوڑ کے اماں جی کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں باقی لوگ بھی جمع تھے۔

''بس اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' آصف کی امی کہہ رہی تھیں۔ ''آصف کی شادی کو تیسرا سال لگا ہے۔ اب جا کے اللہ نے کرم کیا ہے۔ ورنہ پہلے تو یہ دونوں بچے بنے ہوئے تھے۔ ادھر گھومنے جا رہے ہیں۔ ادھر گھومنے جا رہے ہیں۔ دونوں کہتے تھے۔ ابھی بچے نہیں چاہئیں۔ آصف کی امی کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

''چاچی جی!'' سعدیہ اماں جی کی طرف دیکھ

کے بولی۔ ''میری ساس جیسی ساس بھی کوئی نہیں ہوسکتی۔ آصف کی شروع سے عادت ہے۔ ساری رات موبائل پر دوستوں یاروں کو میسج بھیجتے رہتے ہیں۔ یا ساری رات وہ کیا کہتے ہیں، گیم کھیلتے رہتے ہیں۔ مگر سارا دن سوتے ہیں۔ اور مجھے بھی باہر نہیں جانے دیتے۔ آج تک خالہ جی نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اللہ کا شکر ہے گھر نوکروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم کچھ کریں نہ کریں، کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

اور وہ حق دق یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔

''سعدیہ! ان دنوں کچھ خاص کھانے کو تو دل نہیں کرتا، میں وہ بنا دوں۔''

اماں جی سعدیہ سے پوچھ رہی تھیں۔ بغیر یہ دیکھے اور بغیر یہ جانے کہ ان کی اپنی لاڈوں پلی بیٹی کا دل کیسے جل کے خاک ہو رہا ہے اور اس کے اندر باہر یہ کیسے بھانبھڑ جل رہے ہیں۔ اس نے سعدیہ کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھا۔ اور اپنے اوپر نظر ڈالی۔ یہ اس نے کس خوشی میں اتنی تیاری کی ہے۔ کس کو دکھانے کے لیے جو اس سے جانے یہ کیسا کھیل کھیل رہا ہے۔

اس نے کمرے میں آکر چوڑیاں توڑ دیں۔ کانوں کے ٹاپس نوچ کے اتارے۔ اور تکیہ منہ پر رکھ کر اپنی چیخوں کا گلا گھونٹنے لگی۔

دوپہر کے کھانے پر اس کی اجڑی صورت دیکھ کر سب سے پہلے اماں جی بولیں۔

''لو اس کو دیکھو۔ کمی نہ ہو تو۔ طلعت کی شادی کی تاریخ ابھی رکھی نہیں اور اس نے رو رو کے پہلے آنکھیں سجالی ہیں۔''

''چاچی جی! نور کا رشتہ کہاں طے کیا ہے۔'' سعدیہ نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا۔

''اس کی پھوپھی پیچھے لگی ہوئی ہے۔ دیکھیں، کہاں نصیب ہوتا ہے۔'' اماں جی بولیں۔

''ہائے چاچی جی! نور کی بات اگر پکی نہیں ہوئی تو میری امی جی کو نور بغیر دیکھے ہی اتنی پسند ہے مجھ سے نور کی تعریفیں سن سن کے کہ وہ آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں میرے بھائی کے لیے اگر آپ کی اجازت ہو تو۔''

تب اس کا دل چاہا کہ وہ سالن کا ڈونگہ سعدیہ کے سر پر ڈال دے۔ ''آئی بڑی میرے رشتے کروانے والی'' وہ بغیر کھائے ہی کمرے میں واپس آگئی۔

اور پھر ان کے جانے تک باہر نکلی ہی نہیں۔ فون اس نے آف کر کے تکیے میں گھسا دیا تھا۔

☆☆☆

تب اس نے دل کو پکا کیا کہ نہیں اب نہیں جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب مزید مجھے اس کی تفریح کا سبب نہیں بننا مگر جب چند دن اسی خاموشی میں گزر گئے اور آصف نے بھی گھر جا کے اسے پلٹ کے نہ پوچھا۔ تو اس کا دل آصف کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گھڑنے لگا۔

اگر اس سارے کھیل میں وہ قصوروار تھا تو وہ اس سے بڑھ کر قصوروار تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اس کی طرف آئی تھی، اس نے اس سے کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اس کے پچھلے میسجز نکال نکال کے پڑھتی۔ اس کے دیے ہوئے تحفے جوتوں والی الماری کے پچھلے حصے سے اور اپنی میٹرس کے نیچے سے نکال کے دیکھتی رہتی۔ مگر ایسے وقت میں وہ دروازہ بند کرنا نہ بھولتی۔

☆☆☆

گھر میں طلعت کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ چاول کی فصل تیار کھڑی تھی۔ ابا جی نے یہی کہا تھا کہ چاول کی فصل اٹھاتے ہی شادی کر دیں گے۔ اماں جی کے حساب سے ڈیڑھ سے دو ماہ باقی تھے۔

ساون بیتے مدت ہو گئی تھی۔ مگر ابھی بھی کالی گھٹائیں سرِ شام پورب سے پچھم تک چھا جاتیں اور ساری رات برستی رہتیں۔ ایسے میں بجلی چلی جاتی۔ اور وہ گھپ اندھیرے میں اندر کی گھٹن کم کرنے کی خاطر بالکنی میں بیٹھ جاتی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتی۔

"یہ آصف کو ہوا کیا ہے۔ اس نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا۔"

اس دن بھی وہ موبائل لیے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی سہیلیوں کے دھڑا دھڑ میسج آ رہے تھے۔ اور وہ جس کے میسج کے لیے ترس رہی تھی۔ وہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔

تب ہی اچانک اتنے دنوں کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا نام جگمگانے لگا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس کا پیغام وصول کیا۔

ایسی بھی کیا ناراضی کہ سلام تک نہ پہنچے۔

آج رات کو آؤں گا۔ تیار رہنا۔

وہ جس نے اپنے دل کو ڈانٹ ڈپٹ کے دماغ کے تابع کرنے کی ہزار کوششیں کی تھیں۔ ساری ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔

اس کے دماغ نے اسے ڈانٹا۔ "خبردار جو گئیں تو گھر میں بیٹھو۔ اس کی بیوی اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کے گھر والے اس بات سے بے پناہ خوش ہیں۔ وہ محض تم سے دل لگی کر رہا ہے۔ شادی کا سوال ہی نہیں۔"

مگر دل اپنی تاویلیں لے کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی شادی پہلے ہو چکی تھی۔ بعد میں تو اس نے نہیں کی، لوگ ایک سے زیادہ بھی شادیاں کر لیتے ہیں۔

"اچھا چلو، اتنے دنوں بعد اس کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔" رات کو وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلی۔ اس نے اماں جی، طلعت اور ابا جی کے دودھ میں نیند کی گولیاں ملا دی تھیں۔ بھائی سکندر اور بھابھی..... بھابھی کے میکے گئے ہوئے تھے۔ مگر باقی گاؤں میں سے کون کون جاگ رہا تھا۔ کون جانے۔

وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ نورا اتنے دن سے مجھے کس سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ کوئی پیغام نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے تو اس لیے احتیاط کی کہ گھر میں نہ پتا چل گیا ہو۔ شکر ہے تمہیں دیکھا تو۔ وہ اسے ساتھ لیے نہر کے پار چلا گیا۔

بانسوں کے جھنڈ میں اس کی گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ "آج کل زمین گیلی ہے۔ اس لیے جیپ لے کر نہیں آیا۔ کہ اس کے ٹائروں کے نشان نظر آ جاتے ہیں۔ مم وہ بولا۔ اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جو تب سے بالکل خاموش تھی۔

"کیا ہوا، کچھ تو بولو۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا آصف! بس میں اب اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم کچھ کرو، نہیں تو میں زہر کھا لوں گی۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"میں نے بس تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے۔ مجھے اب تم سے دور نہیں رہنا۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" اس نے اسے تھپکتے ہوئے کہا، مجھے چند دن دو۔ میں سارا انتظام کر کے آ کے تمہیں لے جاؤں گا۔"

"صرف چند دن اور......"

اور اس دن وہ باغ میں بیٹھے آنے والے دنوں کے بارے میں سوچتے رہے۔

"تم بس اپنی ضروری چیزیں رکھنا۔ بس مختصر سامان۔"

☆☆☆

اور پھر وہ بادلوں سے ڈھکی ایک خوف ناک رات تھی۔ شام سے بادلوں میں ایسی گرج تھی۔ جیسے کسی کو ڈانٹ رہے ہوں۔

اس نے اپنا سوٹ کیس تیار کر کے پلنگ کے نیچے رکھ لیا۔ رات اماں جی اور ابا جی کو دودھ دیتے ہوئے اس نے انہیں جی بھر کے دیکھا۔

"جانے پھر کب ملنا ہو۔" اللہ کے حوالے اس نے دل میں کہا۔

وہ رات کافی دیر تک طلعت کے کمرے میں بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی۔

بھائی سکندر کے کمرے کی بتی بجھی۔ تو وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے دیکھا، باہر بارش رک چکی تھی۔ وہ بالکنی میں کھڑی آصف کے اشارے

کا انتظار کرنے لگی۔ اور پھر دور ایک ٹارچ سی ٹمٹمائی۔
اس نے جلدی سے اٹیچی گھسیٹی، کالی چادر لی اور پاؤں میں بند جوتے پہنے اور کچن کے راستے حویلی کے پچھلی طرف بنے چھوٹے سے گیٹ کی طرف چل پڑی۔
اچانک کوئی چیز دیوار سے اس پر کودی، اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ڈر کے گیٹ کے ساتھ لگے مالٹے کے پودے سے چمٹ گئی۔
ایک موٹی سی بلی میاؤں میاؤں کرتی اندر بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گیٹ سے پہلا پاؤں باہر نکالا اور پھر دوسرا اور وہ گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور پھر اس نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے اٹیچی لے لیا۔
''آؤ'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اور اس نے بے جھجک اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
کافی آگے جاکے اس کی گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے گھوڑی پر بٹھایا۔ اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ وہ اس کے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گھوڑی کی لگام تھی۔ اور وہ انہیں اڑائے لیے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کے اوپر جھک کر اس کے کانوں میں کوئی سرگوشی کر دیتا۔ اور وہ مسکرا دیتی۔
جانے وہ کہاں جا رہے تھے۔ اس نے یہ پوچھنے کی تکلیف ہی نہیں کی تھی۔ وہ اسے خود ہی بتانے لگا کہ وہ اسے کچھ دن اپنے دوست کے ہاں دوسرے گاؤں چھوڑے گا۔ نکاح آج ہی ہو جائے گا۔ پھر حالات نارمل ہونے پر وہ اسے اپنے گھر لے جائے گا۔
''اور کتنی دور جانا ہے؟'' وہ شاید تھک گئی تھی۔
''بس چند کوس اور۔''
اچانک سامنے پانی سے بھرا ہوا تالاب آ گیا۔
آصف جو اس سے باتوں میں محو تھا۔ اس وقت چونکا جب گھوڑی تالاب میں داخل ہو کے بیٹھ چکی تھی۔
''اوہ!'' وہ جیسے ایک دم کسی خواب سے چونکا۔
''یہ کیا ہو گیا۔''
''کیا ہوا؟'' وہ حیران ہوئی۔ اس کے کپڑے بھی تالاب کے پانی سے گیلے ہو چکے تھے۔
آصف نے مشکل سے گھوڑی کو اٹھایا۔ چند لمحے غور سے نور العین کی طرف دیکھا۔ گھوڑی کا رخ موڑا اور واپسی کے ایڑ لگا دی اس کے جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔
آدھی رات کے بعد جب وہ امرودوں کے باغ کے پاس پہنچا۔ تو اس نے ہاتھ بڑھا کے نور کو نیچے اتارا۔ گھوڑی بانس کے درختوں میں باندھی۔ اور اس کی حیران سوال کرتی آنکھوں میں دیکھ کے بولا۔
''مجھے افسوس ہے نور! اس دنیا میں ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔ اس گھوڑی نے آج مجھے عجیب سبق دیا ہے۔ یہ گھوڑی کئی نسلوں سے ہمارے پاس ہے۔ اس کی ماں بھی تالاب کو دیکھتے ہی اس کے اندر گھس کے بیٹھ جاتی تھی اور اب یہ بھی تو جو ماں کرتی ہے، وہی بیٹی بھی کرتی ہے۔ اب اگر کل کو میری اور تمہاری ایک بیٹی ہوگی۔ تو وہ بھی رات کے اندھیرے میں کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ تو نور العین! ہم لوگ دولت کے بغیر تو جی لیتے ہیں مگر عزت کے بغیر نہیں۔ آؤ گھر واپس چلو۔''
وہ حویلی کے گیٹ کے باہر سے لوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے چوروں کی طرح نکلی تھی ویسے ہی چوروں کی طرح گھر لوٹ آئی۔ مگر اس کے بعد بھی کسی نے اسے ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ سارا دن اپنے آپ کو مل مل کے دھوتی رہتی ہے، یوں جیسے کوئی ان دیکھی نجاست لگ گئی ہو۔

☆☆☆

طلعت کا رشتہ بغیر کسی وجہ کے ختم ہونا بھائی سکندر اور خضر کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ دونوں اندر اندر ہی کھولتے رہتے ہیں مگر اماں جی اور ابا جی اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کر چکے ہیں مگر وہ جوان سب کی عزت نیلام کرنے نکلی تھی، سارا وقت اپنے آپ کو ان دیکھی غلاظت میں لت پت محسوس کرتی ہے۔

حسنہ حسین

عمر یسرا

مکمل ناول

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھلتی ہے۔ اپنا حلیہ دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی ہوگئی ہے۔ فارس کہتا ہے کہ ان کی شادی کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔ نکاح رخصتی سادگی سے ہوئی ہے لیکن ولیمہ بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔ مسز شیرازی فارس کی والدہ اچھی عورت ہیں۔ سائرہ خالہ اس کی شادی فارس سے کرواتی ہیں۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔

مسز شیرازی چلنے پھرنے سے معذور ہیں، وہ آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عمر یسرا پر دونوں بات چیت کرتی ہیں مسز شیرازی اسے ان الفاظ کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔ جنت فارس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کو پریشان کرتی ہے۔

آئمہ فارس کی منہ بولی بہن اس کو ایک پارٹی میں لے جاتی ہے جہاں سب اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔

فارس اس سے پوچھتا ہے کہ وہ اتنے جتن کس لیے کر رہی ہے۔

جنت فارس کو تنگ کرتی ہے، اس کے آفس پہنچ جاتی ہے۔ فارس اسے جانے کے لیے کہتا ہے، وہ جا کر ریسیپشن پر بیٹھ جاتی ہے۔ برہان انصاری کا نام سن کر وہ وہاں سے واپس چلی جاتی ہے۔ اسے ماضی یاد آتا ہے۔ وہ مسز شیرازی کی بنائی آیت کے پاس جا کر کھڑی ہوتی ہے اور پھر اس کے کچھ معنی تلاش کر لیتی ہے۔

جنت فارس کے ساتھ اٹالین ریسٹورنٹ جاتی ہے۔ فارس اس سے طلاق کے بارے میں پوچھتا ہے۔

خالہ کی بیٹی کی شادی میں جنت فارس کے ساتھ گئی، وہاں لوگوں نے باتیں بنائیں کہ جنت کی شادی تایا کے بیٹے سے ہوئی، بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے دوسری شادی کرلی اور جنت کو اس کے بچے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں

طلاق دے دی گئی۔ فارس یہ سب سن لیتا ہے اور جنت کو سخت سست سنا کر وہیں رکنے کا کہہ کر چلا جاتا ہے۔
گھر پہنچ کر مسز شیرازی کو اس کے رکنے کا کہہ دیتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی لڑائی ہوئی ہے۔ ان کے کہنے پر جنت کو لے کر آتا ہے، اس کی حالت بہت خراب ہوتی ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے، چند دن بعد اسے ہوش آتا ہے۔
فارس کمرے میں آتا ہے، وہ کچھ بیمار لگتا ہے۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہتی ہے، وہ منع کر دیتا ہے۔ اس کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ یکایک وہ دیکھتی ہے کہ فارس کی گردن ایک طرف ڈھلک جاتی ہے وہ سانس نہیں لے رہا۔

تیسری قسط

''اف...... فارس!؟'' جنت کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ داہنا ہاتھ منہ پر جمائے وہ متوحش ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

وہ سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کے وجود میں اب کوئی حرکت نہیں رہی تھی۔

وہ رو دینے والی ہو گئی۔ ڈاکٹر بخاری ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کرے۔

''جنت!!'' اسے یوں لگا جیسے نانا نے کندھے پر ہاتھ رکھا ہو۔ ہمت بندھائی ہو۔ حوصلہ دیا ہو۔ ایک ساتھ کئی منظر اس کی آنکھوں میں لہرائے تھے۔

خود پر طاری جمود کو توڑتے ہوئے وہ یک دم حرکت میں آئی۔ فارس کو سیدھا لٹاتے ہوئے اس نے نبض چیک کی پھر اسے سی پی آر دینا شروع کیا۔

بہتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے دل کے ساتھ وہ اسے تب تک سی پی آر دیتی رہی جب تک ڈاکٹر بخاری نہیں آ گئے تھے۔ اس کی حالت کے پیش نظر اسے فوری ہسپتال لے جانا پڑا۔ ایمرجنسی روم تک وہ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ لیکن اس کے بعد...... ٹھنڈے سرد کاریڈور میں کھڑی وہ تنہا ہی ڈاکٹرز کے عملے میں افراتفری دیکھنے لگی۔

وقت بدل گیا تھا...... لیکن خوف اسی انداز میں...... اسی راستے سے آ لپٹا تھا۔ احساسات یوں ہوئے تھے جیسے وہی اذیت ایک بار پھر اپنا آپ دہرا رہی ہو۔

آخری بار اس طرح کی ایمرجنسی سچویشن میں وہ اپنے نانا کے ساتھ آئی تھی...... انہیں ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ اسے یاد تھا وہ ان کے چہرے سے سفید چادر ہٹا کر ڈاکٹرز کی منتیں کرتی رہی تھی کہ وہ انہیں زندگی کی طرف واپس لے آئیں...... اس دن جب اس نے نانا کا ہاتھ پکڑا تھا تو وہ سرد تھا۔ فارس کا ہاتھ بھی تو کتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

اس نے ڈاکٹر بخاری کو آئی سی یو سے باہر نکلتے دیکھا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود اٹھ کر ان کے پاس جاتی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے، وہ خطرے سے باہر ہے۔'' انہوں نے قریب آ کر کہا تو اسے لگا جیسے کافی دیر بعد اسے سانس آیا ہو۔

''اگر آپ اسے سی پی آر نہ دیتیں تو ہم اسے نہ بچا پاتے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔''

''اسے کیا ہوا تھا؟''

''کیٹ الرجی...... اس بار ری ایکشن زیادہ شدید ہوا ہو گیا تھا۔''

''کیٹ الرجی؟' جنت کی آنکھیں پھیلیں۔

وہ اب براہ راست اس کے ساتھ فارس کی کنڈیشن ڈسکس کر رہے تھے ساتھ ساتھ تسلی اور دلاسا بھی دے رہے تھے۔

''میں اس کے لیے آٹو انجکٹر لکھ کر دوں گا۔ اس طرح کی ایمرجنسی سچویشن میں فائدہ مند ثابت ہو گا۔ طبیعت اس حد تک نہیں بگڑے گی۔ اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر بخاری جا چکے تھے۔ مگر وہ اپنی جگہ پریشان کھڑی رہ گئی تھی۔

اگر وہ کمرے میں نہ جاتی، بروقت دماغ کام نہ کرتا اور وہ اسے سی پی آر بھی نہ دیتی تو شاید...... اس سے آگے جنت سے کچھ بھی سوچا نہ گیا۔

اس نے مسز شیرازی سے فون پر بات کی جو فارس کے لیے حد درجہ فکر مند نظر آ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ابھی اٹھ کر اس کے پاس ہاسپٹل آ جائیں۔

''وہ اب خطرے سے باہر ہے آنٹی! اسے جیسے ہی ہوش آئے گا، میں آپ کی بات کروا دوں گی، اور آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں ہوں نا اس کے ساتھ......'' اس نے کہا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا ہی مسز شیرازی کو مطمئن کر گیا تھا۔ ان سے بات کرنے کے بعد وہ کافی دیر تک بے قراری سے کاریڈور میں ہی ٹہلتی رہی تھی۔

☆☆☆

اسے جب مکمل طور پر ہوش آیا تھا تو دھرتی پر اندھیرے پھیل چکے تھے۔ کمرے میں نیلگوں بلب جل رہا تھا۔ جس کی مدھم سی روشنی میں اسے ادراک ہوا تھا کہ وہ ہاسپٹل میں ہے۔ آکسیجن ماسک اتار کر گردن پر ٹھہراتے ہوئے اس کی نگاہ بے ساختہ جنت کمال کی طرف گئی تھی۔

دائیں طرف کرسی پر بیٹھے بستر کے کنارے سر ٹکائے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اپنا داہنا ہاتھ اس نے غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹا لیا تھا جو اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔

یکا یک اسے سینے میں درد کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ آنکھیں موندے وہ اگلے کئی لمحوں تک گہری سانسیں لیتا رہا مگر باوجود کوشش کے بھی اپنی کراہ نہ دبا سکا۔

جنت نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ پھر فوراً اٹھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس کے تھکن زدہ، نڈھال چہرے کی رنگت زرد تھی۔ آنکھوں کے بھاری پپوٹے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔ لیکن گردن اور سینے پر اب ریشز نہیں تھے۔

''اب کیسی طبیعت ہے!؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''ممی...... کیسی...... ہیں؟'' آواز بھاری اور کچھ حد تک بدلی ہوئی تھی۔

جنت اسے کچھ حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔ نیم غنودگی کے عالم میں اسے یاد تھی بھی تو اس کی ماں...... فکر ہو بھی رہی تھی تو صرف ان کی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں......'' جھک کر اس نے مدھم آواز میں تسلی دی تھی۔ ''تمہیں کچھ چاہیے؟''

''پانی......!'' اس نے بھاری نفس کے بیچ کہا۔

مستعدی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس نے فارس کی گردن کو سہارا دے کر گلاس لبوں سے لگا دیا۔

اس نے چند گھونٹ لینے کے بعد تکلیف سے چہرے کے زاویے بگاڑتے ہوئے گلاس دور ہٹا دیا۔ گلے کی سوزش اذیت کا باعث بن رہی تھی۔

چند لمحوں تک خالی نظروں سے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

دوبارہ اسے ہوش دن کے اجالے میں اس وقت آیا تھا جب مشرقی دیوار کی تمام کھڑکیوں پر سے جنت کمال نے پردے کھینچ کر ہٹا دیے تھے۔ دھوپ کی سنہری کرنیں اس کے چہرے پر پڑنے لگیں تو سوئی جاگتی کیفیت میں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

کھڑکی سے باہر سر نکال کر جانے کسے زور و شور سے ہاتھ ہلا کر وہ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ سیدھی ہوئی تو فارس وجدان پر نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وہ پھول جنہیں وہ ہاتھ میں پکڑے تھی، ان کی ڈنڈیاں بھی ڈھلک سی گئی تھیں۔

فارس نے بٹن دبا کر بستر کو سٹنگ پوزیشن میں ایڈجسٹ کیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی یکا یک اجنبی ہو گئی۔ خاموش ہو گئی۔ سپاٹ ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے تک اس کے چہرے پر جتنے بھی رنگ بکھرے تھے، وہ اب آنکھوں میں بھی نہ رہے تھے۔

شان بے نیازی سے اس نے اپنا رخ بدلا۔ گلدان میں پھول ڈالے اور باہر نکل گئی۔ دوبارہ اس کی آمد ڈاکٹر بخاری کے ہمراہ ہوئی تھی۔ مگر وہ خود اندر نہیں گئی تھی۔

''میں اب ٹھیک ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں......!'' چیک اپ کے بعد وہ ڈاکٹر بخاری سے مخاطب تھا۔ اور وہ ناخن کے ساتھ کھلتی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

''اس پر ہم کل بات کریں گے، فی الحال تم صرف ریسٹ کرو۔'' ڈاکٹر بخاری کہہ رہے تھے۔

''آپ سمجھ نہیں رہے۔ مجھے کل میٹنگ......''

''فارس!'' انہوں نے کچھ سختی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''میرے خیال سے اس وقت تمہیں اپنے لیے تھوڑی سی سنجیدگی دکھانی چاہیے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کل تمہیں کس حالت میں ہاسپٹل لایا گیا ہے۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''تمہاری بیوی بہت بہادر ہے، ایسی سچویشن

میں تو فیملی ممبرز حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں پر اس نے ہمت نہیں ہاری۔" دروازے پر کھڑی جنت کمال نے اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر مارا...... یہ ڈاکٹر بخاری۔ اف! کریڈٹ دینا ضروری تھا کیا؟

"ایمبولینس کے آنے تک اس نے تمہیں سی پی آر دیا......" وہ تفصیلات میں جارہے تھے۔ کچھ گھبرا کر وہ ان کی بات قطع کرنے کو تیزی سے اندر آگئی۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر بخاری مسکرائے۔ وہ اپنی اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ مسکرا تک نہ سکی۔ اس نے فارس کی طرف دیکھے بغیر مسز شیرازی کا نمبر ملا کر موبائل اس کی طرف بڑھادیا۔

"آنٹی سے بات کرلو۔" پھر اسی سرعت سے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

ہاسپٹل کے وی آئی پی روم میں وہ کاؤچ پر بیٹھی سیب کاٹ رہی تھی جب اچانک ہی اسے اپنے چہرے پر نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا تھا۔ بے ساختہ سر اٹھایا تو نگاہیں فارس سے ٹکرا گئیں جو سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ جنت نے الجھ کر نظریں ہٹالیں۔

ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے یوں اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چہرہ بے تاثر تھا مگر آنکھوں کا تاثر غیر واضح۔ نہ غصہ تھا۔ نہ نرمی۔ نہ سختی۔ نہ عداوت...... پرسوچ نگاہوں میں کچھ اور تھا...... جنت پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہوگئی...... کہیں وہ اس تھپڑ کو یاد کرکے انتقام کا تو نہیں سوچ رہا......! اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ یہ بات تو وہ بھول ہی گئی تھی۔

"اب؟" وہ فکروں میں پڑگئی۔ "میں اسے ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔" اس نے سوچا۔ "صاف مکر جاؤں گی۔ بولوں گی تمہارا وہم ہے۔ تمہیں اپنا ہوش نہیں تھا تو یہ تھپڑ کا ہوش کہاں سے آگیا؟"

ہمت مجتمع کرکے اس نے فارس کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اس بار صحیح معنوں میں فارس کی نگاہوں کا تاثر اس پر واضح ہوا تھا۔ شاید تضحیک کا تاثر تھا۔ استہزائیہ نگاہیں تھیں۔ کچھ تو تھا۔ کچھ تو تھا آگ اور برف جیسا...... منجمد کرتا۔ جلا کر راکھ کرتا ہوا۔

جنت کے لب بھینچ گئے بھنویں سکڑ گئیں۔

لاہور سے واپسی کے بعد خود سے کیے جانے والے سارے وعدے اسے ایک ہی لمحے میں یاد آگئے۔ ان حدود و قیود اور فیصلوں کا بھی ادراک ہوا جن کی پاداش میں اس نے وجدان ہاؤس میں اپنی نقل و حرکت کو کم کردیا تھا۔ اسے یاد آیا۔ چوبیس گھنٹے پہلے تک وہ فارس وجدان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تک نہیں تھی اور یہ بھی کہ اس نے خود کو اس کے گھر میں اجنبی مسافر کرلیا تھا۔ اپنے تعلق کو جیسے مسز شیرازی سے شروع کرکے مسز شیرازی تک ہی محدود کرلیا تھا۔ مگر اب؟

اب وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس کے ساتھ ہاسپٹل میں موجود تھی اور فارس وجدان کی مسز ہونے کے ناتے کچھ کام وہ بھی سرانجام دے رہی تھی۔ یعنی کہ اس کے ساتھ ساتھ رہنا۔ یہ سیب کاٹنا۔ اور اس پر بھی فارس کی نظریں......

وہ جانتی تھی، فارس وجدان کبھی بھی اس کے بارے میں مثبت نہیں سوچے گا۔ وہ ہر بار اور ہمیشہ کی طرح اس کے اٹھائے گئے ہر اقدام کے پیچھے کوئی غرض ڈھونڈے گا۔ اس سے قبل کہ وہ اب بھی ایسا ہی کرے، اسے اس کے نظروں میں گرائے، توہین کرے یا پھر اس کے عزت نفس پر چوٹ کرے، بہتر ہے، وہ کچھ باتیں خود ہی اس پر عیاں کردے۔

"یہ مت سمجھنا کہ تمہیں ایمپریس کرنے کے لیے سیب کاٹ کردے رہی ہوں، ڈاکٹر بخاری کا حکم ہے۔" سخت لہجہ تھا۔ غصہ تھا۔ خفگی تھی۔ کہ اب میں تمہارے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہی ہوں، اس لیے تم مجھے تضحیک آمیز نگاہوں

سے مت دیکھو۔

بستر پر آرام دہ حالت میں نیم دراز وہ اسے خاموشی سے دیکھے گیا۔

اس نے دوسرا سیب اٹھالیا۔ اسے لب بھینچ کر نفاست سے کاٹنے لگی۔ جیسے سزا کاٹی جاتی ہے بالکل ویسے ہی۔

"میں نے تمھاری جان نہیں بچائی..... خود کو بیوہ ہونے سے بچایا ہے...... اپنا بھلا سوچا ہے۔ ورنہ جس طرح تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں ہے بالکل اسی طرح مجھے بھی تمھاری رتی برابر پروا نہیں ہے۔" سر اٹھا کر سرد نظروں سے فارس وجدان کو دیکھنا چاہا۔ موبائل اسکرین پر نگاہ جمائے اس کا متبسم چہرہ...... جنت ساکت ہوگئی۔

وہ مسکرا رہا ہے؟ بخدا وہ مسکرا رہا ہے؟ کس لیے؟ کوئی لطیفہ سنایا ہے اس نے؟

"اور یہ بھی مت سوچنا کہ......"

"میں کچھ نہیں سوچ رہا۔"

اپنی بات ادھوری رہ جانے پر...... اور بروقت اس کا رسپانس مل جانے پر وہ چپ ہوئی تھی۔

وہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ کچھ ٹائپ کر رہا تھا یقیناً۔ انداز اب مصروفیت لیے ہوئے تھا۔ کچھ دیر پہلے تک۔ جو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تبسم بکھرا تھا اب اس کی جگہ ازلی سرد مہری نے لی تھی۔

وہ مضطرب ہوئی...... پھر سیب کی پلیٹ اس کے بستر پر رکھ کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ اس کا داہنا ہاتھ فارس کی گرفت میں آگیا۔ جنت کا دماغ جیسے بھک سے اڑا...... جھٹکے سے مڑ کر اس نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اسی ہاتھ سے تھپڑ مارا تھا؟"

جنت کے ہوش اڑ گئے۔ آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اوپر سے اس کی گہری آنکھوں کا تاثر...... برف اور آگ کا مشترکہ تاثر...... جنت کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی...... وہ جو سوچے ہوئے تھی کہ فوراً سے مکر جائے گی۔ ڈٹ جائے گی۔ یالا جواب کردے گی تو...... تو......

"میرا ہاتھ چھوڑو!" کچھ متوحش ہو کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچا۔ اس حالت میں بھی فارس کی گرفت کسی آہنی شکنجے جیسی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر بخاری اسے صرف اس لیے ڈسچارج نہیں کر رہے تھے کہ اسے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

"پہلے جواب دو!"

"میں جواب دینے کی پابند نہیں!" ذرا سا رعب دکھانا چاہا، نتیجتاً گرفت سخت ہوگئی۔

"نہیں، وہ یہ والا ہاتھ نہیں تھا!" بے بسی سے چلائی...... (حالانکہ مجرم ہاتھ یہی تھا)

"ٹھیک ہے، دوسرا ہاتھ دو۔"

"پہلے تم یہ چھوڑو۔" اپنا کلائی گھما کر کھینچتے ہوئے وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔

"پہلے تم دوسرا ہاتھ دو۔" گرفت کے ساتھ ساتھ فارس کا لہجہ بھی سخت ہوا تھا۔

جنت نے پورا زور لگا دیا۔ مگر فارس نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔

ایک لمحے کے لیے جیسے کوئی منظر آنکھ کے پردوں پر لہرایا۔ سدرہ کی شادی۔ پارکنگ ایریا۔ رات کی تاریکی اور زمان صفدر۔ وہ چہرہ زمان کا چہرہ تھا۔ اور گرفت بھی جیسے اس کی ہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا اگر اس نے ہاتھ نہ چھڑایا تو مر جائے گی۔ اور اس نے چھڑانے کی کوشش بھی کی تھی۔

اس رات بھی ایک تماشا بنا تھا۔ اس رات بھی ایک کہانی اس کی ذات سے منسوب ہوئی تھی۔ زمان کو ٹھکرائے جانے کا احساس بمع اس تھپڑ کے مشتعل کیے ہوئے تھا جو روحینہ چچی کے گھر ان کے ٹیرس پر اس وقت پڑا تھا جب بغیر اجازت وہ اس کے کمرے میں آگیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس کا رشتہ زمان سے تقریباً طے ہو چکا تھا۔ مگر فارس سے شادی کے بعد سے وہ جیسے موقع کے انتظار میں تھا کہ کب وہ جنت کمال سے اپنی توہین، بے عزتی اور تھپڑ کا بدلہ لے سکے۔ اور یہ موقع اسے کب ملا تھا؟ کچھ

دیر پہلے تک وہ جو مضبوط نظر آ رہی تھی تو اسی سرعت سے مٹی کے ڈھیر کی طرح بھربھرا بھی گئی۔

''پلیز...... چھوڑ دو...... پلیز!'' وہ چھوٹے بچے کی طرح یک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کی آنکھوں کی نمی...... خوف...... وحشت......اور ہاتھ چھڑانے کی دیوانہ وار جستجو۔

فارس کی گرفت یک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ روتی سسکتی آنکھوں کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ اسی وقت کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد وہ اندر نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر بخاری کے علاوہ چند ایک دوست بھی اس سے ملنے آ چکے تھے۔ عدیل احمد بھی کمپنی کے کچھ معاملات ڈسکس کرنے آیا تھا۔ مسز شیرازی سے بھی اس کی بات ہوئی تھی مگر جنت کمال دوبارہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

مغرب سے پہلے ہی نرس نے اسے ڈرپ لگائی تھی۔ کچھ ادویات کا اثر تھا اور کچھ اس محلول کا بھی جو اس کی نسوں میں سرایت کر رہا تھا کہ وہ سو گیا تھا۔

اور پھر رات کے جانے کس پہر جنت کے مسلسل بجتے موبائل کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اسے ارتکاز پکڑنے میں کچھ دقت ہوئی تھی۔ وجود بھاری ہو رہا تھا۔ بمشکل کہنیوں کے بل اوپر ہوتے ہوئے اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

جنت کمرے میں نہیں تھی......

انگلیوں سے آنکھیں مسلتے ہوئے کسی قدر کوشش سے وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

اگر اس کا ہینڈ بیگ اور موبائل گلاس ٹیبل پر نہ پڑے ہوتے تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ گھر چلی گئی ہو گی۔ تاہم وہ ہاسپٹل میں ہی موجود تھی۔ مگر یہاں نہیں آ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے جنت روتا سسکتا چہرہ لہرا گیا۔ گھر کی طرح اب بھی وہ ہاسپٹل کے کسی کونے میں روتی پائی گئی تو؟

لب بھینچ کر اس نے بے اختیار اپنی پیشانی کو مسلا...... کچھ سوچ کر وہ باہر آ گیا۔ چند قدم اٹھانے سے ہی اس کا تنفس پھول گیا تھا۔ پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی۔

وارڈ میں وہ نہیں تھی۔ یقیناً وہ نیچے ہو گی۔ یا پھر باہر لان میں۔ اسے غصہ آنے لگا۔

سیڑھیاں اتر کر اس نے ویٹنگ ایریا کا رخ کیا تھا۔ اور تب ہی وہ اسے سامنے بیٹھی دکھائی دے گئی تھی۔

اطراف سے یکسر بے نیاز، لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ تین چار ماہ کے ننھے سے بچے کو بانہوں میں لیے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ بچہ اس کی گود میں پرسکون تھا۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد اس کا ننھا سا ہاتھ، اس کا ماتھا، اس کا گال چومنے لگتی تھی۔

اطراف میں بکھری سفید روشنیوں میں وہ اس پر نگاہ جمائے کھڑا رہ گیا۔ وہ منظر کسی خواب۔ کسی خیال کا سا تھا۔

''آئم رئیلی سوری میں نے آپ کو زحمت دی!'' سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس چھبیس ستائیس برس کا نوجوان چہرے پر تھکن اور پریشانی کے تاثرات لیے روم سے نکل کر جنت کے پاس آ گیا تھا۔

''آپ اپنے بچے کو زحمت کہہ رہے ہیں؟'' جنت نے سر اٹھا کر ذرا سی خفگی دکھائی۔ جواباً وہ مسکرا دیا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ انجان لڑکی اس کا بچہ سنبھال رہی تھی۔ وہ اس کا بے حد شکر گزار تھا۔

''میری مدر ابھی آتی ہی ہوں گی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اٹس او کے، آپ پریشان مت ہوں، اگر کوئی نہیں بھی آتا تو میں اسے سنبھال لوں گی۔'' جنت نے نیلگوں کمبل سوئے ہوئے بچے پر ڈالا۔ ''اب آپ کی وائف کی طبیعت کیسی ہے!؟''

''بہتر ہے۔'' وہ ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

''اسے آپ مجھے دے دیں، آپ تھک گئی ہوں گی۔'' اس نے بچے کو لینا چاہا۔ جنت انکار کرنے ہی والی تھی کہ نگاہ فارس وجدان پر پڑ گئی۔ کچھ دیر پہلے جب وہ کمرے میں گئی تھی تو وہ گہری نیند

سو رہا تھا۔ اور اب......

کچھ حیرت...... کچھ بے یقینی سے اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ بچے کو اس کے باپ کے حوالے کر کے فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اسی سرعت سے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ گئی۔ چہرے پر صبح کے واقعے کا اب کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس وہی خفگی تھی...... غصہ تھا...... اجنبیت تھی جو لاہور سے واپسی کے بعد سے اس کا خاصہ رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے دبی آواز میں جھاڑ کر پوچھا تھا۔

وہ خاموش تھا...... وہ خاموش ہی رہا......

"تمہارا ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کا ارادہ ہے بھی یا نہیں؟"

وہ تب بھی کھڑا رہا۔

اس کی خاموشی اور نگاہوں کے غیر معمولی تاثر کو دیکھ کر جنت الجھن میں پڑ گئی۔ شاید وہ اب بھی نیند میں ہی تھا۔ ورنہ وہ اٹھ کر باہر کیوں آتا؟ بت بن کر کھڑا کیوں رہتا؟ اور اسے بھی ایسے کیوں دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو؟

گہرا نفس لے کر خدا کی پناہوں میں آتے ہوئے اس نے کچھ محتاط ہو کر فارس کے بازو پر گرفت جمائی اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے بمشکل اٹھانے پڑ رہے ہوں۔ آدھے سے زیادہ قوت تو خود جنت کو لگانی پڑ رہی تھی۔

بیڈ پر بٹھاتے ہوئے جنت نے بلب جلا دیا۔ پھر لحاف بھی ہٹا دیا۔

"تم صبح سے باہر کیا کر رہی ہو؟" آواز بوجھل تھی۔ مگر سوال پورے ہوش و حواس میں ہی پوچھا گیا تھا۔

جنت نے ڈر کر یوں جھٹکا کھایا جیسے رات کے سناٹے میں کسی بھوت نے مخاطب کر لیا ہو، پھر اسی سرعت سے ایسے پیچھے ہٹی جیسے پہلے والا فارس کوئی اور ہو، اب والا فارس کوئی اور ہو گیا ہو۔

"تم ایکٹنگ کر رہے تھے؟" آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔

"کس بات کی؟"

جنت نے لب بھینچ کر مٹھیاں بند کر کے اسے انتہائی غصے سے دیکھا۔

"ابھی تم ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے تمہیں اپنا کوئی ہوش نہیں۔" سرد لہجے میں جرم کی نشان دہی کی گئی۔

"رئیلی؟ یہ کب کی بات ہے؟" بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

جنت کو جیسے آگ لگ گئی۔ اچھا مذاق بن رہا تھا اس کا۔ یہی کمی رہ گئی تھی کہ اب توہین کے ساتھ ساتھ اسے بے وقوف بھی بنایا جائے گا۔

مٹھیاں بھینچ کر ضبط کرتی وہ اسی وقت کمرے سے چلی گئی۔ دوبارہ اس کی واپسی نرس کے ساتھ ہوئی تھی۔ خوب شکایات لگا کر لائی تھی وہ اسے کہ مریض وارڈ کے چکر لگاتا پھر رہا ہے اور آرام کرنے کے بجائے باتیں بنائے جا رہا ہے مگر نرس نے دیکھا۔ کیسے وہ مریض گہری نیند سو رہا تھا۔ اور کیسے اس کی بیوی خواہ مخواہ اس پر الزام لگائے جا رہی تھی۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے والے بیشتر شوہر صابر ہوتے ہیں۔ اور بیویاں ظالم۔

وہ چلی گئی تو جنت نے لب بھینچ کر فارس کو دیکھا۔ وہ کروٹ کے بل آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ مزید کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔

وہ خفگی کے عالم میں جھٹکے سے مڑ کر صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

☆☆☆

سیاہ جینز کے ساتھ آف وائٹ شرٹ پر، سرمئی راؤنڈ نیک سویٹر میں ملبوس وہ اپنے سیاہ سنیکرز کے تسمے باندھ کر جب سیدھا ہوا تو نگاہ جنت کمال پر جا ٹھہری رہی جو ڈاکٹر بخاری سے کافی بے دلی سے انسٹرکشنز لے رہی تھی۔ آج اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جا رہا تھا اور جنت اس فیصلے سے قطعی خوش نہیں لگ رہی تھی۔

عجیب الجھا ہوا سا انداز تھا اس کا۔ کوفت زدہ سی ہو رہی تھی وہ۔ کچھ کچھ پریشان بھی تھی۔ جیسے ایک

محفوظ آشیانہ چھوٹ رہا ہو۔
گاڑی میں بھی وہ دروازے کی طرف کافی سمٹ کر بیٹھی تھی۔ بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ ہاتھ چھپا رکھے تھے۔ شال اچھی طرح سے اوڑھ رکھی تھی۔ دوران سفر ان کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر بھی خاموشی حائل رہی تھی۔ کھانے کی میز پر، مسز شیرازی کے کمرے میں، شام کی چائے پر اس کا انداز الجھا ہوا سا تھا۔ جیسے وہ موجود ہے اور نہیں بھی۔ اس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ وہ بس کسی طرح ادھر ادھر کے کاموں میں الجھی رہے۔
جب وہ آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں گیا تھا تو وہ جان بوجھ کر ہی نیچے لاؤنج میں بیٹھی رہی تھی حالانکہ تھکاوٹ اسے بھی تھی۔ ہاسپٹل میں بے آرام وہ بھی تو ہوئی تھی۔ مگر اسے فی الحال کمرے میں نہیں جانا تھا۔ جانے کیوں ایک ان جانا سا خوف دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔
چینل پر چینل بدلتے ہوئے اس نے اقصیٰ کو بھی اپنے پاس ہی بٹھائے رکھا۔ ڈرائی فروٹس کی پلیٹ سامنے ہی دھری تھی۔ میگزین کے صفحے کھلے پڑے تھے۔ کسی آرٹیکل کو یکسوئی سے پڑھا جا رہا تھا۔
وہ صوفے پر تھی اور اقصیٰ فلور کشن پر۔
''اقصیٰ!'' کچھ سوچ کر اس نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔
''جی جنت آپی!'' (جنت نے ہی اسے منع کر رکھا تھا کہ وہ اسے بی بی نہ کہے)
''تمہیں کیا لگتا ہے، مرد اس بات کو کتنا سیریس لیتا ہے اگر کوئی عورت اسے تھپڑ مار دے۔''
اقصیٰ کا تیزی سے چلتا منہ رک گیا۔ ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے جنت کو دیکھا۔
کیچر میں جکڑے شہد رنگ بال۔ جن کی کچھ لٹیں متفکر سے موی چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔
''یہ جو مرد ہوتے ہیں نا آپی۔ بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں تم سے۔ کسی عورت سے پڑنے والے تھپڑ کو اپنی انا اور عزت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اور سوچ لیتے ہیں کہ بس اب ہر صورت انتقام ہی لینا ہے۔'' اقصیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں بات کر کے سسپنس کی انتہا کر دی۔
''کیسا انتقام؟'' جنت کے لب ہلے۔ وہ اتنی کمزور اور بے بس کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی۔ گویا اسے فارس وجدان سے کسی بھی اچھائی کی کوئی توقع نہیں تھی۔
''امیر زادے سیریل کلر ہائیر کرتے ہیں، کچھ اغوا بھی کروا لیتے ہیں، کچھ ساری عمر کے لیے قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ......''
جواب فارس وجدان نے دیا تھا۔ اور اتنے اچانک سے دیا تھا کہ وہ مارے بوکھلاہٹ کے صوفے سے اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر اسی سرعت سے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔
سرمئی ٹراؤزرز پر ہلکے آسمانی رنگ کے سویٹر میں ملبوس، لاپروا سے حلیے میں......وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا......سرد نگاہیں جنت کے چہرے پر جمی تھیں۔
کندھے سے پھسلتی شال کو ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے جنت نے حلق سے گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا۔ اقصیٰ کا لحاظ کر کے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا۔ خوف کو بھگا کر سر اٹھایا۔
''تم یہاں کیا کر رہی ہو!؟'' سوال اقصیٰ سے پوچھا گیا تھا۔ اور ذرا سی سختی کے ساتھ پوچھا گیا تھا۔
''جنت آپی نے کہا کہ انہیں نیند نہیں آ رہی تو......''
''تو تم نے سوچا، بیٹھ کر لوری سنا دیتی ہوں شاید اس طرح آ جائے۔''
اقصیٰ نے گڑبڑا کر فارس کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔
''جاؤ!'' حکم ملتے ہی وہ پیروں میں چپل اڑستی، اپنے میگزین سنبھالتی فوراً روپوش ہو گئی۔
اب لاؤنج میں جنت کھڑی تھی اور سامنے فارس۔
وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ خوف کس بات کا تھا آخر؟ وہ اس سے ڈر کیوں رہی تھی؟

ایک تھپڑ ہی تو تھا؟ جو کہ ناگزیر تھا۔ بے دردی اور نفرت کے ساتھ دو بار دھکیلا تھا اس نے۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ جس کے قریب آنے سے اس کی موت واقع ہو جانی ہو۔ ایسی صورت میں اگر اس نے غصے میں تھپڑ مار بھی دیا تو کیا ہوا؟ وہ بھی تو سختی دکھاتا رہا ہے؟ کمرے سے نکالتا رہا ہے؟ وہ بھی تو اسے پارکنگ ایریا میں چھوڑ کر آیا تھا۔

تیزی سے بھاگتا دوڑتا ذہن رک گیا۔ سوکھے پتے کی طرح لرزتا دل تھم گیا۔

ہمت مجتمع کر کے اس نے سر اٹھایا...... لب بھینچ کر، فارس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تا کہ اسے یہ تاثر دے سکے کہ وہ ہر گز ہر گز اس سے خائف نہیں۔

فارس اگلے چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی ڈٹ کر کھڑی رہی۔

''تھپڑ کی سزا ڈائریکٹ مجھ سے پوچھ لو۔'' بالآخر اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''سزائیں غلطیوں کی ہوتی ہیں اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

''یعنی تمہیں کوئی پچھتاوا، کوئی احساس نہیں؟''

جنت نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ یہ پچھتاوے اور احساس کی بات کون کر رہا ہے؟

''کس بات کا پچھتاوا؟'' لہجے میں قہر بھر کر پوچھا۔ ''شاید تمہیں یاد نہیں۔ دو بار دھکیلا تھا تم نے مجھے، دو بار۔'' انگلیاں کھڑی کر کے دکھائیں۔

''تو پھر تم دور کیوں نہ ہوئیں۔ اوہ ہاں یاد آیا۔ تمہیں ڈر تھا، کہیں تم بیوہ نہ ہو جاؤ'' فارس کا لہجہ استہزائیہ ہوا۔

جنت کا چہرہ مارے خفت کے سرخ ہو گیا۔ کاش وقت اسے پیچھے لے جائے اور وہ ہاسپٹل میں سیب کاٹتے ہوئے خود کو ایک عدد تھپڑ سے نواز سکے۔ اے کاش...... اے کاش......

''ہاں، مجھے اپنی فکر تھی۔ اور بہت زیادہ فکر تھی۔ تمہیں اس سے کیا؟'' ڈٹ کر، جم کر، ایک بار پھر سر اٹھا کر غرائی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ذرا سا سر جھکا کر وہ بمشکل کندھوں تک پہنچتی جنت کمال کو اگلے چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر جانے کے لیے مڑ گیا۔ اس کا رخ آفس روم کی طرف تھا۔ گویا وہ اپنے کسی کام سے ہی نیچے آیا تھا۔

ایک سرد نظر اس پر ڈالتی وہ زینہ طے کرتی کمرے میں چلی گئی۔ اس نے تکیہ اور کمبل اٹھایا پھر تن فن کرتی سٹنگ ایریا میں صوفہ کم بیڈ پر جا سوئی۔ تیور بگڑے ہوئے تھے۔ جبڑے بھینچے ہوئے۔ اور آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں وہ پچھلے ایک گھنٹے سے موجود تھا۔ فائلز دیکھتے، سائن کرتے، ضروری رپورٹس کا سرسری سا جائزہ لیتے اسے کافی کی طلب ہوئی تھی تو وہ اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی سماعت سے جنت کی آواز ٹکرائی تو رفتار خود ہی مدھم ہو گئی۔ پہلے اس کا خیال تھا وہ، ممی سے ہی بات کر رہی ہو گی۔ مگر وہ تو اس وقت تک سو جاتی تھیں۔

کچن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کے پاس ہی رک گیا تھا۔ یوں کہ اب وہ اوپن کچن ایریا کو عقبی حصے سے با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

''اب دیکھیں مجھے۔ میں کہیں سے آپ کو پریشان یا اپ سیٹ لگ رہی ہوں۔''

موبائل کچن کاؤنٹر ٹیبل پر اسٹینڈ پوزیشن پر رکھ کر وہ الٹے قدم پیچھے ہوتے ہوئے مسکرائی تھی۔ اسکرین پر سائرہ خالہ کا چہرہ واضح تھا۔ ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی مگر آنکھوں میں فکر ٹھہری رہی تھی۔

کاؤنٹر ٹیبل کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے وہ اب براہ راست انہیں دیکھنے لگی تھی۔ پورے ایک ہفتے بعد جنت نے ان کی کال ریسیو کی تھی۔ پورے ایک ہفتے بعد خود سے رابطہ کیا تھا۔

''تم نے فارس سے بات کی؟''

''کس بارے میں؟'' وہ ان جان ہو گئی۔

''جو کچھ...... اس رات ہوا۔'' خالہ محتاط ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

جھکے سر کے ساتھ جنت نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔'' آہستگی سے مڑ کر برنر بند کر دیا۔ چائے کی کیتلی سے کپ میں انڈیلنے لگی۔

''اب دیکھیں، غلطی تو میری ہی ہے نا! فارس نے تو کہا تھا کہ ساتھ ہی چلو۔ میں نے ہی ضد کی کہ سدرہ کا ولیمہ اٹینڈ کر کے ہی جاؤں گی۔''

پلر کے پیچھے سیڑھیوں کے پاس جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا رہا تھا۔

''تمہارے خالو صفدر بھائی سے ملے تھے۔ بات بھی کی تھی۔ سمجھایا بھی تھا۔ لیکن تم تو جانتی ہو زمان کس نیچر کا ہے۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ کہیں وہ......''

''کہیں وہ مجھے نقصان نہ پہنچا دے؟'' اس نے مڑ کر اچھنبے سے سائرہ خالہ کو دیکھا پھر ہنس دی۔ اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔ اس کی آنکھیں جھوٹی تھیں۔ اس کے تاثرات مصنوعی تھے۔ اس کی بہادری دھوکا تھی۔

''میں سوچ رہی تھی اگر میں فارس کو اعتماد میں لے کر بات کروں...... ہو سکتا ہے وہ اس مسئلے کا کوئی حل......''

''آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ!'' جنت نے فوراً انہیں ٹوک دیا۔

''جنت! میں جانتی ہوں کہ......''

''آپ نے پہلے بھی اسے دھوکا دیا۔ آپ اب بھی اسے دھوکا دیں گی؟'' اس کا رویہ بدلا تھا۔ اس کی ہمت بکھری تھی۔ اس کا حوصلہ ٹوٹا تھا۔ سائرہ خالہ صدمے سے گنگ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ ''جنت!''

اور پھر لفظ گویا ختم ہو گئے۔ وہ مزید کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

''وعدہ کریں، آپ ایسی کوئی بھی بات اس سے نہیں کریں گی، کبھی بھی نہیں......'' اس نے دو ٹوک لہجے میں کہہ دیا تھا۔ سائرہ خالہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

''میری زندگی میں سب نارمل ہے، میں نہیں چاہتی پھر سے کوئی طوفان اٹھے اور میرا تماشا بنے۔''

''لیکن زمان چپ نہیں بیٹھے گا۔'' سائرہ خالہ کو بس یہی فکر تھی۔

جنت نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ پریشان ہوئی...... نہ خوف کا اظہار کیا...... ایسے جیسے وہ مسئلہ کوئی مسئلہ رہا ہی نہ تھا۔

''مجھے تمہیں شادی اٹینڈ کرنے کے لیے فورس نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولی تو انہوں نے کہا۔

''آپ نے فورس نہیں کیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے آئی تھی۔'' پورے اعتماد کے ساتھ اس نے جھوٹ بولا۔ پھر ایک لمحے کا توقف کیا...... ''آپ میرے لیے اس طرح فکر مند ہوتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا خالہ! ٹھیک ہے بڑے بابا نے آپ کو وصیت کی تھی میرے بارے میں۔ لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میری شادی ہو چکی ہے اور اب میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔ یہاں سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آنٹی مجھے بہت چاہتی ہیں۔''

چائے کا گھونٹ بھر کر اس نے پھر انہیں دیکھا۔ وہ خاموش تھیں۔

''اگر فیصل بھائی کہہ رہے ہیں تو کینیڈا شفٹ ہو جانے میں حرج ہی کیا ہے؟ اب تو سدرہ کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ میں بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہوں۔ اب تو آپ کو مکمل سکون سے چلے جانا چاہیے۔''

سائرہ خالہ نے پوری بات خاموشی سے سنی پھر کچھ یاد آ جانے پر انہوں نے فارس سے متعلق پوچھا...... انہیں غالباً مسز شیرازی نے ہی بتایا تھا کہ وہ دو دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہا ہے۔ اور باتوں کے دوران انہیں پوچھنا یاد ہی نہ رہا۔

جنت کے تاثرات یک دم بدل گئے۔ بھنویں غیر محسوس انداز میں سکڑ گئیں۔ ''گیس واٹ! اسے کیٹ الرجی ہے؟ کیا آپ یقین کر سکتی ہیں میرے

شوہر کو کیٹ الرجی ہے؟"

اور اس تمام عرصے میں سائرہ خالہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ بکھری تھی اور پھر وہ ہنس پڑیں۔ جنت بلیوں کے لیے کتنی دیوانی تھی، ان سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

"میں نے سوچا تھا یہاں سیٹ ہو جاؤں گی تو پھر بلی پالوں گی۔ میں نے مسز درانی سے بات تک کر لی تھی کہ ان کی ایرانی کیٹ کا ایک بچہ میں لوں گی۔ اور اب۔" گہرا نفس لے کر اس نے بے بسی سے ہاتھ اٹھا کر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"آپ کو کم از کم رشتہ طے کرنے سے پہلے یہ تو معلوم کروا لینا چاہیے تھا کہ لڑکے کو بلیاں پسند ہیں بھی یا نہیں؟" وہ اب ان پر خفا ہو رہی تھی۔

"اتنا سیریس مسئلہ تو نہیں ہو گا جنت۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"وہ دو دن ہاسپٹل میں رہا ہے خالہ! اب آپ خود سمجھ جائیں، یہ اس کے لیے کتنا سیریس مسئلہ ہے۔"

"تو ٹھیک ہے دور دور سے بلیوں کو ہیلو ہائے کر لیا کرو۔ اب شوہر کے لیے اتنا تو کرنا پڑے گا۔"

خالی کپ سنک میں دھوتے ہوئے جنت نے ذرا سی خفگی کے ساتھ انہیں دیکھا۔

"آپ کو میرا غم ...... غم نہیں لگ رہا ہے۔"

"نہیں بچے ...... میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔" وہ ہنس دیں۔

"اچھا یہ بات کسی سے بھی شیئر مت کیجیے گا۔" دوپٹے کے ساتھ ہاتھ خشک کرتی وہ موبائل سکرین کی طرف جھکی۔

"کون سی بات؟"

"یہی کہ فارس کو بلیوں سے الرجی ہے! مجھے لگتا ہے گھر میں ملازموں کو بھی نہیں معلوم، ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ اگر یہ بات باہر نکلے اور کسی کو پتا چل جائے فارس کا ری ایکشن کتنا شدید ہوتا ہے تو یقیناً اس کے دشمن اس بات کا فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔ ہے نا؟"

خالہ اس کی سوچ پر انگشت بہ دنداں رہ گئیں۔

"یہ بڑے بڑے کاروباری لوگوں کے دشمن بھی تو بڑے بڑے ہوتے ہوں گے۔"

خالہ اس کے سوچ پر حیران ہو رہی تھیں۔ یہ خیال ان کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔

"اقصیٰ۔ بھی سارا وقت میرے ساتھ رہی لیکن میں نے اسے بھی بھنک نہیں پڑنے دی کہ وہ ہاسپٹل میں کس وجہ سے ہے۔" بہت محتاط انداز میں۔ سنجیدگی اور سمجھداری سے وہ ان سے بات کر رہی تھی۔ انداز پراسراریت لیے ہوئے تھا۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو!" انہوں نے اعتراف کیا۔

اور تب ہی قدموں کی آہٹ پر اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ پھر گھوم کر کاؤنٹر ٹیبل کی طرف آئی۔ اور وہیں سے اس نے بہت آگے تک دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

"اچھا خالہ! آپ سے پھر بات ہو گی۔" ان کو الوداع کر کے اس نے کچن کی لائٹس آف کر دیں۔ سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر بے ساختہ ہی آفس روم کی طرف اٹھ گئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور فارس وجدان ریک سے کچھ فائلز نکالتا نظر آ رہا تھا۔

سر جھٹک کر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"مجھے گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان! میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ اور پھر خود اٹھ کر گئی تھی۔ اب بھی اگر گروں گی تو اٹھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔"

آفس چیئر پر بیٹھتے ہوئے اس نے فائل ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملاتے ہوئے وہ مسلسل اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ اور پھر تاریخ کے ساتھ ساتھ شادی ہال کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے عدیل احمد سے دس سے بارہ بجے کے درمیان پارکنگ ایریا کی سی سی ٹی وی

نو میسج طلب کر لی تھی۔

☆☆☆

اس نے سارا دن خود کو مسز شیرازی کے ساتھ مصروف رکھا۔ کافی عرصے بعد اس کے اصرار پر وہ قدرتی مناظر کی ایک پینٹنگ بنا رہی تھیں۔ ان کے اسٹوڈیو میں چھوٹے سائز کارپٹ پر بیٹھ کر وہ بھی کنوینس پر ایسے ہی رنگ بکھیرنے لگی تھی۔

سبز، سنہرا، سیاہ، سرخ، گلابی...... رنگوں سے کھیلتے اس کی توجہ ایک بار پھر فارس وجدان کے باکس کی طرف چلی گئی۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے باکس اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ ایک بار پھر کھول کر وہ اشیاء کا جائزہ لینے لگی۔ نیچے، بہت نیچے تصویروں کا ایک البم بھی تھا۔ رخ بدل کر اس نے مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ گو کہ وہ جانتی تھی اگر انہوں نے دیکھ بھی لیا تب بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر پھر بھی۔ جانے کیوں وہ محتاط سی ہو رہی تھی۔ اس نے البم کھول دیا۔ پہلی تصویر سامنے تھی۔

سنہری آنکھوں میں بلا کی معصومیت لیے وہ چار پانچ سال کا ایک خوب صورت بچہ تھا۔ دھوپ میں اس کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ شہد رنگ کی آمیزش لیے چاکلیٹی رنگ کے نرم و ملائم بال قدرے لمبے تھے۔ اس کی پیشانی پر بکھرے۔ گردن تک آئے ہوئے۔

آنکھوں میں اشتیاق اور تجسس لیے وہ صفحے پلٹتی گئی۔

بیڈ پر، الماری کے سامنے، درخت کے نیچے، سرسبز میدان کے وسط میں...... رزلٹ کارڈ لیتے ہوئے، ٹرافی جیتتے ہوئے، کھیل کے میدان میں، گھوڑے کی پشت پر...... چھ سے سولہ سال تک کے فارس وجدان کی تصاویر اس کے سامنے تھیں۔ مگر کہیں بھی وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ ہر تصویر میں وہ اکیلا تھا۔ ہر تصویر میں اس کے تاثرات بھی ایک سے تھے۔ فیملی کا کوئی ایک فرد بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ مسز شیرازی کے ساتھ بھی اس کی کوئی تصویر نہ تھی۔

البم کے آخر میں ایک تصویر تھی۔

سرسبز باغ کا منظر تھا۔ وہ شاہ بلوط کے سائے میں لکڑی کی باڑھ کے پاس کھڑا تھا۔ لڑھکتا ہوا فٹ بال اس کی طرف آ رہا تھا۔ اور جس طرف سے آ رہا تھا اس طرف پانچ چھ سال کی بچی کھڑی تھی۔ اس کی پشت کیمرے کی طرف تھی۔ اپنا سر اونچا کیے اس نے جوش سے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ اس کی سفید فراک پر جگہ جگہ دھبے لگے تھے، سفید جرابیں تو مکمل طور پر مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔

پورے البم میں صرف ایک یہی تصویر ایسی تھی جس میں ایک ٹین ایجر فارس کے لبوں پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور ایک خوب صورت مسکراہٹ!

ایسے لگتا تھا جیسے یہ تصویر اس کی بے خبری میں لی گئی ہو۔

یکایک کسی نے اس کے ہاتھوں سے البم لے لیا۔ اس نے چونک کر جھٹکے سے سر اٹھایا۔ سانس رک سا گیا۔

اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے فارس نے باکس میں البم پھینکا، جھٹ سے بند کیا اور اسے اٹھا کر الماری کے اوپری خانے میں رکھ دیا۔ اب کم از کم وہ اقصیٰ کی مدد کے بغیر اس باکس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

فارس مسز شیرازی کے پاس چلا گیا۔ ان کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے جھکا تو مسز شیرازی نے محبت سے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔ ”تم کب آئے؟“

”ابھی ابھی۔“ اسٹول کھینچ کر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اب وہ کنوینس پر سفید پھول کو دیکھ رہا تھا جس میں مسز شیرازی سرخ لکیروں کا اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کے پر اشتیاق چہرے کو دیکھا۔ پھر رنگ سے اٹے اس برش کو۔

"بالآخر آپ نے برش اٹھا ہی لیا۔" وہ مسکرایا۔
"یہ جنت کی وجہ سے ممکن ہوا، سب کچھ سیٹ کر کے مجھے بٹھا دیا کہ کچھ بنا کر دیں، اسے بیڈ روم میں لگانا ہے......"
فارس کی نگاہیں بے ساختہ جنت تک گئیں۔ سر جھکائے وہ ایک بار پھر بلاوجہ کے رنگ پھیلانے لگی تھی۔
"گویا مجھ سے زیادہ اہم آپ کی بہو ہے۔" اس نے شکوہ کیا۔ جنت کے کان کھڑے ہو گئے۔
مسز شیرازی ہنس دیں۔ "جیلس ہو رہے ہو؟"
"تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟"
"ہونا تو چاہیے، میں اپنی بیٹی کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔"
"اگر جو میں آپ کو آپ کی بیٹی کے "کرتوتوں" سے آگاہی دوں تو کیا آپ تب بھی اس کی کوئی بات نہیں ٹالیں گی؟"
جنت کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ آنکھوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔
"ہاں تب بھی نہیں، بائے دا وے تمہیں اس سے مسئلہ کیا ہے؟"
"عبدالغفور شکایت کر رہا تھا۔ گلاب کی پتیاں کھانے کا بہت شوق ہے آپ کی لاڈلی کو۔"
مسز شیرازی نے ذرا حیران ہو کر جنت کو دیکھا۔ وہ متوحش سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ حالانکہ بات تو کچھ ایسی نہ تھی مگر اس کے تاثرات۔
وہ ہنس دیں۔ "رئیلی جنت؟ مجھے بھی ٹرائی کرنا چاہیے۔" ساتھ ہی فارس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔
فارس اپنی ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ "آپ کی عادتیں خراب ہو رہی ہیں ممی!"
ان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
"میں...... میں کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔" وہ معذرت چاہتے ہوئے اسی وقت اٹھ کر چلی گئی تھی۔

فارس نے مسز شیرازی سے یہ کیا کہا تھا؟ وہ شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ اگلے کئی لمحوں تک راہداری میں ہی کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

فارس وجدان کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں نرمی اگر نہیں تھی تو سختی بھی نہ رہی تھی لیکن جنت کمال کے لیے وہ آنکھیں اب بھی عذاب بنی ہوئی تھیں۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے وہ اس کی نگاہوں کا حصار اب خود پر محسوس کرنے لگی تھی اور ایسا ان تین ماہ میں پہلی بار ہوا تھا۔ بجائے خوش یا مطمئن ہونے کے وہ الجھنوں میں پڑ گئی تھی۔ رہ رہ کر یا تو خیال تھپڑ کا آتا تھا یا پھر اس ماضی کا جو فارس وجدان پر منکشف ہوا تھا۔ اور جس پر اس نے کھل کر اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔
اس نے کن انکھیوں سے فارس کو دیکھا۔
بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز، لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مصروفیت بھرے انداز میں کچھ دیکھتا، کچھ ٹائپ کرتا ہوا۔
یکایک ہی پارکنگ ایریا کا منظر جنت کی آنکھوں میں لہرا گیا، چہرے کے تاثرات بدل گئے، غصہ نئے سرے سے عود کر آیا۔ صوفے پر ٹانگوں کے گرد بازو باندھتے ہوئے اس نے تنفر سے اسے ایک نظر دیکھا پھر رخ پھیرے دیواروں کو گھورنے لگی۔ ایسے بے حس انسان کو آخر اس نے سوچا بھی تو کیوں؟
فارس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر پہلے تک چہرہ الجھنوں کی حکایت سنا رہا تھا، اب غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ پل پل اس کا رنگ، اس کے تاثرات بدلتے تھے۔
"ویسے میں کچھ سوچ رہا تھا۔" لیپ ٹاپ ایک طرف رکھے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"تم ممی کا بہت خیال رکھتی ہو، بدلے میں تمہیں کچھ تو چاہیے ہوگا؟"
اور جنت کو لگا، دسمبر کی سرد راتوں میں کسی نے

ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ کر کے اسے ہلا کر رکھ دیا ہو۔

''آج کے دور میں سب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔بغیر کسی مقصد۔بغیر کسی غرض کے کوئی نہ کسی کی اتنی کیئر کرتا ہے اور نہ اتنی سختی اور توہین برداشت کرتا ہے...... کچھ نہ کچھ تو تم نے بھی سوچ رکھا ہوگا۔کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی چاہیے ہوگا......''

آنکھوں میں دکھ،صدمہ،بے یقینی لیے وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اس لیے تم بلا جھجک کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔''
بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے،ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔تاثرات صلح جو تھے۔جیسے کوئی لین دین متوقع ہو۔نہ سختی تھی۔نہ غصہ تھا۔اس کے لیے یہ گفتگو بہت عام نوعیت کی تھی مگر جنت پر جیسے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔وہ فنا ہو رہی تھی۔

کیا سمجھتا تھا وہ اسے؟اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتے ہوئے اس نے لب بھینچ کر سر اٹھایا۔

''تمہیں لگتا ہے،میں آنٹی کا خیال تمہاری وجہ سے رکھتی ہوں؟اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو تم اپنی غلط فہمی دور کر لو۔''

''ہاں،جانتا ہوں،ان کا خیال رکھنا،انہیں وقت دینا تمہاری مجبوری ہے۔لیکن میں مجبوریوں سے فائدے نہیں اٹھاتا۔میرے گھر میں بغیر معاوضے کے کوئی کام نہیں کرتا!سب کو پے منٹ ادا کرتا ہوں میں۔''

جنت کا پارہ چڑھ گیا۔

''میرے خیال سے تم بھول رہے ہو،میں تمہاری کوئی ملازمہ نہیں ہوں اور نہ ہی تمہارے اشارے پر کام کرتی ہوں۔آنٹی کے ساتھ میرا اپنا رشتہ ہے۔''

''اور یہ رشتہ کب تک ہے؟''فارس کا لہجہ طنزیہ ہوا۔سکوت میں ڈھل کر وہ دم سادھے اسے دیکھ کر رہ گئی۔وہ ایک دم سے اسے بہت غیر،بہت اجنبی سا لگا۔حالانکہ وہ اس کا تھا بھی نہیں۔پھر بھی اسے دکھ ہوا۔پھر بھی اسے برا لگا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟''وہ مزید کوئی سوال۔کوئی استفسار نہیں چاہتی تھی۔

''اپنے سوال کا جواب۔''

جنت کے لیے وہاں بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا۔

''تمہارے سوال کا جواب میں تمہیں دے چکی ہوں۔اب تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

''ملازموں کو پے منٹ ادا کرتا ہوں۔''
فارس کی نقل اتارتی وہ شدید غصے کے عالم میں سٹنگ روم میں جا بیٹھی۔آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔''نکاح کر کے ملازمت دے رکھی ہے مجھے،جاب کر رہی ہوں میں اس کے گھر،سمجھتا کیا ہے یہ خود کو!''آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔گال،ناک سرخ ہونے لگی۔

فارس کا چہرہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا۔اس کی روئی بسورتی شکل کو بہت غور سے ملاحظہ فرمایا گیا۔جنت نے سر اٹھا کر اسے قہر بار نظروں سے دیکھا۔

وہ چوکھٹ کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑا ہو گیا۔دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں تھے۔چہرہ متبسم تھا۔آنکھوں میں وہی چمک جو جنت کمال کو ذلیل کر کے کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔

''ایک بار پھر سوچ لو،دبئی میں فلیٹ بھی دلوا سکتا ہوں۔''

''تم مجھے ذلیل کیے بغیر سکون سے طلاق دے دینا۔تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔''اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

''لیکن میں تمہیں مراعات دینے کی بات کر رہا ہوں،اب اتنا کٹھور بھی نہیں ہوں کہ طلاق دے کر بس فارغ کر دوں،بینک بیلنس،زمین،گھر کچھ تو ہو......''

''اگر تم اس طرح میرے سر پر مسلط رہے تو

میں آنٹی کو سب کچھ بتا دوں گی۔" اس کی برداشت اب ختم ہو رہی تھی۔

"شوق سے جاؤ! میں بھی تمہارے پول ان کے سامنے کھول دوں گا، حساب برابر۔"

جنت صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ کیا بول گئی تھی، اس کا ادراک اسے اب ہوا تھا، فارس کیا کہہ گیا تھا، اس کا احساس بھی جیسے اب ہوا تھا۔

"تم ایسا نہیں کرو گے!" اس کے لب ہلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ان سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔ جانتی تھی، اگر وہ سوچ رہا ہے تو کر کے بھی دکھا سکتا ہے۔ اس کے پاس بہت سے آپشن تھے۔ محدود تو جنت رہ گئی تھی۔ وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اگلے کئی پل خاموشی کی نذر ہوئے۔

"میں اب بھی سوچوں تو حیران ہوتا ہوں، آخر تم میں اتنی ہمت کیسے آ گئی تھی ایک بچے کی جان لینے کی کوشش! تمہیں ڈر نہیں لگا تھا؟" پہلے وہ اس کی ذات کی دھجیاں بکھیرتا تھا، اب وہ اس کے زخم ادھیڑ رہا تھا۔

"تمہاری ناراضی تو یقیناً اس کے باپ سے ہو گی۔ اس میں بچے کا کیا قصور؟"

مٹھیاں بھینچے وہ خاموش رہی۔

"یہ رانگ کالز کا کیا معاملہ تھا؟" سینے پر بازو باندھے فارس اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا ہو۔

وہ جھٹکے سے مڑی، گلاس ڈور سلائڈ کر کے باہر نکلی۔ کھینچ کر بند کرتی کونے میں جا کھڑی ہوئی۔

اب جب تک وہ اندر تھا۔ جنت کمال باہر ہی رہنا چاہتی تھی۔ اس تکلیف سے بچنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ مگر جنت رات گئے تک بالکنی میں ہی کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

"ایک کپ چائے۔ میرے لیے بھی۔"

شدید غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب عقب میں فارس وجدان کی آواز اچانک سے گونجی تھی۔ جنت نے مڑ کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔ کیا اسے جنت نظر نہیں آئی تھی؟ یا پھر اس نے جنت کو ہی میڈ سمجھ لیا تھا؟

"مجھ سے کہہ رہے ہو؟" انگلی سے اپنی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ حیرت سے۔ بے یقینی سے۔

"تمہارے علاوہ بھی کوئی یہاں ہے؟" کاؤنٹر ٹیبل کے ساتھ پشت ٹکائے، سینے پر بازو باندھے وہ سنجیدگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میرے ہاتھوں کی چائے پینے سے تم مر نہیں جاؤ گے؟"

"ممکن ہے زندہ رہ جاؤں۔"

جنت نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ پہلے وہ خاموش رہ کر اسے بے عزت کرتا تھا۔ اب بات کر کے اسے بے وقعت کر رہا تھا۔

"یہ جو نوکروں کی فوج ہے تمہاری، ان سے بنوا لو اپنی چائے۔" بگڑے تیوروں کے ساتھ خاصے جارحانہ انداز میں جواب دے کر اس نے مگ کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔

"پہلے تو خود بنا بنا کر پیش کرتی رہی ہو تم۔"

"اس وقت میں حواسوں میں نہیں تھی۔"

"اب تم حواسوں میں ہو؟"

جنت نے بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھا کر اس کے متبسم چہرے کو دیکھا پھر گہری سانس لے کر جیسے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے برنر بند کر دیا۔ مگ میں چائے انڈیل کر وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ فارس راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" وہ زچ ہوئی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"سوری، میں تمہیں اپنی چائے نہیں دے سکتی۔" مگ پر گرفت جما کر اسے آنکھیں دکھائیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے پھر دائیں طرف سے گزر جانا چاہا تو فارس نے بازو پھیلا کر روک لیا۔ کوفت سے اس نے بائیں سمت کا رخ کیا تو اس نے پھر وہی کیا...... جنت کا پارہ چڑھ گیا۔

"ہٹو میرے راستے سے۔"

"سوری! میں تمہیں راستہ نہیں دے سکتا۔" وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا جتنی کہ وہ تھی۔

"میں پھر بھی اپنی چائے تمہیں نہیں دوں گی۔" گھونٹ بھر کر جتایا بھی گیا...... کہ لو...... اب یہ چائے تمہارے کسی کام کی نہیں۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کہ اب یہاں سے جانے کا میرا کوئی ارادہ بھی نہیں۔

پھر کرسی کی بیک سائڈ پر بازو ٹکا کر شان بے نیازی سے فارس کو دیکھتے ہوئے تاثر دیا کہ میں جیتی تم ہارے۔

اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، فارس نے ایک ہی جست میں ہاتھ بڑھا کر مگ اٹھا لیا۔

جنت کا دماغ بھک سے اڑا۔

گھونٹ لیتے ہوئے اس نے جتاتی نگاہوں سے جنت کو دیکھا...... کہ لو...... اب یہ چائے تمہارے بھی کسی کام کی نہیں...... پھر کرسی کھینچ کر شاہانہ انداز میں بیٹھ گیا کہ یہاں سے جانے کا میرا بھی کوئی ارادہ نہیں۔

اس کے بعد کرسی کی بیک سائڈ کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے تیسرا گھونٹ لے کر آنکھوں سے جتایا کہ میں جیتا تم ہاری۔

اور وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کہاں وہ اس کے ہاتھ کا کھانا دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل چھوڑ دیتا تھا۔ کہاں وہ اس کے ہاتھوں سے چائے لے کر پی گیا تھا؟ یہ وقت بھی آنا تھا؟ یہ انہونی بھی ہونی تھی؟ کہیں تھپڑ سے اس کا دماغ تو نہیں ہل گیا؟

کہیں ڈاکٹر بخاری نے اسے غلط ادویات تو نہیں دے دیں؟ اسے صحیح معنوں میں تشویش ہوئی تھی۔

چائے کا خالی مگ اس کے سامنے رکھ کر وہ جا چکا تھا۔ اور وہ کتنی ہی دیر تک حیران و ششدر بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ٹھنڈی سرد ہوائیں پتوں کو ایک ایک کر کے سرسبز احاطے پر گراتی جا رہی تھیں۔ بھیگی ہوئی سڑکوں پر خاموشی تھی۔ پارک میں بھی اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

سیاہ رنگ کے ڈیزائنر ٹریک سوٹ میں ملبوس۔ سر پر ہوڈی چڑھائے، کانوں میں وائرلیس ایئر فونز لگائے وہ جاگنگ ٹریک پر تھا۔ چہرے پر بھاگنے کی وجہ سے سرخی تھی۔ تنفس پھولا ہوا تھا۔

اسے ڈاکٹر بخاری کی کال موصول ہوئی تو وہ رک گیا تھا۔ حال احوال پوچھتے ہی وہ سیدھا مدعے پر آ گئے۔

"جنت نے فون کیا تھا!"

"اچھا!" اسے حیرت ہوئی۔

"وہ ان میڈیسنز کے سائڈ ایفیکٹس کے بارے میں معلومات لینا چاہ رہی تھی جو تم استعمال کر رہے ہو!"

فارس کی بھنویں غیر محسوس انداز میں سکڑ گئیں۔

"اسے لگتا ہے، دواؤں کا اثر تمہارے دماغ پر ہو رہا ہے۔"

"واٹ؟" سامنے ہی سنگی بنچ پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر صاحب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اور آپ نے کیا کہا؟" داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اب وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

"یہی کہ غنودگی کے علاوہ اور تو کوئی سائڈ ایفیکٹس نہیں مگر وہ مصر تھی کہ تم میں Dizziness کے علاوہ بھی سائڈ ایفیکٹس ظاہر ہو رہے ہیں۔"

فارس نے بے ساختہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ بمشکل انہیں اپنی طبیعت کے حوالے سے ہر

طرح کی تسلی دینے کے بعد وہ مزید جاگنگ کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اسی وقت گھر آ گیا۔ جنت اسے لائبریری میں ملی تھی۔ کتابوں میں الجھی ہوئی۔

"یہ ڈاکٹر بخاری سے کیا کہا ہے تم نے!" سانس چڑھا ہوا...... رگیں پھولی ہوئیں...... چہرے پر سرخی...... آنکھوں میں غصہ۔

جنت نے کتاب آگے کر لی۔ اسے صبح سویرے فارس وجدان کے منہ نہیں لگنا تھا۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے؟" فارس نے کتاب جھپٹ کر میز پر پٹخ دی۔

"انہوں نے پوچھا، تم کیسے ہو؟ میں نے بتا دیا تم ٹھیک نہیں ہوا!" کمال بے نیازی سے جواب دیتی دوسری کتاب کھول کر ورق گردانی کرنے لگی۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟" تیوری چڑھا کر پوچھا۔

جنت نے جواب نہیں دیا۔

اب کے فارس نے دوسری کتاب بھی کھینچ کر ہٹا دی۔

"میرے خیال سے میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" وہ میز پر ہاتھ جماتے ہوئے جھکا۔

"میرے خیال سے میں بھی جواب دے چکی ہوں۔" جنت نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اسی لمحے اقصیٰ کتابوں کا ایک ڈھیر بانہوں میں بھرے اندر داخل ہوئی۔ "جنت آپی!"

اور اس کے آپی پلس مالکن کے میاں نے جن قہر بار نظروں سے اسے دیکھا۔ کتابیں تو بمشکل ہی اس سے گرتے گرتے بچیں۔ گڑبڑا کر وہ بہت ادب سے سر جھکا گئی۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فارس اسی وقت لائبریری سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

"فارس بھائی اتنے بھی برے نہیں ہیں جتنا کہ وہ خود کو ظاہر کرتے ہیں!" مال میں شاپنگ کے دوران سٹینڈ پر لٹکے کپڑوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آئمہ ظہیر کو دیکھا۔

"ادھر میں نے کہا، جنت! چلو شاپنگ پر چلتے ہیں، ادھر فارس بھائی نے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیا۔ مطلب کہاں سے ملتے ہیں ایسے شوہر۔ جو کہے بنا ہی بیوی کے دل کا حال جان لیں!"

لیکن جنت یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کا "حال دل" کریڈٹ کارڈ کے گرد تو ہرگز نہیں گھومتا تھا۔ وہ تو آئمہ کے ساتھ شاپنگ پر آج آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے مسز شیرازی کو اشارے کنائیوں میں سمجھانے کے کتنے جتن کیے تھے کہ وہ کسی طرح سے کوئی بھی بہانا تراش کر کہہ دیں، جنت آج نہیں جا سکتی۔ مگر بھلا ہو فارس وجدان کا جس نے اوپن کچن سے باہر نکلتے ہوئے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔

"ہاں ہاں شیور! تم لے جاؤ اسے، کوئی مسئلہ نہیں!" لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے کریڈٹ کارڈ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اجازت تو وہ ایسے دے رہا تھا جیسے وہ اس کے حکم کی ہی منتظر ہو۔ جنت سلگ کر رہ گئی تھی۔

آئمہ ظہیر کے مجبور کرنے پر وہ اس کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر فارس کی اس حرکت پر جو غصہ اسے چڑھا تھا، وہ کسی صورت کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

پہلے اس کا رویہ سمجھ سے باہر ہوا تھا، اب ہر معاملے میں اس کی مداخلت جنت کو پریشان کر رہی تھی۔

"ویسے جنت۔ ایک سوال پوچھوں تم سے؟"

"ہوں!" وہ کپڑوں کا جائزہ لیتی بس وقت ہی گزار رہی تھی۔

"فارس بھائی نے کبھی تم سے محبت کا اعتراف کیا؟" ایک لمبا سا چکر کاٹ کر، چند ایک شرٹس پسند کیے وہ دبے دبے جوش کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

جنت نے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ "محبت کا اعتراف؟"

"ہاں!"
"کیسے بھلا؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔
آئمہ نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ کیا اس کا سوال اتنا مشکل تھا کہ جنت کی سمجھ میں نہ آئے؟
"مطلب جیسے شوہر کہتے ہیں۔ تم میری زندگی ہو، سانس ہو، دل گردہ ہو، فلاں۔ فلاں۔ فلاں! یا پھر سمپل۔ آئی لو یو؟"
ایسا کوئی جملہ تو جنت کمال کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ محبت اور فارس کو ہوگی؟؟ وہ بھی جنت کمال سے!!! سابع المستحیلات!! (دنیا کے سات ناممکنات میں سے ایک!)
"کیا زندگی گزارنے کے لیے یہ اعتراف ضروری ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں ضروری ہوتا ہے۔ انفیکٹ ضروری ہونا چاہیے۔"
"محبت اعمال سے جھلکتی ہو تو اعتراف کی ضرورت نہیں پڑتی!" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ ایسی مشکل باتیں آئمہ کے سر پر سے گزرتی تھیں۔ اس نے جنت کو کچھ خفگی سے دیکھا۔ "یہ فلسفی باتیں میرے ساتھ مت کیا کرو۔"
"یہ کلر کیسا رہے گا آئمہ؟" اس نے موضوع بدلنا چاہا۔
"تم مجھے ٹھیک سے کچھ بتا کیوں نہیں رہی ہو؟" آئمہ چڑ گئی۔
وہ ٹھیک سے کچھ بتائے بھی تو کیسے!؟ جب کچھ بھی سرے سے ٹھیک ہی نہ ہو۔؟
"آخر تم مجھ سے سننا کیا چاہتی ہو؟" اس نے اکتا کر کہا۔
"مطلب فارس بھائی کو دیکھ کر لگتا تو نہیں ہے کہ وہ ذرا سے بھی رومانٹک ہوں گے۔ لیکن......"
"میری پیاری آئمہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کچھ دیر کے لیے فارس نامہ بند کر دیں!" بات کرتے ہوئے اس کی نظر آئمہ کے عقب میں ایک اجنبی شناسا سا چہرے پر پڑی۔ سجے سجے قدم اٹھاتی ایک اسٹائلش سی لڑکی ان کے پاس آکر رک گئی تھی۔
"ہائے!" دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ جنت کی نگاہوں کے تعاقب میں آئمہ نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا، لبوں کی مسکراہٹ سمٹی، چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔
"پہچانا مجھے؟ غالباً ہماری یشال کی منگنی پر ملاقات ہوئی تھی!" جینز پر سلیولیس فل نیک شرٹ میں ملبوس، بالوں کا میسی بن بنائے، بغیر کسی میک اپ کے وہ عام سے حلیے میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ حسین تو وہ اتنی تھی کہ آس پاس گزرتے لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے تھے۔
"جی! بہت اچھی طرح سے!!" اس کا رویہ، لہجہ اور تلخ جملے جنت بھولی نہیں تھی۔ تب ہی اس نے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔
"اوہ ہائے آئمہ۔ کیسی ہو؟" اپنا ہاتھ نیچے کر کے، اب کے وہ آئمہ ظہیر سے مخاطب ہوئی تھی جو کاٹو تو لہو نہیں کی عملی تصویر بنی کھڑی تھی۔ "تم ہی تعارف کروا دو۔ غالباً یہ تو مجھے جانتی ہی نہیں ہے۔"
"چلیں جنت!" آئمہ نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے مڑ گئی۔ اس کی انگلیوں کی لرزش جنت کو اپنے بازو پر واضح محسوس ہوئی تھی۔
"تم جانتی ہو، اس لڑکی کو؟ کون تھی؟" مال سے نکل کر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
"ہے کوئی۔" آئمہ کا انداز سرسری تھا مگر چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی حکایت سنا رہے تھے۔
"یشال کی منگنی پر یہ تم سے ملی تھی؟" چند لمحوں کے بعد اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا تھا۔
"ہاں!"
آئمہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔
"کیا۔ کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے سنبھل کر

پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اسے یشال کی منگنی پر ہونے والی وہ تلخ ملاقات کسی صورت بھولتی نہیں تھی۔

"دوبارہ بھی تم سے بات کرنے کی کوشش کرے تو مت کرنا۔ اچھی لڑکی نہیں ہے یہ!" مختصر کہہ کر آئمہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جنت کمال آنکھوں میں نا سمجھی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

عدیل احمد نے ویڈیو ای میل کر دی تھی۔ نوٹیفکیشن موصول ہوتے ہی فارس نے ویڈیو پلے کر دی۔ اسکرین پر منظر واضح ہو چکا تھا۔

اس کی گاڑی پارکنگ ایریا میں اس مقام پر کھڑی تھی جہاں آمد و رفت کم تھی۔ عقب میں مین روڈ تھا جس پر اکا دکا گاڑیاں ہی گزرتی دکھائی دے جاتی تھی ورنہ روڈ سنسان ہی تھا۔

جس وقت وہ گاڑی سے ٹیک لگائے جنت سے بات کر رہا تھا، اس وقت دوسری رو میں سفید کرولا گاڑی کے پیچھے کوئی موجود تھا۔

جب وہ گاڑی نکال کر وہاں سے جا چکا تو اس سے کچھ ہی دیر بعد موبائل پر فون کرتی جنت کے عقب سے وہ نمودار ہوا تھا۔ پھر اس نے جنت کے قریب آ کر کچھ کہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے گھومی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں وہ اسی سرعت سے جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کے داہنی کلائی اس شخص کی گرفت میں آ گئی۔ چوڑیاں چرمرا کر ٹوٹی تھیں۔

بے ساختہ ہی فارس وجدان کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔ مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

جنت نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کی تھی۔ اس کے انداز سے واضح تھا، وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ غیر آباد حصہ تھا۔ اس طرف کوئی تھا بھی نہیں جو اس کی مدد کو آ جاتا۔

وہ اسے کھینچتے ہوئے لے جانے لگا۔ ساتھ ہی کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے یک دم ہی جنت نے اس کا منہ نوچ لینا چاہا۔ ناخن کے نشان گال اور گردن پر پڑے۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے جنت کے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔ وہ نیچے جا گری۔ عین اسی لمحے سائرہ خالہ کا بیٹا فیصل آ گیا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند اور لوگوں کا مجمع بھی اکٹھا ہو گیا۔

اس نے جنت کمال کو اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی تھام کر اٹھتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ویڈیو روک دی۔

کتنے لمحے بیت گئے۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔

پھر وہ کرسی چھوڑ کر اٹھا تھا۔ راہداری میں بھاری قدم اٹھاتے ہوئے، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کا رخ کرتے وقت اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی ثقیل شے اس کے سینے پر آن پڑی ہو۔ جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

کمرے کا دروازہ دھکیل کر وہ اندر آیا تو وہ سامنے بیٹھی تھی۔

سر تک لحاف تانے صوفے پر سمٹ کر بیٹھی لیپ ٹاپ پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ پاپ کارن کا پیکٹ ہاتھوں میں تھا۔ ڈرائے فروٹس کی پلیٹ۔ چاکلٹس۔ چائے کا کپ۔ کافی ٹیبل پر رکھے تھے۔ انہماک سے کوئی سین دیکھتے آنکھوں میں اشتیاق تھا اور لبوں پر تبسم۔ ایزی ہو کر بیٹھی تھی وہ۔ لاپروائی لیے ہوئے انداز تھا اس کا۔ جیسے کچھ دیر پہلے تک ان کے مابین کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے بیس پچیس روز پہلے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ جیسے اس کے چوڑیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ زخم نہیں آیا تھا۔ جیسے لاوارث سمجھ کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

"تم نے فارس کو بتایا نہیں؟"

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔"

وہ ساکت صامت اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اطراف سے یکسر بے نیاز کسی سین پر بے ساختہ مسکرا

رہی تھی۔

"مجھے گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان! میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ اور پھر خود اٹھ کر بھی گئی تھی۔ اب بھی اگر گروں گی تو اٹھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔"

اور تب ہی نگاہوں کی تپش کا احساس کرتے ہی جنت نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات سے لمحے بھر کے لیے وہ چونک سی گئی۔

"غلطی تو میری ہی ہے نا! فارس نے تو کہا تھا کہ ساتھ ہی چلو، میں نے ہی ضد کی کہ سدرہ کا ولیمہ اٹینڈ کر کے ہی جاؤں گی۔"

لیکن اگلے ہی پل آنکھوں میں خفگی لیے اس نے بھنویں سکیڑ کر چہرے کا رخ بدلا اور لیپ ٹاپ اسکرین پر نگاہیں جمائیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ کمرے سے چلا گیا تھا۔

جنت کمال کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ جو میسج اور وائس ریکارڈنگ اس نے پچیس روز قبل پارکنگ ایریا میں فارس وجدان کو روتے ہوئے بھیجی تھیں وہ آج "سین" کر لی گئی تھیں۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹیبل پر مسز شیرازی نے فارس وجدان کی خاموشی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ ایک تو وہ خاصی تاخیر سے آیا تھا، اوپر سے تھا بھی عام حلیے میں۔ گویا آج اس کا آفس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے جنت نے بیساختہ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ رتجگے کی گواہی دیتی آنکھوں میں تکان اتری تھی۔ معمول کے مطابق نہ وہ اپنے ٹیب پر ہیڈ لائنز دیکھ رہا تھا نہ ہی مسز شیرازی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ نیلی جینز پر سیاہ جرسی نما شرٹ میں ملبوس۔ سرخ مفلر کو گردن کے گرد ڈھیلے انداز میں ڈالے وہ زچ کرنے کو اسے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"فارس!"

"میں ٹھیک ہوں ممی!" اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"آج آفس نہیں جاؤ گے؟" مسز شیرازی نے پوچھا۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گھونٹ بھرا۔

"مجھے کام سے کہیں جانا ہے۔"

مسز شیرازی نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ مگر اس کے تاثرات کی وجہ سے ان کی تسلی اب بھی نہ ہوئی۔ لیکن انہوں نے مزید سوال نہیں پوچھے۔

"میڈیسن تو لے رہے ہو نا! کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔"

اب کے فارس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بالکل کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

چائے کا خالی کپ رکھ کر وہ چلا گیا تھا۔ ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔

مسز شیرازی نے فکرمندی سے اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ دل نہ جانے کیوں اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ جنت کچھ اور۔ فارس کچھ اور۔

"وہ ساری رات جاگ کر آفس کے کام نمٹاتا رہا ہے!" انہیں پریشان دیکھ کر جنت نے فوراً سے بات سنبھالی۔

مسز شیرازی نے چونک کر اسے دیکھا۔ لمحے بھر کے لیے ان کی آنکھوں سے تشویش غائب ہوئی۔ یقیناً وہ کچھ اور سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ جنت نے ان کے داہنے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ مسز شیرازی کی پریشانی حماد کے بیٹے سے متعلق تھی۔ پس پردہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ماں بیٹے کے درمیان بے نام سی خاموشی حائل کر دیتی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ انہیں معمول کی طرح لان میں لے آئی تھی۔ اور تب ہی اس نے فارس وجدان کو صدر دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سرعت سے قدم اٹھاتا پورچ کی طرف جا رہا تھا۔ انداز میں عجلت نمایاں تھی۔ ریموٹ۔ کی سے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے رک کر سرسری سے انداز

میں موبائل اسکرین پر کچھ دیکھا پھر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

جنت سر جھٹک کر مسز شیرازی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ جواب بھی آنکھوں میں فکر اور الجھن لیے فارس کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ کافی تاخیر سے گھر آیا تھا۔ جنت جو اس کی آمد سے پہلے تک مسز شیرازی کے نمبر سے مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی یک دم لاتعلق ہو گئی۔ وہ سیدھا ان کے کمرے میں چلا گیا تھا جو بر وقت فون پر رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔ جنت دروازے میں ہی کھڑی تھی جب وہ ان کے پاس بیٹھ کر مدھم آواز میں انہیں بتا رہا تھا کہ اسے ضروری کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑ گیا تھا۔

آنکھیں اب بھی گلابی تھیں۔ تھکاوٹ انگ انگ سے عیاں۔ کھانا وہ باہر سے کھا کر ہی آیا تھا سو آرام کی غرض سے وہ معذرت چاہتے ہوئے فوراً ہی اٹھ گیا تھا۔ جنت کمرے میں آئی تو وہ کپڑے بدل کر لائٹس آف کیے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ گویا اس وقت اسے مکمل خاموشی اور سکون کی خواہش تھی۔ اپنا موبائل اٹھائے جنت احتیاط سے دروازہ بند کرتی باہر آ گئی تھی۔ عین اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔ سائرہ خالہ کی کال تھی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''السلام وعلیکم خالہ۔ کیسی ہیں آپ؟'' اس کا رخ ٹیرس کی طرف تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں جنت! تم کیسی ہو؟ سوتو نہیں گئی تھیں؟''

''نہیں، ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ شال اپنے گرد ٹھیک سے اوڑھنے لگی۔

''آپ سنائیں، سب خیر ہے نا؟''

''خیر تو ہے لیکن وہ زمان ہاسپٹل میں ہے۔''

گو کہ اسے زمان نامی شخص میں سرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی جس طرح خالہ نے خبر سنائی تھی وہ چونکی ضرور تھی۔

''ہاسپٹل میں۔ مگر کیوں؟''

''کسی نے اسے بہت بری طرح سے مارا پیٹا ہے۔ ٹانگ۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گئے ہیں۔''

جنت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میں ابھی ہاسپٹل سے آ رہی ہوں۔ اللہ نے کرم کیا، بچت ہو گئی ورنہ جس حالت کو وہ پہنچا ہوا ہے۔ بس۔''

آنکھوں میں تعجب لیے وہ ٹیرس کی طرف جانے کا ارادہ ترک کیے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''مگر یہ سب ہوا کیسے؟ کچھ بتایا اس نے؟''

''آفس سے واپسی پر دو گاڑیوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ چار پانچ لوگ تھے۔ انہوں نے اس پر تشدد کیا ہے۔ لیکن وہ کون لوگ تھے، زمان کچھ بتا نہیں رہا۔ پولیس میں رپورٹ درج بھی نہیں کروانے دی۔''

واقعہ افسوس ناک تھا مگر اندر ہی اندر اسے بے انتہا خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اور اس خوشی کا اظہار وہ چاہ کر بھی سائرہ خالہ کے سامنے نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

صبح کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا۔ اپنے شاندار بیڈ روم کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سے اس نے پردے کھینچ کر ہٹا دیے تھے۔ گلاس ڈور سلائڈ کر کے، بالکنی پر جھک کر اس نے وسیع رقبے پر پھیلے سرسبز لان کو دیکھا۔ نگاہیں پھولوں کی کیاریوں اور جگہ جگہ پر بنے فواروں سے ہوتی ہوئی بیرونی دیواروں پر جھکے املتاس کے درختوں پر ٹھہر گئیں۔ دھوپ چہار سو بکھری تھی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا۔

کھلی فضا میں گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ نظر جنت کمال پر جا ٹھہری۔ وہ مسز شیرازی کے ساتھ لان میں موجود تھی۔ ہشاش بشاش اور ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ ان کے سامنے لان چیئر پر سر اٹھائے بیٹھی تھی۔

مسز شیرازی کے آگے ایزل پر سفید کنونیس موجود تھا۔ سائڈ ٹیبل پر بے شمار آئل پینٹنگ ٹیوبز پڑی تھیں۔

پیلٹ اور ایک برش ان کے ہاتھوں میں تھا اور بقیہ برشز کے ڈھیر سامنے پڑے تھے۔

اس نے پہلے اپنی ماں کو اور پھر ان رنگوں کو دیکھا جو کبھی ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے تھے۔ اور اس کنونیس کو دیکھا جس پر وہ پروفیشنل انداز میں رنگ بکھیرنے لگی تھیں۔ ساتھ ہی وہ جنت کو بھی دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھیں جو ہاتھ ہلا ہلا کر مسلسل بولے جا رہی تھی۔ سامنے بیٹھنے کے انداز سے ہی واضح تھا کہ وہ اسے ہی کنونیس پر اتارا جا رہا ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا خوش لگ رہی تھی۔

کتنی ہی دیر تک وہ ان پر نظر جمائے اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔

"آپ کو کتنا وقت لگے گا مجھے پینٹ کرنے میں؟" اور نیچے۔ بہت نیچے چہرے پر مسرت کے رنگ لیے جنت نے مسز شیرازی سے پوچھا تھا۔

"اس ہاتھ کے ساتھ تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی!" انہوں نے سرخ اور سفید رنگ کو پیلٹ پر مہارت سے مکس کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں ہر پانچ منٹ کے بعد اٹھ کر دیکھ لیا کروں کہ آپ نے کتنا بنا لیا ہے؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" مسز شیرازی نے منع کر دیا۔

بے صبری جنت کا وہ وقت بڑی مشکل سے گزرا، آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ مکمل بنا چکیں تو انہوں نے ایزل کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

مسز شیرازی نے اسے حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے گلاب پینٹ کیا تھا۔ جس کے رنگوں کا امتزاج ایسا ہی تھا جیسے برف نے آگ پکڑ لی ہو۔

"میں چہرے پینٹ نہیں کرتی جنت!! لیکن یہاں میں نے تمہیں ہی پینٹ کیا ہے!!"

گیلی آنکھوں کے ساتھ وہ کافی دیر تک گلاب کو دیکھتی رہی۔ برف کو پکڑتی آگ۔ یا آگ میں ہی ضم ہوتی برف۔

پھر سر اٹھا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ "یہ میں ہی ہوں؟ ہے نا؟"

"جنت ہو! پھولوں جیسی ہی نظر آتی ہو۔" انہوں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے نانا میرا نام وردہ یعنی گلاب کا پھول رکھنا چاہتے تھے۔" کچھ یاد کر کے وہ انہیں بتانے لگی۔ "کیونکہ میری پیدائش سے چند روز پہلے انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ ایک سرسبز باغ ہے، جس میں بے شمار پھول ہیں۔ اور دو پرندے ہیں۔ جن میں سے ایک ان کی جھولی میں آ گرتا ہے۔" اس نے رک کر کچھ سوچا، "نانا کا ایک دوست تھا۔ جس نے انہیں جنت نام بتایا اور تب نانا کو لگا کہ جنت میں تو جیسے ہر طرح کے پھول سما جاتے ہیں۔ انہیں یہ نام میرے لیے بہت اچھا لگا اور انہوں نے میرا نام جنت رکھ دیا!" مسز شیرازی مسکراتے ہوئے اسے خاموشی سے سنتی رہیں۔

"اب آپ اور کیا پینٹ کریں گی؟" اس نے پوچھا۔

"شاید۔ اسے......" انہوں نے جنت کے عقب میں آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فارس وجدان فون پر بات کرتے ہوئے پورچ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ فارس کو ذہن میں رکھ کر مسز شیرازی کیا پینٹ کریں گی؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آگ، شعلے؟ آندھی، طوفان؟ برفیلے پہاڑ؟ ہاں وہ جنت کے لیے ایسا ہی تھا۔ اس کی شخصیت کو ایسے ہی کسی مناظر میں سمویا جا سکتا تھا۔

"چلیں اب آپ کچھ ریسٹ کر لیں!" اس نے میز سے کتاب اٹھا لی۔ اور پھر وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔

☆☆☆

وہ آتشدان کے سامنے ایزی صوفہ پر ٹانگیں سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ شال سے کچھ نظر آ رہا تھا تو

اس کی آنکھیں۔ شہد جیسی۔ گہری۔ پرکشش آنکھیں۔ جن کی پلکوں پر نمی ٹھہری تھی۔

گلاس ٹیبل پر ڈائری، کتاب، قلم اور شیٹس بھی رکھی تھیں۔ موبائل بھی پاس ہی پڑا تھا۔ مسز شیرازی کا دیا ہوا ٹاسک جیسے مکمل ہونے کو تھا۔ وہ بہت قریب تھی جواب سے۔ تقریباً پا ہی چکی تھی۔ لکھ کر نوٹس بھی بنا لیے تھے۔ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق زندگی کے بہت سے معاملات کو بھی اس آیت کی نگاہ سے دیکھ کر جان چکی تھی۔ لیکن پھر بھی۔ "سِرا" وہیں تھا۔ وہ ابھی تک اس کی گہرائیوں میں اتر نہیں پائی تھی۔ حروف کے راز معانی سمیت ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

سب سے اوپر جو صفحہ رکھا تھا اس پر کچھ آیات کے پرنٹ آؤٹس تھے۔ جیسے کہ حضرت زکریا علیہ السلام، اور زوجہ ابراہیم علیہ السلام کی آیات تھیں۔ وہ پہلے بھی انہیں کافی دیر تک دیکھتی رہی تھی۔ اب بھی اپنی نگاہیں ان آیات پر جمائے بیٹھی تھی۔

موضوع ایک ہی تھا۔ سقم۔ عقیم۔ بانجھ ہونا۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی، آیات بانجھ جیسے نقص کو کیسے واضح کرتی ہیں۔ پھر اس نقص کو رد کر کے اسے مکمل کیسے کرتی ہے۔

وہ یہاں سوچوں میں گھری بیٹھی تھی اور نیچے اقصیٰ کافی کے دو مگ اٹھائے دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" فارس وجدان نے اسے راہداری میں ہی روک دیا تھا۔ وہ کام نمٹا کر اسٹڈی روم سے ابھی باہر آیا تھا۔

"وہ جنت آپی نے کہا کہ وہ بور ہو رہی ہیں تو۔"

"تو تم نے سوچا کہ کچھ کرتب دکھا دیتی ہوں تاکہ وہ انٹرٹین ہو سکے!"

اقصیٰ نے گڑبڑا کر اسے دیکھا پھر اسی سرعت سے سر ہلا کر جھکا گئی۔ یہ فارس صاحب بھی نا۔ اب میں کوئی کرتب دکھانے والی لگتی ہوں؟ حالانکہ اس کے ابا کہتے تھے کہ ان کے صاحب بڑے سلجھے ہوئے، سوبر اور ڈیسنٹ ہیں۔

ذرا سا سر اٹھایا۔ "میں جاؤں صاحب! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"ادھر لاؤ۔"

"جی!" وہ ہونق پن سے دیکھ کر رہ گئی۔

فارس نے ہاتھ بڑھا کر مگ لے لیا۔

"اب جاؤ!" گھونٹ بھرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

اقصیٰ دیکھ کر رہ گئی۔ "یہ جنت آپی کو دینی تھی۔" اس کا اشارہ دوسرے مگ کی طرف تھا۔ فارس نے وہ بھی لے لیا۔

چار و ناچار اقصیٰ کو فوراً مڑ کر جانا پڑا۔

وہ سٹنگ روم میں داخل ہوا تو جنت نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ کافی کا مگ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر وہ سامنے سنگل صوفے پر براجمان ہو گیا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے میز پر بکھرے کاغذات پر سرسری سی نگاہ دوڑانا چاہی مگر جنت نے کسی چیل کی طرح اپنی ساری چیزیں جھپٹ کر اٹھا لیں۔ آنکھوں میں "خبردار" کا نوٹس لہرانے لگا۔ وہ ایزی ہو کر گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتارتا رہا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز رہیں۔

"ڈائیوورس کے بعد تمہارے کیا پلانز ہیں؟" انداز سرسری سا تھا۔

جنت نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ شدید حیرت اور بے یقینی سے۔

"اور سوال پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟" پھر سنبھل کر، ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"وہی جس کے مرنے سے تم بیوہ ہو سکتی ہو۔"

جنت نے سٹپٹا کر اسے دیکھا پھر زیرلب بڑبڑا کر رہ گئی۔ اب اس بات کو یہ کبھی بھولے گا بھی یا نہیں؟ اس نے جھنجھلا کر مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ صوفے کی پشت سے کمر ٹکائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ فل نیک سویٹر کی زپ سینے تک کھنچی ہوئی تھی۔

''میں یہ سوال صرف ممی کی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔'' اسے گہری جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے گھونٹ لیا۔ ''تم بہت خاص ہو ان کے لیے۔اس لیے۔''

''ہاں ان کے لیے ہوں! تمہارے لیے تو نہیں! سو تم اس طرح کا سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔تمھارے لیے بس یہی بات اہم ہونی چاہیے کہ تم نے مجھے کھائی سے دھکا دینا ہے۔اب نیچے گرتے ہوئے میں پتھروں سے ٹکرا کر مرتی ہوں، یا نہر میں ڈوب کر۔یا پھر زندہ بچ کر جاتی ہوں۔اٹ ازنن آف یور کنسرن!''

''اٹ از مائی کنسرن!'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''اگر تم زندہ بچ کر گئیں تو؟''

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔اگلے ہی لمحے اس کے لب بھنچ گئے۔آنکھیں سرخ ہو گئیں۔اس عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی زبان ہی ہے جو ہر بار فارس وجدان کے سامنے اس کا تماشا بنا دیتی ہے۔

''اللہ کے فضل سے بہت سے بیک اپ پلانز ہیں میرے اور سب ہی مثبت ہیں۔نہ میرا سر پھٹے گا۔نہ میں ڈوب کر مروں گی۔''

''میں نے کب کہا، تمھارے ساتھ ایسا ہونا چاہیے؟'' وہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''دیکھو!'' جنت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بے حد تحمل سے مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔لیکن......!

''یہ نکاح ایک کانٹریکٹ ہے، یہ کانٹریکٹ ہی رہے گا، میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے، کیا اب تم دیکھ نہیں رہے میں، اب اپنی لمٹس میں ہوں۔''

''تمہیں اپنی لمٹس میں آنے میں تین ماہ لگ گئے، میں تین دن میں سب بھول جاؤں؟''

جنت اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔

''تم کیا چاہتے ہو، میں تمہیں لکھ کر دوں؟ تب جا کر تمہیں یقین آئے گا؟'' وہ زچ ہوئی تھی۔

''ہاں! تمہارا کیا بھروسا بعد میں صاف مکر جاؤ۔''

''میں ایسی نہیں ہوں۔'' ضبط کر کے کہا۔

''یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا؟'' لہجے میں تمسخر گھل گیا۔

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔کیسے لفظوں میں الجھا کر وہ اس کی درگت بنا دیتا تھا اور وہ کیسے پاگلوں کی طرح ہر بار اس کے جال میں پھنس جاتی تھی۔ یکا یک ہی اسے شدید قسم کا غصہ چڑھا۔وہ اس پر پھٹ پڑی۔''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ ہاں؟''

''وہی جس کے مرنے سے۔''

جنت نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔''میں کچھ نہیں سن رہی! مجھے کوئی آواز نہیں آ رہی!! لالالالالالالالالالالا......'' ساتھ ہی اس نے اتنا شور مچایا تا کہ فارس کی آواز اس تک نہ پہنچے۔ پھر غصے سے جھنجلاتی اپنے کاغذات سمیٹتی سٹنگ روم سے ہی نکل گئی۔کافی تو اس کی ویسے بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ مزید کی طلب بھی نہ رہی تھی۔

فارس نے ہاتھ بڑھا کر وہ صفحہ اٹھا لیا جسے وہ جلد بازی میں چھوڑ کر گئی تھی۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ پڑھ پاتا۔ جنت نے پیچھے سے جھپٹ لیا۔

''اپنے کام سے کام رکھو!''

''یہ بات کہہ کون رہا ہے؟'' مذاق اڑاتا ہوا لہجہ۔وہ مزید سلگتی وہاں سے واک آوٹ کر گئی۔

☆☆☆

اس نے وارڈ روب کھول کر اپنے تمام فینسی رنگ برنگے ملبوسات کا جائزہ لیا۔پھر نچلا خانہ کھول کر جیولری باکس نکالے۔نکاح نامہ اور حق مہر کا چیک بھی نیچے ہی موجود تھا۔فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھی وہ نکاح نامے کو کافی دیر تک دیکھتی رہی۔پھر اس نے ایک ایک کر کے وہ جیولری باکس نکالے جو مسز شیرازی نے اسے دیے تھے۔وہ زیورات جو شیرازی

خاندان کی بہوؤں کا مقدر ٹھہرتے تھے۔
کچھ دیر وہ خیالات میں غرق اپنی تمام چیزوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ فارس ان کے سامنے اپنی حالیہ پوزیشن، اپنے حالیہ مقاصد واضح کرلینے کا فیصلہ۔
ایک بات تو طے تھی۔ اب ان کے مابین کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ وہ اسے اپنانے کو تیار تھا اور نہ ہی جنت کمال اب ایسا کچھ چاہتی تھی۔
وہ جان گئی تھی اس کا گھر کبھی نہیں بسے گا۔ طلاق ہر بار مقدر ٹھہرے گی۔ بددعائیں تیر کی طرح تھیں۔ ٹھیک نشانے پر ہی آ کر لگتی تھیں۔ اور اسے اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس جیسی لڑکی کسی گھر کی زینت، کسی مرد کی عزت نہیں بن سکتی۔ وہ ایک "مجبوری" تھی۔ اسے برہان نے بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا رویہ رکھا تھا۔ فارس بھی اب یہی کررہا تھا۔ سوایسے میں موجودہ صورت حال سے سمجھوتا ضرور کیا جاسکتا تھا مگر وہ خود کو ایک بار پھر حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ایک فیصلہ وہ خود بھی کرنا چاہتی تھی۔ ایک راستہ وہ اپنے لیے بھی رکھنا چاہتی تھی۔
اسٹڈی روم کے دروازے پر مدھم سی دستک دے کر اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیپ ٹاپ کی پر متحرک فارس کی انگلیاں یک دم ساکت ہوئی تھیں۔ بے ساختہ سر اٹھا کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس وقت کون مخل ہوا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے جنت کمال پر نظر پڑتے ہی وہ رک سا گیا۔
وہ کسی ملازم کی آمد کی توقع ضرور کررہا تھا مگر جنت کی نہیں۔
آنکھوں میں خفگی۔ رگیں تنی ہوئی۔ لب بھینچے ہوئے۔ سر اٹھا ہوا۔ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے فارس نے بڑی فرصت سے اس کا انداز ملاحظہ فرمایا تھا۔
اس کے ہاتھوں میں کچھ جیولری باکس تھے جو اس نے آفس ٹیبل پر رکھ دیے۔
فارس نے ایک نظر ان باکس کو دیکھا۔ پھر اسے۔ لب باہم پیوست تھے مگر آنکھوں میں سوال تھا۔ کہ یہ کیا ہے؟ یہ کس لیے ہے؟
"آنٹی نے مجھے نکاح پر جیولری دی تھی۔" اس نے سارے جیولری باکس کھول کر سونے کے زیورات اسے دکھائے۔
"اور یہ حق مہر۔" اس نے دس لاکھ کا چیک اس کے سامنے رکھ دیا۔ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ اب بھی بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"مجھے کیوں دے رہی ہو؟"
"رکھوں بھی تو کس لیے؟" اس نے الٹا سوال کیا، "یہ نہ ہو، بعد میں تم حساب کتاب کے لیے سائرہ خالہ کے پاس پہنچ جاؤ۔ اس لیے سارے معاملات ابھی سے کلیئر کررہی ہوں۔" گویا اسے اپنے کاغذی شوہر سے اچھائی کی کوئی امید نہیں تھی۔
"حق مہر کے پانچ لاکھ میرے بنتے ہیں لیکن میں تمہیں پورے دس واپس کررہی ہوں۔ اب یہ میں اس لیے نہیں کررہی ہوں کہ تمھاری نظر میں کوئی دیوی شیوی بن سکوں، بھئی، جب شادی ہوئی ہی نہیں ہے تو۔" وہ وضاحت دینا چاہ رہی تھی۔ اور یہ وضاحت الٹا اس کے گلے پڑ رہی تھی۔
فارس نے بند مٹھی ہونٹوں پر ٹھہرالی تھی۔ جنت کو جانے کیوں لگا، اس نے مسکراہٹ ضبط کی ہو۔ لیکن وہ مسکرائے گا کیوں؟ ایک لمحے کے لیے وہ الجھی تھی۔ اب انسان اپنی فتح پر نہیں مسکرائے گا تو کیا روئے گا؟ دماغ نے ٹوکا۔
وہ مسکرائے۔ روئے۔ ہنسے۔ بھاڑ میں جائے۔ اس نے خیالات کو جھٹک کر اپنی بات مکمل کی۔
"اگر ہماری واقعی میں شادی ہوئی ہوتی اور ہم نے اس رشتے کو نبھایا بھی ہوتا تو میں ہرگز ہرگز معاف نہ کرتی۔ لیکن اب سچویشن کچھ اور ہے اس لیے مجھے یہی مناسب لگ رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو

تم ہر ماہ میرے بینک اکاؤنٹ میں نان ونفقہ کے طور پر رقم ٹرانسفر کر دیتے ہو، وہ میں نے ان تین ماہ میں ایک بار بھی استعمال نہیں کی ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تم کہتے پھرو کہ میں تمھارے لاکھوں روپے اڑاتی رہی۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے فارس کو دیکھا۔ اس کی ذہین آنکھوں کے تاثر سے وہ کچھ نروس سی ہوئی۔ وہ اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ خاموشی اور یکسوئی سے سن بھی رہا تھا۔ ایسا بھی ہونا تھا؟

"خیر!" اس نے اس لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا جو اس کے گال پر پھسل نہیں رہی تھی۔

"مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔ تمھیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جا سکے۔ لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔ مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی اور اس کے بعد سمجھ جاؤں گی کہ مجھے طلاق ہو چکی ہے۔ سو تمھیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ مجھے اس ایک ماہ کے اندر اندر طلاق ہو جانی چاہیے۔"

ایک لمحے کو رک کر اس نے یہاں وہاں نگاہ دوڑاتے کچھ سوچا۔ کہ کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا؟

"لمبی چوڑی تمہید باندھ کر اور اس طرح جیولری اور حق مہر کی رقم واپس کر کے تم کیا یہ ثابت کرنا چاہ رہی ہو کہ تمھارے لیے پیسے اہم نہیں ہیں؟ ریئلی؟ یو وانٹ می ٹو بلیو ان دس ربش؟"

جنت ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"خود کو بہت اچھا ثابت کرنے کے لیے ایک اور ڈرامہ۔ کہ دیکھو مجھے تمھاری دولت کی کوئی چاہت نہیں ہے۔ نہ نام اور سٹیٹس کی۔ میرے لیے بس تم ہی کافی ہو۔ اور دیکھو، میں کتنی اچھی ہوں کہ سب کچھ واپس کر رہی ہوں۔ بھلا مجھ جیسی فرشتہ صفت لڑکی تمھیں اور کہاں ملے گی۔"

ٹھیک ٹھاک بے عزتی تھی۔ جنت کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا۔

"تمھیں کیا لگ رہا تھا کہ اس طرح میں بہت ایمپریس ہو جاؤں گا!!! اور مجھے لگے گا کہ یہی ہے وہ محبت کرنے والی وفا شعار لڑکی جسے میری دولت، وجاہت، اسٹیٹس سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہے اور"

جنت کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ساری برداشت ختم ہو گئی۔ جیولری باکس اٹھا کر اس کے سر پر مارتے مارتے وہ یک دم رک گئی۔

وہ دلچسپ نظروں سے دیکھتا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

"یو نو واٹ! مجھے اپنا حق مہر چاہیے۔ پورے پانچ لاکھ۔" زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چیک جھپٹ کر اٹھا لیا۔

فارس کے لبوں پر مبہم سا تبسم ابھرا۔ "میرے لیے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چاہو تو پورے دس لاکھ رکھ لو۔ آئی ریئلی ڈونٹ کیئر!"

"کیوں رکھ لوں؟ بھکاری سمجھ رکھا ہے؟ پانچ لاکھ سے ایک روپیہ کم یا زیادہ نہیں لوں گی۔ سارے پیسے نکلوا کر انہیں آگ لگا دوں گی مگر تمھیں معاف نہیں کروں گی۔ اور یہ جیولری۔" شدید غصے کے عالم میں باکس اٹھا کر فارس کی پہنچ سے دور کیے گئے۔ "آنٹی نے دیے تھے۔ آنٹی کو ہی واپس کروں گی۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ......"

فارس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جنت فق چہرے کے ساتھ اپنی جگہ پتھر ہوئی کھڑی رہ گئی۔ وہ ہنس رہا تھا؟ وہ اس پر ہنس رہا تھا۔ اس کی بے بسی پر؟ اس کا مذاق اڑا کر؟ تماشا بنا کر اب وہ ہنس رہا تھا؟

اگلے ہی لمحے آگاہی کا وہ لمحہ اس پر پہاڑ بن کر ٹوٹا۔ اور اسے احساس ہوا۔ فارس وہ حکایت ہی تو اسے پڑھ کر سنا رہا تھا جسے وہ پچھلے تین ماہ سے لکھتی رہی ہے۔ وہ بھی تو وہی کر رہا تھا جو وہ خود کرتی رہی ہے۔ اس نے بھی تو زچ کیا تھا اسے۔ زبردستی کسی مصیبت کی طرح مسلط رہی تھی۔ اور پھر وہ کیسے بھول

سکتا ہے کہ وہ مسز شیرازی کے توسط سے ہی اپنی مرضی ومنشاء سے اس گھر میں رہتی رہی ہے۔ اسے یکا یک ہی ادراک ہوا، وہ اپنا بویا کاٹ رہی ہے۔ اسے سزا ملنی ہی تھی۔ فارس کی خاموشی نے کبھی تو آواز میں ڈھلنا ہی تھا۔ وہ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے تو وہ اس کی کمزوری کا حظ کیوں نہیں اٹھائے گا؟

وہ اس پر نگاہ جمائے کئی لمحوں تک ساکت کھڑی رہی۔ اس نے پہلے کیوں نہیں سمجھا؟ پہلے کیوں نہیں جانا؟

''تمہیں اب یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کافی دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تو اس کا لہجہ کافی سے زیادہ سختی لیے ہوئے تھا۔

''ہمارا نکاح ایک کانٹریکٹ ہے۔ اور یہ کانٹریکٹ ہی رہے گا۔ میں اس حقیقت کو بدلنے کی کوشش اب کبھی نہیں کروں گی۔'' پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اس نے اپنے ارادے فارس وجدان پر واضح کر دیے تھے۔

''جس طرح تم آنٹی کے لیے خوش گوار شادی ہونے کا ناٹک کر رہے ہو نا۔ اسی طرح میں بھی صرف ان کی وجہ سے یہاں رکی ہوئی ہوں۔ اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ جب جانے کا وقت آئے گا میں خاموشی سے چلی جاؤں گی۔ اس لیے تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دوٹوک انداز میں تنفر سے کہہ کر وہ اسی وقت آفس سے نکل گئی تھی۔

تیزی سے کرسی چھوڑ کر فارس عجلت میں قدم اٹھاتا اس کے پیچھے آیا تھا۔ بیچ راہداری میں ہی اس نے کندھوں سے پکڑ کر جنت کا رخ موڑا۔ وہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ پھر یاد آیا یہاں غصہ کرنا بنتا ہے۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟'' کندھے جھٹک کر پھنکاری۔

''مسئلے کا حل ہے۔ اب تم حق مہر کی پوری رقم اپنے پاس رکھ سکو گی!''

چھناکے سے جنت کے اندر کچھ ٹوٹا۔ کرچیاں آنکھوں میں سما گئیں۔

''مگر کانٹریکٹ کی حقیقت کبھی نہیں بدلے گی۔'' وہ کہہ کر جا چکا تھا اور جنت کمال جیولری باکس اور حق مہر کی رقم لیے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اوائل جنوری کی دھند آلود شب تھی۔ ہر طرف سناٹوں کا راج تھا۔ وہ سٹنگ روم میں فلور کشن پر ٹانگیں سمیٹے خاموش بیٹھی تھی۔ اطراف میں زرکار روشنی کا ہلکا سا تاثر پھیلا تھا۔ سامنے گلاس وال پر ابھرتی اس کی شبیہہ ادھوری تھی۔ آدھا چہرہ عیاں تھا تو آدھا تاریکی سے الجھتا ہوا۔

اس نے ذلالت کے کئی روپ دیکھے تھے۔ مگر یہ نہیں دیکھا تھا۔ لہجوں کے کئی نشتر سہے تھے مگر یہ نہیں سہا تھا۔ دھتکار تو ویسے بھی اس کا مقدر تھی مگر عزت نفس پر چوٹ سب پر بھاری تھی۔

ماں کی بددعاؤں میں ایک بددعا موت کی بھی تو تھی۔ یہ واحد دعا تھی ان کی جو پوری نہ ہوئی تھی۔ باقی بربادی کا ہر چہرہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ ہر اذیت چکھ لی تھی۔ ہر دھتکار سہہ لی تھی۔ بس یہ موت ہی رہ گئی تھی۔ بس یہی۔

سر جھکائے وہ نم آنکھوں سے اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ نگاہیں لکیروں سے الجھی تھیں۔ نصیب تلخی سے مسکرایا تھا۔

''زندگی کتنے ہی مشکل ادوار سے کیوں نہ گزر رہی ہو، اور کتنی ہی آسانیوں کا مرکز کیوں نہ بن چکی ہو، دعا کسی بھی صورت، کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑنی چاہیے۔'' مسز شیرازی نے آج صبح اسے نصیحت کی تھی۔

''میری دعائیں قبولیت میں بہت وقت لیتی ہیں۔'' وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''جو ''تاخیر'' رب کی طرف سے ہو، وہ ہمیشہ ''خیر'' لاتی ہے!'' مسز شیرازی کہہ کر مصروف ہو گئی تھیں مگر وہ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔

ہر تا خیر میں ایک خیر! اس نے خود کو کچھ سمجھانا چاہا۔

"کچھ محرومیاں عطا کا ایک روپ ہوتی ہیں جنت! اللہ کی "کن" کی منتظر۔ اپنا روپ بدلنے کو ہر لحہ مستعد، اصل امتحان تو اس مدت کا ہے۔ جو اس محرومی میں گزاری جاتی ہے۔"

گلاس وال پر اس کی دھندلی ادھوری شبیہہ اب کچھ واضح ہوئی تھی۔

"اس دوران ہمارے صبر کو جانچا جاتا ہے۔ ہمارے شکر کو پرکھا جاتا ہے۔ پھر ایمان کا درجہ متعین ہوتا ہے۔"

اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔

"مانگتی رہو اور دیکھتی جاؤ اللہ کی مرضی سے تمہاری جھولی میں کیا گرتا ہے، جو گرے اسے بخوشی اپنا لو، خواہ وہ نقطے جتنی خوشی یا ذرے جتنی برکت ہی کیوں نہ ہو۔"

مثبت سوچ نے جڑ پکڑی۔ آنسو پلکوں پر ٹھہر گئے۔ اندر کا شور تھم سا گیا۔ اپنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتی وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

گھڑی رات کے دس بجا رہی تھی۔ فارس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر فلور لیمپ کی روشنی میں میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

نیند کی گہری وادیوں میں اترتے اسے کسی خواب، کسی خیال کی طرح یاد تھا تو بس یہی کہ میگزین ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کسی نے اسے لحاف اوڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

پارک میں اقصیٰ کے ہمراہ ٹہلتے ہوئے اس کی نظر سیاہ ٹریک سوٹ میں ملبوس شخص پر پڑی تو وہ چونک کر وہیں رک گئی۔ اس کی گردن کے گرد مفلر اچھی طرح سے ہونٹوں تک لپٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے آدھا چہرہ مکمل پوشیدہ تھا۔

اقصیٰ کا بازو پکڑ کر فوراً رخ بدلتی، وہ عجلت میں مخالف سمت قدم اٹھانے لگی۔

"کیا ہوا؟" اقصیٰ اپنی مالکن کے بدلتے تاثرات سے پریشان ہو جاتی تھی۔

"یہ جو ہمارے پیچھے آ رہا ہے، یہ فارس ہی ہے نا۔" اس نے اقصیٰ سے تصدیق چاہی۔

اقصیٰ نے پوری گردن موڑ کر پیچھے دیکھا، پھر زور و شور سے سر ہلایا۔ "جی جی یہ اپنے فارس صاحب ہی ہیں۔"

جنت کے لب بھنچ گئے۔ "دیکھو اقصیٰ، پاس پاس رہنا۔"

اقصیٰ سمجھ نہ سکی، مالکن نے ایسا کیوں کہا ہے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد جب پیچھے بار بار مڑ کر دیکھنے پر فارس وجدان نے اسے ادھر ادھر ہو جانے کا اشارہ دیا تو وہ بے چاری کنفیوز ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کی مانے؟ فارس کی۔ یا پھر جنت کی؟

مگر اس کی کالج فیس تو صاحب ہی دیتے تھے۔ اپنی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی رفتار مدھم کرتی واقعی میں ادھر ادھر ہو گئی۔

جنت کو اس کی غیر موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب فارس تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے برابر میں چلنے لگا تھا۔

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنی رفتار بڑھا لی۔ مگر وہ اس سے پھر بھی آگے نہ نکل سکی۔ دونوں برابر تھے۔ جنت کے قدموں میں عجلت نمایاں تھی جبکہ فارس کا انداز سکون لیے ہوئے تھا۔ پھر اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ تب بھی ایک لمحے کے لیے نہ آگے نکلا۔ نہ پیچھے ہوا۔

جنت نے دور تک جاگنگ ٹریک کو دیکھا پھر تھک ہار کر پھولے تنفس کے ساتھ رک گئی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھک کر سانسیں ہموار کرنے لگی۔ وہ بھی رک گیا۔ اگلے چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

"پندرہ جنوری کی ٹکٹ کنفرم ہوئی ہے۔" ہونٹوں پر سے مفلر ہٹا کر گردن پر ٹھہراتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ٹھیک ہے بھلے سے اس کے "جنت" کی ٹکٹ کنفرم ہو یا "جہنم" کی۔ وہ اسے کیوں بتا رہا ہے۔ آنکھوں میں نا سمجھی کا تاثر لیے سوال ٹھہر گیا۔

"تم میرے ساتھ لندن جا رہی ہو۔"

جنت ساکت ہوئی۔ آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیلیں۔ سماعت پر یقین نہ آیا۔ اب وہ کیا کر رہا ہے؟ اب وہ کیا چاہ رہا ہے؟

"تمہیں لگتا ہے تم مجھے اپنی مرضی سے کہیں بھی لے جا سکتے ہو؟" وہ مشتعل ہوئی۔

"لاہور لے جا چکا ہوں۔ لندن بھی لے جا سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ نارمل تھا۔ جیسے غیر ضروری گفتگو میں وہ یونہی حصہ لے رہا ہو۔

"لاہور میں چلی گئی تھی۔ لندن میں نہیں جاؤں گی۔"

فارس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"تمہارا کیا بھروسا مجھے پارکنگ ایریا یا روڈ پر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ پھر دس پندرہ دن بعد آنٹی کے مجبور کرنے پر لینے آ جاؤ۔ سوری میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔ بالکل بھی نہیں۔"

اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اب فارس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بس نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے تجزیوں پر قانع ہو رہی تھی۔ لاہور وہ اسے بطور "سزا" لے کر گیا تھا۔ بطور سزا چھوڑ کر بھی آیا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی، اپنی عزت نہیں سمجھتا تھا۔ جس شخص کی وہ "بیوی" تھی نہ "عزت"۔ اس شخص پر اب وہ کوئی بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد فارس نے کہا۔ آواز گمبھیر تھی۔ تاثرات سنجیدہ۔ مگر کہیں سختی نہیں تھی۔ نرمی بھی نہیں۔ یوں جیسے انکار سے اسے کوئی خاص فرق نہ پڑا ہو۔ یوں جیسے وہ ایسے ہی کسی جواب کا متمنی رہا ہو۔ پل پل اس کے تاثرات، اس کے ارادے اور احساسات بدلتے تھے۔

"ممی کے حکم پر ٹکٹ بک کروائی ہے۔ انکار بھی تم انہیں کرو۔"

اس کے لبوں پر ابھرتی فاتحانہ مسکراہٹ جنت کو اندر تک سلگا گئی۔ مسز شیرازی کو فارس وجدان انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی کیا مجال تھی۔ کڑھ کر، تپ کر، اس نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

"میں اچھی طرح سے جانتی ہوں تم مجھے لندن کیوں لے جانا چاہتے ہو۔"

"کیوں لے جانا چاہتا ہوں؟"

"تم جو مرضی منصوبے بنا لو مسٹر شیرازی! خودکشی میں نہیں کروں گی۔ نہ لندن کی برج سے۔ نہ کسی اور جگہ سے۔"

جاگنگ ٹریک پر پاؤں پٹختی وہ جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے فارس وجدان متبسم چہرے کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

بیڈ پر تکیوں کے سہارے وہ نیم دراز کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ موبائل پاس ہی پڑا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد موصول ہوتے میسج کے نوٹیفکیشن کو مسلسل نظر انداز کیے وہ بظاہر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے تمام تر توجہ اس اٹھا پٹخ کی طرف تھی جو جنت کمال کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ درازیں کھینچی جا رہی تھیں۔ چیزوں کو ادھر ادھر کیا جا رہا تھا۔ جس چیز کی تلاش تھی، وہ اسے پورا کمرہ الٹ پلٹ کرنے کے باوجود نہیں ملی تھی۔

تھک ہار کر وہ وارڈ روب کی طرف مڑی جو تمام کی تمام کھلی ہوئی تھیں۔ سفری بیگ قالین پر دھرا تھا۔ ہینگر سے کپڑے نکال کر تہہ کرتی اب وہ شدید غصے میں لگ رہی تھی۔

چار دن بعد ان کی لندن کی فلائٹ تھی۔ سامان ابھی سے پیک کیا جا رہا تھا۔ اور کچھ غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں کیا جا رہا تھا۔

"تم ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے میں تمہیں زبردستی لندن لے جا رہا ہوں۔" بالآخر فارس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''ہاں تو کیا ایسا نہیں ہے؟'' وہ پلٹ کر غرائی۔

''تمہاری ہر چال اب مجھے بہت اچھی طرح سمجھ میں آرہی ہے۔''

''کیسی چال؟'' لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ دبائے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ''میرے ساتھ لندن جانے کی خواہش تو ہمیشہ سے تمہاری ہی تھی۔''

ہینگر سے گلابی سویٹر نکالتی جنت کمال مشتعل ہو کر اس کے طرف مڑی۔ ''یہ تم نے خود کہہ دیا۔ تھی!! یعنی فعل ماضی۔ پاسٹ ٹینس! اب میری ایسی کوئی خواہش نہیں رہی۔''

''اچھا مذاق ہے یہ۔'' وہ ہنسا۔

''مذاق نہیں حقیقت ہے یہ!!'' جنت جل بھن گئی۔

''تمہاری حقیقتیں بھی تمہاری طرح کچھ عجیب سی نہیں ہیں؟'' اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

جنت نے پلٹ کر اسے سرد نظروں سے گھورا۔

''کوئی خوش فہمی ہے تو دور کر لو۔ میں صرف ممی کی وجہ سے تمہیں "مجبوراً" ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''میں بھی صرف ان کی وجہ سے جا رہی ہوں۔ ورنہ تمہارے ساتھ تو میں گلی کے نکڑ تک بھی نہ جاؤں۔''

''بہت خوب۔'' وہ محظوظ ہوا۔ جنت کو تپ چڑھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتی فارس کا موبائل بج اٹھا۔ سکرین پر ابھرتے نام پر نظر پڑتے ہی وہ کال ریسیو کرتا اسی وقت اٹھ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔

وہ جو اپنے کپڑے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، اس کی اس حرکت پر ٹھٹک سی گئی۔ فارس کی بیشتر کالز کاروباری نوعیت کی ہوتی تھیں جنہیں وہ ہمیشہ اس کے سامنے ہی اٹینڈ کرتا تھا۔ دوست احباب سے بات چیت بھی اس کے سامنے ہو جایا کرتی تھی۔ مگر پچھلے کئی دنوں سے ایک مخصوص نمبر سے آنے والی کال اٹینڈ کرنے کے لیے وہ اٹھ کر باہر چلا جاتا تھا۔ ہر بار اس کے تاثرات بدلتے تھے اور آنکھوں کی چمک کچھ بڑھ سی جاتی تھی۔

پہلے تو اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا مگر اب اسے شک ہونے لگا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ بے آواز قدموں کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ اس نے پھر وہیں سے سٹنگ ایریا کی طرف دیکھا۔

''میں بھلا تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟''

سامنے وکٹورین طرز کے آئینے میں فارس کا سائڈ پوز واضح نظر آ رہا تھا۔

''ممی سے میں نے فی الحال بات نہیں کی ہے، میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے رک کر کچھ سنا، پھر مسکرایا۔ ''تم کہہ سکتی ہو۔''

خاموشی ایک بار پھر چھائی تھی۔ وہ بہت توجہ اور یکسوئی سے مخاطب کی بات سن رہا تھا۔ اور اس دوران کئی بار اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

''کون؟ میری بیوی؟ اس کی تم فکر مت کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔''

کیا سنبھالے گا وہ؟ جنت کا ماتھا ٹھنکا۔ مخاطب یقیناً ایک لڑکی تھی۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔

مگر یہ لڑکی تھی کون؟ یہ سوال اب وہ ڈائرکٹ فارس وجدان سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ پوچھنے کا کوئی حق بھی نہیں رکھتی تھی۔ حق رکھتی بھی ہوتی تو پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہی ظاہر کرنا تھا کہ ایسی کسی بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

سر جھٹک کر وہ کچھ ہی دیر میں کمرے کے اندر تھی۔

ہاں، اسے ہرگز ہرگز فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس نے اپنے گال تھپتھپا کر خود کو سمجھایا۔ پھر اپنے کام میں جت گئی۔

''کون ہو سکتی ہے؟'' کچھ ہی دیر بعد اپنا بکھیڑا سمیٹتے ہوئے وہ ایک بار پھر سوچنے بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

''آپ بہت پیاری ہیں۔''

کچن میں داخل ہوتے ہی یہ پہلا جملہ تھا جو فارس وجدان کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اسٹول کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے کچلو سے اس صحت مند بچے کو دیکھا جو کاؤنٹر ٹیبل کے دوسرے کونے میں اپنے کپڑوں میں بمشکل سمایا ہوا بیٹھا تھا۔ کھلی ڈھالی شرٹ لارج سائز کی تھی اور تب بھی اسے تنگ ہو رہی تھی۔ فارس کو بہت غور کرنے اور ذہن پر زور دینے کے بعد یاد آیا کہ وہ مسز یزدانی کا نواسا تھا۔ مسز یزدانی وہی جو ان کے پڑوس میں رہتی تھیں اور جو جانوروں سے محبت کے معاملے میں کافی مشہور بھی تھیں۔

"یہ اس لیے کہ آپ خود بہت پیارے ہو۔"
فارس کی آمد سے قطعی بے خبر وہ ٹرے میں کیک پیسٹریز اور جانے کیا کیا سجانے میں لگی ہوئی تھی۔

"کیا۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"
اپنی ننھی سی سرخ کار کو ٹیبل پر یہاں وہاں دوڑاتے بچے نے ذرا سا جھجکتے ہوئے جنت سے پوچھا۔

"شی از میریڈ!" جواب فارس نے دیا تھا۔
گلاس میں اسٹرابری جوس انڈیلتے جنت کے ہاتھوں کی حرکت لمحے بھر کے لیے تھمی۔ یہ کب آیا؟
بچے نے گردن موڑ کر ایک نظر فارس وجدان کو ایسے دیکھا جیسے اس کی یہ مداخلت اسے ہرگز ہرگز پسند نہ آئی ہو۔

"سو واٹ! وہ اپنے ہزبینڈ کو چھوڑ بھی تو سکتی ہیں۔" اسے لاجواب کر کے اس نے اپنی پیشانی پر بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے پیچھے ہٹایا۔

"آر یو میریڈ جنت جانی؟" کچھ سوچ کر اس نے جنت سے پوچھا۔

"جنت جانی؟" فارس نے اچنبھے سے اسے دوبارہ دیکھا۔

"نو آئم سنگل!" لوازمات سے بھی ٹرے اپنے ننھے مہمان کے سامنے رکھتے ہوئے جنت نے سنایا کسی اور کو۔
بچے نے فارس کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔
دیکھا! شی از مائن! شی ول بی مائن۔
فارس نے رخ بدل کر اورنج جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ یہ جنت سنگل کب سے ہوئی؟

"تو پھر میں اپنی ممی کو کب لاؤں؟ ایک بار ہماری بات طے ہو جائے تو۔"

"از ہی سیریس۔" فارس سے رہا نہیں گیا۔ مشکل سے سات سال کا ہو گا۔ آگے کے دو دانت بھی موصوف کے غائب تھے۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے مجھے سات سال کا بچہ پرپوز کرے یا ستر سال کا بوڑھا؟" جنت کو پتنگے لگ گئے۔

"آئم ناٹ آ بچہ" بچے کو پہلی بار اپنی ہونے والی "منگیتر" سے اختلاف ہوا۔

"دیکھا، وہ خود مان رہا ہے وہ بچہ نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا مسئلہ!" اب تو جنت کو بھی فارس کی مداخلت پسند نہیں آ رہی تھی۔ فارس محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ کہ بھلا اسے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟

"میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔ میں آپ کو پوری دنیا کی سیر بھی کرواؤں گا۔ ہم دونوں اکٹھے ڈزنی لینڈ بھی جائیں گے۔" وہ جنت کو اپنے فیوچر پلان سے آگاہ کرنے لگا۔

"جب تک تم جہاز اڑانے کے قابل ہو گے، تب تک یہ پچاس برس کی ایک آنٹی میں بدل چکی ہو گی۔"
جنت نے جل کر فارس کو دیکھا۔ "ایج ڈزنٹ میٹرز! لو میٹرز!"

"واٹ ایور!" اس نے خالی گلاس کاؤنٹر ٹیبل پر رکھا۔

"زیڈنی! آپ کا جب دل چاہے اب اپنی ممی کو لے آؤ۔" بہت مسکرا کر اس نے بچے کا گال کھینچا۔

"سوزی کو بھی ساتھ لے آؤں؟"

"اب یہ سوزی کون ہے؟" فارس نے ایک بار پھر ان کے درمیان ٹانگ اڑائی تھی۔

"میری بلی ہے۔" شان بے نیازی سے بتایا

گیا۔فارس کے تاثرات بدلے۔
''نہیں، سوزی کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس سے ملنے آپ کے گھر آؤں گی۔'' جنت نے ٹالنا چاہا۔
''سوزی بہت اسٹرونگ ہے۔ اس کے اندر سپر پاورز ہیں! وہ میرے دشمنوں کو جب دیکھتی ہے تو وہ اسی وقت گر جاتے ہیں۔''
وہ در پردہ کس بات پر چوٹ کر رہا تھا، فارس پہلو بدل کر رہ گیا۔
''آپ گرے تھے نا اس دن؟'' پھر وہ فارس کی طرف مڑا۔ کمال کی یادداشت تھی اس بچے کی۔ ڈیڑھ سال ہونے کو تھا مگر ابھی بھی اسے وہ واقعہ جزئیات سمیت یاد تھا۔
''آپ گرے تھے نا سیڑھیوں سے۔ سوزی بہت پاورفل ہے۔ جنت جانی کل میں سوزی کو بھی لاؤں گا۔''
فارس نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''میں تمہاری اس سوزی کی وجہ سے نہیں گرا تھا۔''
''سب معلوم ہے مجھے۔'' بچے نے گردن سیدھی کی۔ ''آپ کی آئیز ریڈ ہو گئی تھیں۔ آپ کو سنیزنگ ہو رہی تھی۔ آپ بہت ڈر گئے تھے میری بلی سے۔ مجھے سب یاد ہے۔ میری بلی بہت پاورفل ہے۔''
خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے فارس اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔
''یہ بہت ڈرتے ہیں میری سوزی سے!!''
اس نے پھر پراسرار انداز میں جنت کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔ لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بمشکل دباتے ہوئے جنت نے فارس کی طرف دیکھا۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز اب چینل سرفنگ کر رہا تھا۔
''اچھا!'' اس نے بھی آگے سے شدید حیرت کا اظہار کیا۔
''آپ میری سوزی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ فار

یور اون سیفٹی!'' بچے نے سرگوشی میں کہا۔ جنت بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ جھنجھلا کر ریموٹ پٹختے ہوئے فارس اسی وقت اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

مسز شیرازی کے بیڈروم میں وہ گلاس وال کے قریب فلور کشن پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ لیپ ٹاپ گلاس ٹیبل پر دھرا تھا جس پر وہ ان کا آرٹیکل ٹائپ کر رہی تھی۔
مسز شیرازی پاس ہی وہیل چیئر پر براجمان تھیں۔ وہ باہر لان کے سبزے پر چمکتی اس دھوپ کا نظارا کر رہی تھیں جو براہ راست اب ان پر بھی پڑ رہی تھی۔
دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھلا تو جنت نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس، کوٹ لاپروائی سے بازو پر ڈالے، دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے فارس وجدان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ وہ دوپہر تین بجے کی فلائٹ سے ضروری میٹنگ کے لیے کراچی جا رہا تھا۔ کل شام تک اس کی واپسی متوقع تھی۔ اور پھر پرسوں انہیں لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔
آنکھوں میں خفگی بسائے وہ خود کو مصروف ظاہر کرتی تیزی سے ٹائپنگ کرتی رہی۔
ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتا وہ صوفے پر جا بیٹھا تھا۔ مسز شیرازی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ اپنی شخصیت کا الٹ نظر آتا۔ نرمی صرف اس کی باتوں سے ہی نہیں، چہرے اور آنکھوں سے بھی جھلکنے لگتی تھی۔
''آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں ممی!'' جانے سے پہلے اس نے کچھ یاد آ جانے پر مسز شیرازی سے کہا۔
جنت کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر فارس وجدان کو دیکھا۔ اس کی پشت جنت کی طرف تھی۔ وہ اس کا چہرہ پڑھنے سے مکمل قاصر تھی۔
''اچھا۔ وہ کس سے؟'' مسز شیرازی نے پر

اشتیاق لہجے میں پوچھا تھا۔
''کسی خاص الخاص سے! آپ کو اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔''
جنت کے لب بھنچ گئے۔ غصہ نئے سرے سے عود کر آیا۔ آج اسے آئمہ ظہیر کی کلاس لینی ہوگی۔ وہی کہتی تھی، اس کے فارس بھائی لڑکیوں سے دس فٹ، بیس فٹ کی دوری پر رہتے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ کون تھی جسے وہ آنٹی سے ملوانا چاہتا تھا۔
اس کے چہرے پر ڈوبتی ابھرتی شکی حکایتوں کو پڑھتے فارس وجدان نے سامنے ہاتھ لہرایا۔ وہ چونکی۔ پھر گڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اب اپنے مجازی خدا کو دروازے پر چھوڑنے بھی تو جانا تھا۔ مسز شیرازی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چہرے کا رخ مشرق کی سمت کیا اور فرش پر پاؤں پٹخ کر یوں چلنے لگی جیسے سارا قصور ہی ان ٹائلز کا تھا جو اس کے پیروں تلے بچھی ہوئی تھیں۔
''اپنی پیکنگ تو بڑے جوش و خروش سے کر رہی ہو، ہو سکے تو میرا سامان بھی پیک کر دینا!'' قدرے فاصلے سے ہی ریموٹ کی سے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ بولا تو اس کا لہجہ معمول کے برعکس خوش گوار تھا۔
''تمہیں نہ پیک کر دوں میں؟'' وہ بھنائی۔
''کر سکتی ہو تو کر دو۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پہلے گردن جھکائی پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔
''تم۔'' اس نے بدک کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔
لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ ''مَمی ہمیں ہی دیکھ رہی ہیں۔''
جنت کی ہاتھ چھڑانے کی جستجو دم توڑ گئی۔ ذرا سا رخ بدل کر زبردستی مسکرائی۔ تاکہ مسز شیرازی جان لیں، وہ ان کے بیٹے کو کتنی محبت سے الوداع کر رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کتنی خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ!)
''ہاں اب ٹھیک ہے۔'' فارس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے ہاتھ چھڑا کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔
''اب جاؤ بھی۔'' ساتھ ہی جھڑک کر آنکھیں دکھائیں۔
''تمہارے ڈر سے نہیں جا رہا ہوں، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔'' رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتا وہ گاڑی میں بیٹھا تو جنت کمال نے بے اختیار سکھ بھرا سانس لیا۔ مگر اس کے یہ سکون بھری کیفیت فارس وجدان سے کیونکر برداشت ہو سکتی تھی؟ شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے ذرا سا سر باہر کیا۔
''میرے پاس ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔''
وہ پوچھنا چاہتی تھی کیسا سرپرائز، یا سرپرائز کی آڑ میں چھپی کیسی سزا! کیسا بدلہ؟ کیسا انتقام؟ مگر لب بھینچے، سینے پر بازو باندھے خفگی سے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔
''کراچی سے جب واپس آؤں گا تب۔'' اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
جنت دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز لگائے وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیے تھے۔
اب وہ سیاہ گاڑی کو آہنی گیٹ سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ سرپرائز؟ جانے کیوں اس کا دل کسی ناگہانی احساس کے تحت دھڑک اٹھا تھا۔

☆☆☆

مسز یزدانی نے اسے اپنے پوتے کی سالگرہ پر انوائٹ کیا تھا۔ فارس کراچی گیا ہوا تھا۔ آئمہ مری گھوم رہی تھی۔ اور وہ اکیلے نہ پہلے کوئی فنکشن اٹینڈ کر سکی تھی۔ نہ اب کرنا چاہتی تھی۔ دل بوجھل اداس سا تھا۔ لیکن مسز شیرازی چاہتی تھیں وہ ضرور جائے۔
''وہ بہت پیار سے بلا رہی ہیں جنت!''
وہ آج کل اس کی ضرورت سے زیادہ خاموشی کو حد سے زیادہ محسوس کر رہی تھیں۔
''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' سر جھکا کر وہ ایک بار

پھر ٹائپنگ کرنے لگی تھی۔ مسز شیرازی نے اسے بغور دیکھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ ایسی ہی تھی۔ اداس۔ خاموش۔ پریشان......

"وہ کیا سوچیں گی؟"

"میں کہہ دوں گی، فارس کراچی گیا ہوا ہے اس لیے نہیں آسکتی۔" کھٹ کھٹ کی بورڈ پر اس کے انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

"مسز یزدانی کا یہ انویٹیشن خاص تمہارے لیے ہے جنت! فارس تو ایسے فنکشن اور گیدر نگز بہت کم ہی اٹینڈ کرتا ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "آپ حکم دے رہی ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ کتنے دن ہو گئے، میں نے تمہیں تیار ہوتے نہیں دیکھا، میک اپ جیولری۔ کچھ بھی نہیں۔ ذرا یاد کرو، لاہور جانے سے پہلے تم کتنا تیار رہتی تھیں۔ جیسے پھول کھلا رہتا ہے بالکل ایسے ہی لگتی تھیں تم مجھے!"

نم آنکھوں کے ساتھ وہ پھیکا سا مسکرادی۔

"چلو اٹھو شاباش! جا کر تیاری کرو، مسز یزدانی تمہیں اپنے ساتھ ہی اپنے فارم ہاؤس لے کر جائیں گی۔ میں ان سے بات کر لیتی ہوں۔"

"آنٹی پلیز!"

"جنت نو آرگومنٹ۔ فریش ہو جاؤ گی بیٹا!"

گہرا نفس لے کر وہ اسی وقت اٹھ گئی تھی۔ تیاری کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ عجیب بے سکونی تھی جو وجود میں پھیلی ہوئی تھی۔

تیاری مکمل کرنے کے بعد اس نے سر درد کی گولیوں کی تلاش میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز کھینچی۔ اندر رکھی اشیاء کو الٹ پلٹ کرتے اس کے ہاتھوں سے سیاہ مخملیں ڈبیہ ٹکرائی۔ وہ کچھ دیر تک کسی مجسمے کی طرح ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔ پھر اس نے مخملی ڈبیہ کھول کر دیکھی۔ نفیس سی ایمرالڈ ڈائمنڈ رنگ چمک رہی تھی۔

کچھ دیر تک وہ سانس روکے اس بیش قیمت تحفے کو دیکھتی رہی پھر بھاری دل کے ساتھ اسے رکھ کر اٹھ گئی۔

جانے کیوں اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اک ان جانا سا خوف از سر نو سر اٹھانے لگا تھا۔

ہر طرح کے خیالات کو جھٹکتی وہ شال اچھی طرح سے اوڑھ کر کلچ سنبھالتی کمرے سے نکل گئی تھی۔ مگر جو بے سکونی اس ڈبیہ کو دیکھ کر اس کے وجود میں اتری تھی اس سے باوجود کوشش کے بھی وہ پیچھا نہ چھڑا سکی تھی۔

☆☆☆

ریسٹ روم میں دیوار سائز آئینے کے سامنے رک کر اس نے اپنے سراپے کا از سر نو جائزہ لیا۔ پھر کھلے بالوں کو سمیٹ کر ان کا جوڑا بنانے لگی۔ ہیل کی ٹک ٹک کے ساتھ ہی دیوار گیر آئینوں میں کسی کا عکس ابھرا۔ اس نے چونک کر بے ساختہ نگاہ اٹھائی۔

سیاہ رنگ کی باریک ساڑھی میں ملبوس اک نزاکت اور ادا سے سہج سہج قدم اٹھاتی وہ اس کے برابر میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ سنہرے براؤن بال جوڑے میں مقید تھے۔ کچھ گھنگھریالی لٹیں دودھیا چہرے کے اطراف میں تھیں۔

کاجل سے لبریز بڑی بڑی آنکھوں میں جنت کمال کو دیکھتے ہی تعجب ابھرا تھا۔ سرخ لبوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ سج گئی تھی۔

"واٹ اے سرپرائز!" کچھ حیران ہو کر اس نے جنت کا سر تا پیر جائزہ لیا۔

"غالباً یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔ اور ابھی تک ہمارا ٹھیک سے انٹروڈکشن ہوا ہی نہیں!" ساڑھی کا پلو ہاتھ میں پکڑے وہ ایک ادا سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب طنزیہ سی ہوتی تھی۔

جنت نے سر جھٹک کر خاموشی سے رخ بدلا، کلچ میں چھوٹے سائز کی میک اپ کٹ رکھی۔ آئمہ کی تنبیہہ اپنی جگہ مگر اس لڑکی سے اسے کچھ اچھی وائبز نہیں آتی تھیں۔

"آئم عدینہ زبیر!" اپنا نام بتاتے ہوئے اس نے جنت کے تاثرات جانچے۔ جنت کسی عدینہ زبیر کو نہیں جانتی تھی۔ یہ اس کے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا۔

"فارس وجدان کی پہلی بیوی!"

جنت نے جھٹکا کھا کر اسے دیکھا۔ نقرئی کلچ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ لائنر، لپ گلوز اور مسکارا یہاں وہاں بکھر گئے۔

"یو آر سرپرائزڈ!" وہ اس کے تاثرات سے کچھ حیران ہوتے ہوئے ہنس پڑی۔ "غالباً شیرازی خاندان کے کسی فرد نے تمہیں ابھی تک فارس کی پہلی شادی کے بارے میں نہیں بتایا!!"

"فارس کی پہلی شادی؟" آنکھوں میں صدمہ لیے جنت اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

"تو کیسی لائف گزر رہی ہے تمہاری میرے ایکس ہزبنڈ کے ساتھ؟" عدینہ کی طنزیہ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"کیا اس نے تمہیں بتایا نہیں، وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے؟ علیحدگی کے بعد بھی وہ میرے لیے کتنا دیوانہ رہا ہے؟ میری ہی وجہ سے اس نے کتنی لڑکیاں ریجیکٹ کی ہیں؟ کتنے رشتوں سے انکار کیا ہے؟!"

جنت کا دماغ ماؤف ہوا تھا۔ حواس شل ہو رہے تھے۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں پتھرائی ہوئی نگاہوں سے عدینہ زبیر کو دیکھے جا رہی تھی۔

"مسز لغاری کی بیٹی ثمرہ کے ساتھ تو اس کی بات تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن عین نکاح کے وقت اس نے انکار کر دیا۔ کین یو امیجن! عین نکاح کے وقت...... ایسی محبت ہے اس کی۔ بھولا نہیں ہے وہ مجھے۔ نہ ہی بھول سکتا ہے وہ کبھی۔ آج بھی میں اس کے دل میں آباد ہوں۔ میری جگہ نہ اس نے کبھی کسی کو دی ہے، نہ ہی وہ دے سکتا ہے!"

جنت کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ منظر دھندلا سا گیا۔ تو یہ وجہ تھی فارس وجدان کی نفرت، دھتکار اور بے اعتنائی کی۔ نکاح جیسے مقدس رشتے کو ایک معین مدت تک قائم رکھنے کی۔

"وہ آج بھی مجھے اپنانے کا منتظر ہے، انکار تو میری طرف سے ہے۔ فیصلہ تو میں نہیں بدل رہی۔ لیکن سوچو جنت! اگر میں اسے "ہاں" کہہ دوں۔ ذرا سوچو!! تمہاری حیثیت کیا رہ جائے گی؟"

وہ سوال نہیں گویا پہاڑ تھا جو جنت کے سر پر ٹوٹا تھا۔ خود سے کیا گیا ہر ایک عہد ایک لمحے میں فنا ہوا تھا۔ وہ جو اپنا "گھر" چھوڑنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ اب گھر اجڑتا دیکھ کر سکتے میں آ گئی تھی۔

"نائس ٹو میٹ یو جنت!" عدینہ زبیر کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "امید ہے ہماری اگلی ملاقات وجدان ہاؤس میں بہت جلد ہو گی۔"

وہ جا چکی تھی اور جنت کمال واش بیسن پر گرفت جمائے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔

"میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں ممی!"

"بہت خاص الخاص ہے وہ!"

"ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے!"

اس نے سانس لینے کی کوشش کی مگر اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھے وہ نیچے بیٹھ گئی تھی۔

فون کالز۔

خوش گوار رویہ۔

سائیڈ ٹیبل سے برآمد ہونے والا رنگ کیس۔

"کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ممی سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

جنت کمال نے اذیت سے آنکھیں میچ لی تھیں۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عمارہ جہاں

زنجیر

وہ میلے کپڑوں میں بال بکھرائے سڑک کے درمیان بیٹھی تھی۔ کبھی سر اٹھا کے زور زور سے ہنسنے لگتی۔ کبھی روتے ہوئے عجیب سی آوازیں نکالتی۔

بچے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تالیاں بجانے لگے۔ وہ بھی تالیاں بجاتے ہوئے گھومنے لگی۔ سڑک کنارے لگے شاہ بلوط کے بڑے سے درخت پر منہ چھپائے سونے والی چڑیا نے آنکھیں کھول کر نیچے دیکھا اور پھر اڑ گئی۔

تالیاں بجاتے بجاتے اس نے ایک دم پتھر اٹھایا۔ بچے شور مچاتے ہوئے بھاگ گئے۔ وہ پتھر مارتے ہوئے اب بددعائیں دے رہی تھی۔ پہاڑی علاقے کی اس کچی ڈھلوانی سڑک کے دوسری طرف سے دو لڑکیاں آئیں۔ اس پاگل عورت کو پکڑا۔ وہ چلاتے ہوئے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی پھر اس لڑکی کے ہاتھ میں زنجیر دیکھی اور سہم گئی۔ ان کو دور جاتے دیکھ کر کھیتوں میں کام کرنے والی ایک لڑکی دوسری عورت سے بولی۔

"اماں! یہ پاگل کیسے ہوگئی؟ آپ کو پتا ہوگا نا؟ پہلے آپ ان کی حویلی میں کام کرتی تھیں۔"

ہاتھ میں پکڑی درانتی چھوڑ کر اس عورت نے اسے گھورا۔

"تجھے کیا ہے کسی سے۔ اپنا کام کر۔"

اسے جھڑک کر وہ ہاتھوں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے لگی۔

"نہ بتاؤ اماں! مجھے سب پتا ہے۔"

وہ چہرے سے سرکتے دوپٹے سے واپس چہرہ چھپاتے ہوئے بولی۔ اب صرف اس کی کالی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"کہ قتل ہوا تھا ان کے گھر میں۔ کسی لڑکی کا۔"

وہ ذرا ٹھہر گئی۔ اس کی اماں دم سادھے اسے سن رہی تھی۔ وہ ذرا اٹکی۔

"کسی لڑکے کا بھی۔"

"چپ کر۔"

اس کی اماں نے اسے جھڑک کر پھر سے درانتی اٹھا لی۔ البتہ اس کے ہاتھوں میں اب واضح لرزش تھی اور ماتھے پر چند پسینے کے قطرے جگمگا اٹھے تھے۔ وقت نے رک کر اس کی بات سنی اور پھر سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔ دوپہر آہستہ سے سورج کے پیچھے بھاگتے بھاگتے شام کے دروازے پر آگئی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے گھروں کو لوٹنے لگے۔ مؤذن فلاح کی طرف بلانے لگا۔

اس سب سے بے نیاز دور پہاڑی پر بنی اس عالی شان حویلی میں ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے اس پاگل عورت کے پاؤں میں "زنجیر" ڈال دی اور صحن کے کونے میں لگے درخت کے ساتھ باندھ دیا۔

☆☆☆

صحن کے وسط میں چارپائی پر "لاش" رکھی تھی۔ سفید چادر سے باہر اس کا معصوم چہرہ چمک رہا تھا اور چہرہ سفید تھا، اتنا سفید کہ جیسے سارا خون نچوڑ دیا گیا ہو اور عجیب بات یہ تھی کہ لاش کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ایسی موت تھی کہ لوگ رونے کے بجائے لاش کو گھورتے ہوئے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی رونے والا نہیں تھا۔ فضا نوحوں سے محروم ایسی سرد موت پر حیران پریشان تھی، پھر وہ اندر سے آئی۔ اس کا چہرہ

دیکھا، دیکھتی رہی اور پھر چیخ مار کر گر پڑی۔

☆☆☆

بہار نے جب پر سمیٹ لیے تو پتے اداسی سے زمین کے ماتھے پر گرے ایسے موسم میں پہاڑی علاقوں میں تھوڑی بہت سردی تو ہوتی ہے۔ اس وقت بھی فضا ہلکی خنک تھی۔ بڑے بڑے درخت خاموشی سے سر جھکائے باادب کھڑے تھے۔ سورج غروب ہونے کے بعد تو منظر میں ویسے بھی اداسی گھل جاتی ہے تو اسی اداس ماحول میں کچی مٹی کے بنے اس کمرے سے (جسے گلگ کہا جاتا ہے) وہ لڑکی نکلی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی، وہ دیکھنے میں ملازمہ لگتی تھی۔ نسیمہ (ملازمہ) نے ہاتھ میں تھال پکڑ رکھا تھا جس میں دال تھی۔ اس نے صحن کے درمیان بنی نہر میں دال دھوئی اور واپس کچن کی طرف آگئی اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی جس کی چال

میں ایک عجیب تمکنت تھی اور اس دوران سامنے والے بڑے کمرے کی کھڑکی سے دو آنکھیں نفرت میں ڈوبی اسے گھور رہی تھیں۔

☆☆☆

''سنو نسیمہ!''

وہ کپڑوں کا ڈھیر لے کر دالان کے دوسری طرف واقع اس بڑے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ایک کمرے سے رعب دار آواز آئی۔

''جی بڑی بی بی!''

وہ کمرے کے دروازے پہ کھڑی سر جھکا کے بولی۔

''اندر آؤ۔''

بڑی بی بی پلنگ پر بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ کمرے میں اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ سے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''زرینہ کدھر ہے؟''

پوچھتے ہوئے ان کے لہجے میں ایک نامعلوم سا سرد تاثر ابھر آیا۔

''پتا نہیں بی بی جی! شاید اپنے کمرے میں ہو۔''

''ہوں۔''

ان کی سوچتی نگاہیں باہر اندھیرے میں دیکھتی رہیں اور پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

''میری بیٹی نے کھانا کھایا؟''

''مرجان بی بی سو رہی تھی، میں نے ابھی دیکھا۔''

نسیمہ قدموں میں بیٹھی سر جھکائے بولی۔

''سنو نسیمہ! شاہ جی چاہتے ہیں کہ زرینہ کی شادی کر دی جائے۔''

وہ ذرا رکی۔

''بڑی حویلی میں...... کمال شاہ کے ساتھ، لیکن میں نہیں چاہتی، زرینہ میری سوتیلی بیٹی ہے، مرجان میری بیٹی۔ زرینہ بیاہ کر بڑی حویلی چلی گئی تو مرجان...... مرجان کا کیا ہوگا؟ مرجان کے جوڑ کا کوئی نہیں۔ کمال شاہ کے ساتھ میں اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''نسیمہ!'' وہ بولتے بولتے اس کی طرف جھکیں۔

''اور یہ کام تم کرو گی۔ اس کے بدلے میں تمہیں آزادی ملے گی، شاہوں کی حویلی کی غلامی سے۔ مجھے پتا ہے تم کرو گی۔''

نسیمہ پتھرائے چہرے کے ساتھ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

''شاہ! ایک چیز پہ جان لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں۔ وہ ہے عزت۔ تم سمجھ گئی ہو نا؟ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔''

بڑی بی بی نے سختی سے پوچھا۔ وہ مردہ ہو چکی تھی۔ ٹکر ٹکر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''نسیمہ!''

بڑی بی بی جھکیں اور آہستہ سے اس کے کندھے کو ہلایا۔

''شاہوں کی حویلی میں غلامی کرنی ہے۔؟''

انداز آر یا پار والا ہو گیا۔ وہ سر نفی میں ہلا کر کھڑی ہو گئی۔ چہرے سے کشمکش کے آثار مٹ گئے۔ نسیمہ فیصلہ کر چکی تھی۔ کمرے میں اگربتی کی خوشبو ان کی سازش سن کر ہکا بکا رہ گئی۔

☆☆☆

نسیمہ رسوئی میں دودھ چھاننے کے بعد ابالنے کے لیے رکھ چکی تھی۔ دو اور ملازمائیں اس کے ساتھ رسوئی میں اچار کے مرتبان دھو کر خشک کر رہی تھیں۔

دودھ ابالنے کے لیے رکھ کر اس نے قدموں کی آہٹ سن کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کمال شاہ چھوٹے شاہ جی کے کمرے سے نکل کر واپس جا رہا تھا۔ (چھوٹے شاہ۔ بڑی بی بی جی اور بڑے شاہ جی کا بیٹا ازلان شاہ)۔ کمال شاہ حویلی سے باہر رہا تھا۔ اس لیے اس کے انداز شاہوں والے نہ تھے۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے بڑے باغ کی طرف باہر جاتے جاتے رک گیا۔

نسیمہ نے جلدی سے کھڑکی کھول کر چہرہ دوپٹے سے چھپا کر دیکھا۔ زرینہ اپنے کمرے سے نکل کر ہال کی طرف آتے ہوئے راستے میں اسے دیکھ کر رک گئی۔ نسیمہ نے دونوں کا رکنا محسوس کیا۔

''زرینہ بی بی نے چادر سے چہرہ بھی نہیں چھپایا ہے۔''

وہ بڑبڑائی۔

کمال شاہ نے کچھ پوچھا، زرینہ نے سر ہلایا۔

زرینہ کے "بدلتے تاثرات" کمال شاہ کی "خوش گوار آواز۔" اس نے دھیرے سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔

"آزاد تو میں ایسے ہو جاؤں گی بڑی بی بی کہ آپ بھی یاد رکھیں گی۔"

وہ سیاہ چہرے کے ساتھ واپس دودھ کی طرف مڑی۔ دودھ خشک ہو رہا تھا، آگ اسی شان سے جل رہی تھی۔

☆☆☆

"بڑی بی بی! میں نے سوچ لیا ہے سب۔"

رات جب دھیرے دھیرے سرکنے لگی تو بڑی بی بی آتش دان کے سامنے آ کے بیٹھ گئیں۔ نسیمہ نے ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے ان کے قدموں میں بیٹھ کر سرگوشیوں میں بتانے لگی۔ اس کی تیز نظریں ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بڑی بی بی کے سفاک چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھری۔

"چھوٹے شاہ جی شکار سے واپس آئے؟"

"نہیں بی بی جی! ابھی تک تو نہیں، صبح تک آ جائیں گے، میں کل رات کو ٹھیک بارہ بجے زرینہ بی بی سے کہوں گی کہ پچھلے دالان میں آپ انہیں بلا رہی ہیں جب وہ وہاں پہنچیں گی تو نجوم پہلے سے وہیں ہوگا، میں نے اس سے کہا ہے کہ بڑی بی بی نے تمہاری ڈیوٹی ادھر لگا دی ہے جب تک چھوٹے شاہ جی شکار سے نہیں آتے، بیبیوں کے کمرے کی پچھلی طرف رات کو تیری ڈیوٹی لگی ہے ادھر۔"

وہ پھولی سانسوں کے ساتھ جلدی جلدی بولی۔ ہاتھ اس نے اب قدموں سے ہٹا لیے تھے۔ (اب میں غلام تھوڑی ہوں)

"ٹھیک ہے نسیمہ، جس دن زرینہ شاہ اس حویلی سے چلی گئی، میری نظروں سے دور اپنی مری ہوئی ماں کے پاس، تم آزاد ہو۔"

ان کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

"بڑی بی بی! یاد رکھیے گا زرینہ بی بی کا کل آخری دن ہے اس دنیا میں...... اور میرا اس حویلی میں، آپ نے زبان دی ہے مجھے۔"

وہ فوراً مطلب کی بات پہ آ گئی۔

کھٹکے کی آواز پر دونوں چونک گئیں۔

"میں دیکھتی ہوں، کون ہے۔"

وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔

باہر آ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اندر جھانکا۔ بڑی بی بی آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھی تھیں، ان کا سیاہ چہرہ رات کی تاریکی کو بھی مات دے رہا تھا۔

"بدلہ تو میں ایسا لوں گی بڑی بی بی! یاد رکھو گی، نسیمہ کو آزاد کر کے بھی قید رکھنے کی یہ جو کہانی ترتیب دی ہے نا آپ نے۔ دیکھنا آپ کے پاس بھی کچھ نہیں بچے گا۔"

نفرت بھری ایک نگاہ ان پہ ڈال کر وہ راہداری میں تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

☆☆☆

کمال شاہ کی جیپ جب حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو نسیمہ نے ہاتھ میں پکڑی سبزی واپس رکھ دی۔

"سکھاں سبزی کاٹ دینا، میں تب تک آ جاؤں گی۔"

درمیانی روش پر تیز تیز چلتے اس نے دوپٹے سے چہرہ چھپا لیا۔ کمال شاہ کا رخ بڑے ہال کی طرف تھا۔

"السلام علیکم شاہ جی!"

اس نے پھولی سانسوں کے ساتھ ہاتھ ماتھے پہ لے جا کے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ چلتے چلتے رکا۔

نسیمہ کی تیز نظروں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

"شاہ جی!" وہ تھوڑا آگے ہو کر دھیمی آواز میں بولی۔

"میں نے آپ کو ایک بات بتانی ہے، بہت ضروری۔"

کمال شاہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے۔ پھر وہ ناگواری سے آگے بڑھا۔

"زرینہ بی بی کے متعلق......"

اور کمال شاہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ پیچھے مڑا۔

''لمبی بات نہیں۔''

وہ جلدی جلدی بولی۔

''زرینہ بی بی کی جان کو خطرہ ہے، ابھی کوئی دیکھ لے گا۔ میں پوری بات آپ کو بتاؤں گی، آپ رات بارہ بجے پچھلے دروازے سے دالان میں آجانا، کوئی نہیں ہوگا۔''

جلدی جلدی کہہ کر وہ دوپٹے سے چہرہ چھپا کر آگے بڑھی۔ وہ دنگ وہیں کھڑا رہ گیا۔ ڈھلتے سورج نے چپکے سے وقت کے کان میں سرگوشی کر کے سب بتا دیا، وقت تاسف سے آگے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

رات اپنے سیاہ لباس میں حویلی میں گھومنے لگی تو اس نے شاہ جی کے کمرے کے باہر دو تین چکر لگائے اور دھیرے سے کھنکاری۔ بڑی بی بی اس کے ہی انتظار میں تھیں، فوراً دروازہ کھول کر باہر آگئیں۔

''سب کچھ تیار ہے بی بی جی! بارہ بجنے میں آدھ گھنٹہ ہے۔ میں زرینہ بی بی کو دالان میں بھیجنے جا رہی ہوں۔''

وہ سفاکی کے ساتھ تیز تیز بولنے لگی، آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

''آپ بڑے شاہ جی کو لے کر آنا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ جلدی، شاہ جی بلا رہے ہیں مجھے۔''

انہیں بھیج کر وہ اندر آئی۔ چادر سے چہرے پر چمکتی پسینے کی بوندیں مٹا دیں، وہ پھر ابھرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''شاہ جی! آپ جاگ رہے ہیں، مجھے ایک بات کرنی تھی۔''

وہ نظریں جھکائے بولیں۔ انہوں نے گود میں رکھے رجسٹر سے نظریں ہٹائے بنا کہا۔

''ہاں! زمینوں کے حساب کتاب دیکھ رہا ہوں۔''

''کچھ کہوں گی تو آپ کو برا لگے گا۔''

وہ ذرا تھمیں۔

''لیکن آپ زرینہ پہ ذرا نظر......''

''ذرا رکیں۔''

''مجھے اس کے انداز ٹھیک نہیں لگ رہے، میں کچھ کہوں تو سوتیلی ماں لگوں گی لیکن زرینہ شاہ باغی ہے شاہ جی، آپ کی عزت نہیں......''

''چپ کر۔''

وہ دھاڑے۔

''ہمت کیسے ہوئی ایسی بات کہنے کی؟''

''شاہ جی! میں......''

''ایک لفظ نہیں، مجھے پتا ہے غیرت کیا ہے اور عزت کیا۔ تم ابھی نکل جاؤ۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

وہ چلائے۔

☆☆☆

گھڑی میں چلنے والی مسافر سوئیوں میں سے ایک نے جب بارہ کے ہندسے پر پڑاؤ ڈالا تو اس نے دھیرے سے زرینہ شاہ کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد زرینہ کا سپاٹ چہرہ نمودار ہوا۔

''وہ بی بی جی! بڑی بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

''تو؟'' اس کے سپاٹ چہرے پر برف سی برف تھی۔

''پیچھے دالان میں جھولے پر بیٹھی ہیں کہہ رہی تھیں ضروری بات کرنی ہے، اندر حویلی میں کوئی ملازم سن لے گا یا پھر شاہ جی یا چھوٹے شاہ نہ سن لیں۔ وہ کہہ رہی تھیں، بہت ضروری بات ہے۔''

''چلو تم میں آتی ہوں۔''

نسیمہ پلٹی اور دھیرے دھیرے راہداری میں آگے بڑھتی اوجھل ہوگئی۔ نسیمہ کے جاتے ہی وہ باہر نکلی اور ساتھ والے کمرے کے دروازے پر ہاتھ سے دستک دی۔ دو بار کھٹکانے سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ زرینہ شاہ کے سپاٹ چہرے نے بے حسی کی دبیز چادر اوڑھ رکھی تھی۔

☆☆☆

نسیمہ راہداری کے دوسری طرف واقع گلک کے

دروازے کو کھول کر اندر آ گئی۔

"بڑی بی بی! آپ کیا چاہتی تھیں کہ نسیمہ آزاد ہو کر بھی آپ کی غلام رہے۔ آپ سب کچھ میرے اوپر ڈالنا چاہتی تھیں۔ اگر زرینہ شاہ مرے گی، مجھے آزادی کے نام پر ایک غلامی ملے گی تو آپ کے حصے میں بھی کچھ نہیں آئے گا۔ مرجان ہمیشہ اس گھر میں رہے گی۔ کیونکہ آج صرف زرینہ شاہ نہیں بلکہ بڑی حویلی کا سپوت۔ آپ کی بیٹی کا جوڑ، ایک ہی شخص کمال شاہ بھی نہیں رہے گا۔ آپ کو بھی پتا چلے گا بڑی بی بی کہ چال چلنی صرف آپ کو نہیں آتی۔ دماغ ہر عورت کے پاس ہوتا ہے چاہے وہ آزاد ہو یا غلام۔"

دیوار سے ٹیک لگا کے وہ تصور میں بڑی بی بی کا خوفناک چہرہ لا کر ان سے مخاطب، منتظر بیٹھی تھی۔

☆☆☆

"شاہ جی!"

وہ تیز چلتی اندر داخل ہوئیں۔ وہ ابھی تک جاگ رہے تھے، ان کے غصے کا اندازہ ان کے ماتھے پہ پڑی شکنوں سے ہو رہا تھا۔

"شاہ جی پچھلے دالان میں کوئی مرد ہے لمبا سا، شکل واضح نہیں، اندھیرے کی طرف ہے۔"

حواس باختگی سے کہتی ہی وہ ذرا تھمیں۔

"ساتھ میں...... ساتھ میں کوئی عورت بھی۔"

"کیا؟" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اذلان شاہ کدھر ہے؟"

وہ جلدی سے دیوار پہ لگی بندوق کی طرف بڑھے۔

وہ شکار سے آ کر سو گئے تھے۔"

وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولیں۔

"تم ادھر رہو، باہر مت آنا۔ میں اذلان شاہ کو جگاتا ہوں۔"

وہ بندوق لے کر باہر نکلے۔

وہ سر اٹھا کے چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔

"گلالے شاہ! آج میں تیری بیٹی کو تیرے پاس بھیج رہی ہوں، کیا مجھے شکریہ نہیں کہو گی۔"

ان کا مکروہ چہرہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ رات کی ساری سیاہی ان کے چہرے میں ضم ہو گئی۔

☆☆☆

باہر دو گولیوں کے چلنے کی آواز آئیں۔ دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی نسیمہ کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اٹھی پھر بیٹھ گئی۔

کیا میری چال کامیاب ہو گئی؟

ایک اور آواز کے ساتھ ایک نسوانی چیخ حویلی کے در و بام سے ٹکرائی۔

☆☆☆

گولی کی آواز کے ساتھ وہ اٹھیں؟ "دیکھتی ہوں لیکن شاہ جی منع کر گئے ہیں۔"

وہ کمرے میں ٹہلنے لگیں۔ گولی کی آواز ایک بار پھر گونجی۔

"کیا میری چال کامیاب ہو گئی؟"

ایک اور گولی کی آواز۔ اور اس آواز کے ساتھ درد بھری نسوانی چیخ پوری حویلی میں گونجی۔ اور پھر یوں خاموشی چھا گئی جیسے حویلی، حویلی نہیں قبرستان ہو۔ وہ دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ بے چینی پل پل بڑھتی جا رہی تھی۔ جانے کیوں!

☆☆☆

دونوں لاشیں خون میں لت پت گری تھیں۔ کمال شاہ کا ناقابل شکست قد و قامت والا ایک شان سے لیٹا وجود، دو گولیاں کھا کر بالکل ساکت تھا۔ اس کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر گرا نسوانی وجود خون میں نہایا ہوا تھا۔ ادھ کھلی آنکھیں اپنا گناہ پوچھ رہی تھیں۔

"اطلاع بھجوا دو رحیم شاہ کو۔ اس کا بیٹا غاصب نکلا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے شاہوں کی عزت کو بچایا ہے۔"

بڑے شاہ جی سفاک لہجے میں کہہ کر اندر کی جانب مڑے۔

اور لاشیں بھی اٹھوا دینا۔"

پیچھے لاشوں کے پاس کھڑا اذلان شاہ نفرت سے نسوانی لاش کو گھور رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا کروں؟" وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے

سوچنے لگیں۔ یہ شاہ جی کیوں نہیں واپس آئے۔
باہر گونجتے قدموں کی آواز، ان ملازموں کی سرگوشیاں، چارپائی گھسیٹنے کی آواز، پھر گاڑیوں کی آواز اور پھر آہستہ آہستہ صبح کا پو پھٹتے ہی شور زیادہ ہونے لگا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آگئیں۔ دالان سے عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی دالان میں آگئی۔ دالان کے وسط میں چارپائی پر لاش رکھی تھی۔ سفید چادر سے باہر اس کا معصوم چہرہ جھانک رہا تھا اور چہرہ سفید تھا اتنا سفید کہ جیسے سارا خون نچوڑ دیا گیا ہو۔ عجیب بات یہ تھی کہ لاش کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ایسی موت تھی کہ لوگ رونے کے بجائے لاش کو گھورتے ہوئے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی رونے والا نہ تھا۔ فضا نوحوں سے محروم ایسی سرد موت پر حیران پریشان تھی۔ یہ وہ آہستگی سے چلتی اس کے سرہانے تک آئیں، بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر چیخ مار کر پڑیں۔ وقت نے صبح کے اجالے کی طرف دیکھا اور پوچھا یہ چال کس کی تھی؟

☆☆☆

”یہ چال میری تھی۔“
آج وہ سربراہی صوفے پر بیٹھی اسی تمکنت سے سر اٹھائے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔
جبکہ نسیمہ اس کے قدموں میں بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔
”اذلان شاہ پاکستان سے چلا گیا، اب نہیں آئے گا۔“ وہ ذرا رکی۔
”بڑی بی بی تو عنقریب پتھر مارنے لگیں گی، مکمل پاگل، آخر جوان بیٹی کا دکھ ہے۔“
وہ سر اٹھا کر سفاکی سے ہلکا سا مسکرائی۔
”نسیمہ!“ پیار سے پکارا۔
”تمہیں پتا ہے اس رات میں نے کیا کیا؟ میں نے مرجان کو بھیج دیا۔“
اور نسیمہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔ یہ وہ زرینہ کی آنکھیں نہیں تھیں، وہ برف اور آگ کی کوئی تخلیق تھیں۔

”چونکہ شاہ اپنا عہد نبھاتے ہیں تو میں بڑی بی بی کے عہد کی پاسداری کے طور پر آج تمہیں آزاد کرتی ہوں۔ تم آزاد ہو اس حویلی سے۔“
وہ ذرا رکی۔
نسیمہ بحال ہوتی سانسوں کے ساتھ اس کے پاؤں چھونے جھکی۔
”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی نسیمہ۔ تم آج سے ہماری زمینوں پر کام کرو گی ہمیشہ...... مسلسل نسل در نسل، میں نے تمہیں اس حویلی سے آزاد کر دیا ہے، غلامی سے نہیں۔“
وہ سر اٹھا کے زور سے ہنسی۔ ڈھلتی دوپہر میں بڑے ہال کی نیم روشنی میں اس طرح ہنستی وہ کوئی پاگل لگ رہی تھی۔ مغرب کی طرف سے ایک آندھی اٹھی اور بارش کو منا کے لے آئی۔ ذرا سی دیر میں پوری حویلی ”آنسوؤں“ میں بھیگی کھڑی تھی۔ تین عورتوں کی سازش میں بے گناہ مرنے والی مرجان شاہ اور کمال شاہ کی موت پر آسمان ابھی تک رو رہا تھا۔ ہچکیاں لینے لگا تو زمین پر گڑگڑاہٹ گونجنے لگتی۔

☆☆☆

وقت کے شجر سے سال کے پتے گرتے گئے۔
زرینہ کے بالوں نے چاندی اوڑھ لی۔ بڑے شاہ جی وفات پا گئے۔ اذلان شاہ لوٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حویلی آگیا اور عقبی حصے میں رہنے لگا۔ بڑی بی بی کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں پہنا دی گئیں۔ پچھلی طرف کی ویران حویلی میں گھومتی وہ روز دروازے پر آکر نسیمہ کے گزرنے کا انتظار کرتی ہیں۔ اور جوں ہی نسیمہ حویلی کے دروازے کے سامنے سے گزرتی ہے تو وہ پکار کر کہتی ہے۔
”سنو نسیمہ!
”تمہارے زنجیر کی چھن چھن کتنی پیاری ہے نا!“
اور نسیمہ چپ چاپ آگے بڑھتے ہوئے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی ہے، جہاں بڑی نادیدہ ”زنجیر“ واضح چھن چھن کرتی دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔

☆

تنزیلہ ریاض

نورالقلوب

نورالقلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کررہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست ! سے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کرلی ہے۔ وہ حیران ہوجاتا ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں کھٹر پٹر سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔

رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹادی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہوجاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔
رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹادی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔
مہر افروزان کے گروپ میں شامل ہو جاتی ہے داؤد کو لگتا ہے کہ وہ ان کے گروپ کی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت ہے۔ فرمان کی اس سے نہیں بنتی۔
خوشل گلے سے کہتا ہے کہ لاریب کو فوراً واپس بھیجو، اسے لگتا ہے کہ وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔
خان بابا خوشل خان کو بتاتے ہیں کہ اس کا نکاح لاریب سے ہو رہا ہے۔
خوشل کو یاد آتا ہے کہ لاریب ڈر گز لیتی ہے، وہ غصے میں جب لاریب کے پاس آتا ہے تو منہ دکھائی میں سگریٹ دیتا ہے جسے دیکھ کر لاریب کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

چوتھی قسط

"چڑیا اڑی کھیلیں؟"
ارباب نے تجویز دی تھی۔ خوشل نے ناگواری سے اس تجویز کو سنا۔ وہ اگرچہ آنکھیں بند کیے سر تک لحاف تانے لیٹا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ اسے دل ہی دل میں ارباب پر بے تحاشا غصہ آیا مگر اس نے سوچ لیا تھا اب کسی سے کچھ نہیں کہنا۔ خان بابا نے اس کا دل دوستوں سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اس قدر خراب تھی کہ نیند کہاں آسکتی تھی پھر اس کا روم میٹ اتنا شور شرابا مچا رہا تھا کہ سونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن وہ جب سے کیمپس سے واپس آیا تھا سب کو نظر انداز کر رہا تھا۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کسی کو مخاطب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ارباب سمجھ رہا تھا کہ چونکہ اس نے ڈیوس کا نمبر نہیں دیا، اس لیے وہ ناراض ہے۔
"اچھا مت کھیلو میں اکیلا ہی کھیلتا ہوں۔" ارباب جانتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اس لیے وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہا تھا۔
"چڑا اڑی۔ اڑی اڑی......" ارباب کی آواز لحاف کے اندر بھی اس کے حواس کو پریشان کر رہی تھی۔
"پتنگ اڑی۔ ہاں ہاں بھئی وہ بھی اڑی۔" وہ خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دیتا چلا جا رہا تھا۔
"مذاق اڑا؟" ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنا ارباب کی ہی نہیں اس کی بھی عادت تھی لیکن مزاج کا خوش گوار ہونا شرط تھی جو کہ اس وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ارباب کی باتوں سے چڑ رہا تھا۔
"حسرتیں اُڑیں۔ خواب اُڑے۔ خواہشیں اُڑیں۔ ارمان اڑے۔ ارے بتادے میرے باپ۔ کیا کیا اُڑا آیا ہے جو اتنا ناراض ہو کر بستر میں گھسا ہوا ہے۔"
ارباب نے اس کی خاموشی سے تنگ آکر پھر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب بھی چپ رہا۔
"تم اگر بتاؤ گے نہیں خوشل تو مجھ کمبخت کو پتا کیسے چلے گا کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ ناراض بیوی کی طرح سر منہ لپیٹے کیوں پڑے ہو؟"
ارباب نے اُکتا کر سوال کیا تھا۔

خوش الحان کا یہ انداز اس کے لیے نیا ہی نہیں عجیب بھی تھا۔ وہ جذباتی قسم کا انسان نہیں تھا جو کسی جھگڑے کو بنیاد بنا کر ایک شخص کے پیچھے پڑا رہتا۔ ڈیوس کے ساتھ جو بھی معاملہ تھا وہ اسی دن نبٹ گیا تھا جب ایک مکا کھا لینے کے بعد ڈیوس نے شام کو اس سے معافی مانگ لی تھی اور اگر آج وہ کہہ رہا تھا، اسے کوکین درکار ہے اور اس لیے وہ ڈیوس کو ڈھونڈ رہا ہے تو یقیناً وہ اسی لیے ڈیوس کو ڈھونڈ رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا شخص جو سگریٹ پینا بھی گناہ سمجھتا تھا یکدم کوکین لینے کی بات کیوں کرنے لگا تھا۔

''تم کوئی ضرورت نہیں مجھ سے بات کرنے کی۔'' وہ غرا کر بولا تھا۔ چند لمحے تک ارباب کی آواز بالکل سنائی نہ دی تھی پھر اس کے موبائل پر کال آنے کی بیپ سنائی دینے لگی چند لمحوں بعد اس نے ارباب کی آواز سنی تھی۔

''جی خان صاحب۔ یہیں کمرے میں ہے۔ جب سے آیا ہے سب سے جھگڑ رہا ہے۔''

خوشل کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ خان بابا اکثر ارباب کے فون پر کال کر لیا کرتے تھے۔

''میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پہلے تو سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ اب کوکین کے خواب دیکھنے لگا ہے۔'' خوشل نے جھٹکے سے لحاف سر سے اتارا تھا۔ ارباب فون کان سے لگائے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

''خبیث انسان۔ چپ رہ۔'' وہ مدھم سی آواز مگر غرانے والے انداز میں بولا تھا مبادا دوسری جانب اس کی آواز چلی جائے۔

''خان صاحب! مجھے اب فکر ہو رہی ہے۔ اس شتونگڑے نے پہلے کبھی ایسے بی ہیو نہیں کیا۔ آپ مانیں یا نا مانیں۔ کسی لڑکی کا چکر لگتا ہے۔''

وہ اس کے گھورنے کو نظر انداز کیے بنا مسلسل فون پر اناپ شناپ بک رہا تھا۔ خوشل اس کے جملے پر سلگ اٹھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا تھا۔ جبکہ ارباب مزید کہہ رہا تھا۔

''خان صاحب! آپ کہیں تو میں کوئی دم درود بھی کروا سکتا ہوں۔ یا کسی حکیم کو دکھاؤں۔ کوکین سے بہتر ہے کسی معجون کو آزما لیا جائے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟'' خوشل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

اس نے آؤ دیکھا نا تاؤ، اپنے پلنگ کے نیچے پڑی پشاوری چپل اٹھائی اور زور سے اس کی جانب اچھالی تھی۔ وہ بمشکل بچ سکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنسی چھپانے کی کوشش واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

خوشل بستر سے اترا اور تیزی سے دو قدم بھر کر اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا جس پر اس کی اپنی تصویر والا اسکرین سیور جگمگا رہا تھا۔ خوشل کو ایک سیکنڈ لگا تھا یہ سمجھنے میں کہ وہ اداکاری کر رہا تھا اور اس کے فون پر کوئی کال موصول نہیں ہوئی تھی اور فون بھی ارباب کا نہیں بلکہ اس کا اپنا تھا۔ ارباب اس کا خجالت بھرا چہرہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا تھا۔ خوشل نے غصے سے موبائل فون واپس اسی کی جانب اچھال دیا جسے اس نے ہنستے ہوئے کیچ کر لیا تھا۔ خوشل کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

''اگر تم نے اب بھی منہ نہ کھولا تو میں واقعی خان صاحب کو کال کر دوں گا۔''

ارباب لاپروائی سے ہنس رہا تھا۔ وہ واپس بستر پر جا کر بیٹھ گیا لیکن اب کی بار اس نے لیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ بستر کے کنارے پر ٹک گیا تھا۔

ارباب کے رویے نے مزید دل توڑ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے اردگرد موجود ہر شخص خوش و خرم تھا، مطمئن تھا۔ ایک وہی تھا جس کی زندگی تین سو ساٹھ کے زاویے سے گھوم گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور اس کا کوئی بھی خیر خواہ نہیں بچا تھا۔

اس کے چہرے پر ہی نہیں سارے وجود پر عجیب سا حزن و ملال پھیلنے لگا۔ عجیب بے بسی سی بے بسی تھی۔ ارباب چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اسے جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

''اچھا سوری۔'' وہ مزید بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے خوشل کے بندھے ہاتھوں پر پانی کی چند ننھی بوندوں کو پھسلتے دیکھا۔

''خوش الحان۔'' اسے جھٹکا لگا تھا۔ خوشل بے آواز رو رہا تھا

☆☆☆

مہرافروز نے داؤد کی زندگی ہی نہیں شخصیت کو بھی بدل ڈالا تھا۔ داؤد ہی نہیں اس کی ممی بھی اس بات کے لیے اسے سراہتی تھیں لیکن پھر بھی ان کے درمیان کہیں نہ کہیں اختلافات جنم لیتے رہتے تھے۔ داؤد کا بیرونِ ملک پڑھائی کے لیے جانے کا فیصلہ بھی ایسا ہی ایک اختلاف تھا۔

''جرمنی؟'' داؤد نے اس کو بتایا تھا۔ اس نے سنتے ہی بُرا سا منہ بنایا۔

''یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟'' مہر کو یہ تجویز اچھی نہیں لگی تھی۔

داؤد نے ہاتھ میں پکڑے تازہ جوس کے گلاس کو ذرا سا ترچھا کیا تاکہ باقی ماندہ جوس اسٹرا کے ذریعہ آسانی سے پیا جا سکے۔ اس کام کو نبٹا کر اس نے مہر کی جانب دیکھا اور چند لمحے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں تین کلومیٹر والے ٹریک پر جاگنگ کے دو ٹریک مکمل کر کے ایک موبائل جوس کارنر سے جوس لے کر بینچ پر آ بیٹھے تھے۔

دونوں کا اسکول ختم ہو چکا تھا اور اب گریجویشن کی پلاننگ چل رہی تھی۔ روز روز ملنے کے مواقع ختم ہو گئے تھے۔ داؤد نے اپنا وزن کافی کم کر لیا تھا۔ وہ جم بھی جاتا تھا اور جاگنگ بھی کرتا تھا۔ مہر صرف داؤد سے ملنے کی خاطر شام کو جاگنگ کے لیے آنا شروع ہو گئی تھی اور اسی کی وجہ سے ایک راؤنڈ کے بجائے دو راؤنڈ پورے کرتی تھی۔

نظامِ تنفس کے تیز ہونے کی وجہ سے مہرافروز کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے بال اونچی پونی کی شکل میں باندھ رکھے تھے لیکن چند لٹیں جنہیں شاید جان بوجھ کر آزاد چھوڑ دیا گیا تھا، اس کی گردن کے گرد جھول رہی تھیں۔ دھوپ کی الہڑ سنہری کرنیں اس کی زلفوں سے منعکس ہوتی تھیں اور اس کی گردن کا احاطہ کرتی جاتی تھیں۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں پایا۔ دل میں ایک دم سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کے بالوں کو چھو کر دیکھے۔ مہر نے اس کی محویت کو محسوس کیا تو استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا پھر اسی شرمندگی کو مٹانے کی غرض سے بعجلت بولا۔

''وائی ناٹ جرمنی؟'' اس نے اتنا کہا پھر انگلیوں پر گنوانے لگا۔

''یورپ میں فائنانس کی بہترین ڈگری جرمنی والے کروا رہے ہیں۔ چار سال میں کروا دیتے ہیں اور انٹرن شپ کے بعد جاب آفرز بھی اچھی مل جاتی ہیں۔ جب چاہے سمسٹر فریز بھی کیا جا سکتا ہے۔ دبئی سے فاصلہ بھی کم ہے۔ چھٹیوں میں آنا جانا بھی آسان رہتا ہے۔'' مہرافروز کے چہرے کے تاثرات مزید بگڑ گئے۔

''اس سے زیادہ احمقانہ لاجکس ملی نہیں ہوں گی۔ ورنہ تم وہ بھی دے دیتے۔ صرف آئی ایم ایف کے آفیشلز کی پروفائلز چیک کر کے تم اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہاں فائنانس کی بہترین ڈگری ہو رہی ہے۔ جبکہ چار سال میں انٹرن شپ کے ساتھ تم دبئی میں رہتے ہوئے بھی گریجویٹ کر لو گے تو جاب آفرز مل جائیں گے۔''

وہ ناگواری سے بولی پھر اپنا خالی گلاس ڈسٹ بن کی جانب اچھال کر بولی۔

''اور یہ آنے جانے والی اسٹوپڈٹی کس سے سیکھی ہے۔ ابراڈ ڈالر خرچ کر کے پڑھنے جاؤ تو آنے جانے

والے چونچلے نہیں سمجھتے۔ ضرورت کیا ہے پنڈولم بننے کی۔ ڈگری کمپلیٹ کیے بنا آنا ہی کیوں ہے؟" داؤد کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی ساری باتوں کو ایک ہی سانس میں رد کر دے گی۔

"اچھا۔ یہ لاجکس احمقانہ لگ رہی ہیں تمہیں تو تم ہی کوئی سمجھ دار لاجکس سکھا دو مجھے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ مہر نے اس کی جانب دیکھا پھر ذرا سا مسکرائی۔

"تم سیدھی طرح مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ فیصلہ تمہارا نہیں بلکہ آنٹی کا ہے۔ دراصل وہ چاہتی ہیں کہ تم جرمنی جاؤ۔" داؤد اس کے اس قدر درست اندازے پر حیران ہوا۔

"تم کہو تو میں ان کے اس فیصلے کی وجہ بھی بتا سکتی ہوں۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پورے یورپ میں سستا ترین گریجویشن وہ بھی فائنانس میجر کے ساتھ جرمنی میں ہو رہا ہے۔ تمہاری ممی کی ساری ریسرچ ان کی پاکٹ کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔" اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر داؤد کو برا لگا۔

"اس میں غلط کیا ہے۔ ایک سنگل مدر اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہے۔" وہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر بولا۔

"ایک سنگل مدر نہیں۔ ڈبل مدر بھی یہی کرے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے، میں اگر اپنی ڈگری اسٹیٹس یا یو کے سے کرنا چاہوں گی تو میرے پیرنٹس مجھے جانے دیں گے۔ نہیں کبھی نہیں۔ وہ تو مجھے کبھی جرمنی بھی نہیں جانے دیں گے۔ سب مڈل کلاس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اجازت دے دیں۔ یہی بڑی بات ہے۔ پیسے ویسے کہاں ہوتے ہیں ان کے پاس۔ اس لیے یہ ایموشنل کارڈ مت کھیلو۔ عقل مندی سے فیصلہ کرو۔ اپنی پالیسی بناؤ۔ اپنی ریسرچ کرو۔ کب تک آنٹی پر ڈیپینڈینٹ رہو گے۔ ان کی مشکلات میں کمی کرو۔"

وہ رسان سے سمجھا رہی تھی۔ داؤد نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"تمہیں لندن جانا چاہیے۔ لندن اسکول آف بزنس سے بہتر آپشن فی الوقت کوئی نہیں۔" داؤد نے نفی میں سر ہلایا۔

''ممی کبھی نہیں مانیں گی۔''

مہر نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکتے ہوئے اسے دیکھا۔

''دیکھو داؤد! یہ ممی ڈیڈی کو منانا، مشورہ دینے والوں کا کام نہیں ہوتا۔ میں صرف مشورہ دے رہی ہوں۔ تم سُن لو۔ اگر ٹھیک لگے تو مان لینا ورنہ نہیں۔'' اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

''آنٹی صرف فنڈز کی وجہ سے تمہیں لندن نہیں جانے دیں گی۔ ظاہر ہے اتنی مہنگی اسٹڈیز وہ افورڈ کر ہی نہیں سکتیں۔ لیکن اگر تم وہاں ایڈمیشن لے لو تو بہت آسانی سے کوئی بھی پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈ سکتے ہو۔ جرمنی میں تمہیں بہت اچھی جاب جلد نہیں ملے گی کیونکہ تمہیں زبان سیکھنے میں چند مہینے ضرور لگ جائیں گے جبکہ لندن میں پہلے مہینے ہی تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اپنے ہر سمسٹر کی فنڈنگ کر سکو اور یہ خیال دل سے نکال کر جاؤ کہ ہر چھ مہینے بعد تمہیں واپس آنا ہے۔ یہ ٹین ایجرز والی حرکتیں چھوڑ دو اب۔ ممی کے بغیر موو کرنا سیکھو۔ جب بھی آنا اسٹڈیز مکمل کر کے آنا، تاکہ غیر ضروری اخراجات سے بچا جا سکے۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی

''یہ صرف مشورہ ہے داؤد اور اچھے دوست کبھی بُرا مشورہ نہیں دیتے۔'' داؤد سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور اس کے ہم قدم ہوا تھا۔ چہرے پر اُلجھن بھی تھی اور بے چینی بھی۔

''تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن لندن اسکول آف اکنامکس کی ایڈمیشن فیس بھی میرے لیے افورڈ ایبل نہیں ہے۔ پہلی فیس بھرنے میں ہی ہم ہینڈ ٹو ماؤتھ ہو جائیں گے۔'' مہر چلتے چلتے اس کی جانب مُڑی۔

''میں کس لیے ہوں۔ میرے پاس میری کچھ سیونگ ہیں۔ اور مجھے ہمیشہ سے پارٹ ٹائم جابز کرنے کی عادت رہی ہے۔ مِل مِلا کر کچھ نا کچھ ہو جائے گا۔'' وہ اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ داؤد گنگ رہ گیا۔ وہ اسے پیسے دینے کی بات کر رہی تھی۔ ان کے تعلق کی عمر بمشکل ایک سال تھی یا ایک سال سے اوپر کچھ مزید مہینے۔ اور وہ اس کی خاطر اپنی سیونگز خرچنے کو تیار تھی۔ وہ اس کے لیے یہ سب کیوں کر رہی تھی؟

مہر چلتے ہوئے آگے نکل گئی تھی جبکہ وہ پیچھے کھڑا رہ گیا پھر جیسے اسے ہوش آیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا

''مہر۔ لیکن کیوں...... میرا مطلب ہے؟'' اسے الفاظ ہی نا مل پائے تھے۔ مہر رُکی نہیں تھی بلکہ چلتی جا رہی تھی لیکن داؤد اس کی آواز سُن سکتا تھا۔

''لندن جا کر ایک بات کبھی نہ بھولنا۔'' وہ چلتے چلتے یک دم مُڑی تھی۔

''اتنا ایثار صرف محبت میں کیا جاتا ہے۔'' وہ کہہ کر ایک لمحہ کے لیے رُکی تھی پھر اس نے دوبارہ سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ داؤد کچھ نا سمجھی کے عالم میں اس کی پشت کی جانب دیکھتا رہ گیا تھا

☆☆☆

''تم نے مہر کو کچھ زیادہ ہی سر نہیں چڑھا لیا۔'' ممی نے آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں مانتی ہوں وہ تمہاری اچھی دوست ہے۔ تمہاری ویل وشر ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ ہمیشہ وقت سے آگے دیکھتے ہوئے بہت اچھے مشورے دیتی ہے لیکن میرے پیارے بدھو بیٹے۔ ہر مشورہ جو اچھا ہو۔ مانا نہیں جا سکتا۔ اس نے ایک اچھی بات کہی۔ دیٹس گڈ۔ میں اس کی ویژن کو سراہتی ہوں۔ لیکن میں تمہیں لندن پھر بھی نہیں بھیج سکتی۔''

''لیکن کیوں ممی؟'' اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

''اس لیے کہ میرے پاس ایک اکلوتا بیٹا ہی ہے۔ میں نے ساری زندگی برباد کر کے ایک اولاد ہی کمائی

ہے۔ اب ایک ذرا سی لڑکی کے لیے اسے ضائع نہیں کر سکتی۔ لندن چلے جاؤ گے اور چھ سال بعد واپس آؤ گے۔ میں تب تک یہاں کیا کروں گی تمہارے بغیر۔ یہ سوچا ہے۔ میرا ویزہ بھی دو سال میں ختم ہو جائے گا۔ میں تو پاکستان چلی جاؤں گی۔ اور پاکستان میں اکیلی عورت کیسے زندگی گزارتی ہے۔ اس بات کا احساس ہے تمہیں؟"

وہ میز پر پڑے ٹشو باکس میں سے ٹشو لینے لگی تھیں۔ داؤد کو لگا جیسے وہ رو رہی ہیں لیکن وہ اپنا چشمہ صاف کر رہی تھیں۔

"ممی۔ مجھے لگتا ہے مہر کی بات میں وزن ہے۔ لندن کی نسبت جرمنی میں جاب ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہو گا میرے لیے۔ لندن میں تو......" ممی نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں نے کہا نا۔ اس نے بات غلط نہیں کی۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ لیکن داؤد میرے بارے میں بھی تو سوچو۔ میں کیا کروں گی اتنا عرصہ۔ جرمنی میں تو میرے کچھ رشتہ دار بھی ہیں۔ تم نہیں بھی آپاؤ گے تو میں آجایا کروں گی۔ اور ان کے یہاں ایک دو مہینہ رہ سکوں گی۔ لندن میں کون ہے ہمارا۔ میں وہاں آؤں گی بھی تو رہائش کا کیا انتظام ہو گا۔ کس کے پاس رہوں گی۔"

انہوں نے گہری سانس بھری تھی اور چپ ہو گئی تھیں۔ داؤد کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ انہیں پورے حساب کتاب کر کے بتا سکتا تھا کہ جرمنی اور لندن میں اتنا فرق نہیں تھا۔ وہ انہیں سمجھانا چاہتا تھا کہ ان کے دلائل بودے ہیں لیکن ایک احترام تھا جو آڑے آتا تھا۔ ایک احساس تھا جو اسے روکتا تھا کہ ماں کا دل نہیں دکھانا اور یہ چیز اس کی شخصیت میں قدرت کی طرف سے تھی۔ وہ بحث سے بچتا تھا اس لیے نہیں کہ اس کے پاس بحث کا اسٹیمنا نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ان سب لوگوں کی قدر کرتا تھا جو اس کے دل کے قریب تھے۔ لوگوں کے دل کے چار خانے ہوتے ہوں گے لیکن اس کے دل کے دو خانے تھے۔ ایک میں ماں مقیم تھی اور ایک میں مہر افروز۔

☆☆☆

"میں آنٹی سے خود بات کرلوں گی۔ تم فکر مت کرو۔ انہیں کنونس کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ تم بس لندن جانے کی تیاری کرو۔" مہر نے ساری بات سن لینے کے بعد لاپروائی سے کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سخت سے ہو گئے تھے جنہیں وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ داؤد اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ہر مسئلے کا حل مہر دو منٹوں میں کیسے نکال لیتی تھی۔ وہ ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے لیکن دونوں نے ابھی تک کافی نہیں لی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھے رہے

"تم یہ کیسے کرو گی مہر؟" وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ مہر چند لمحے اسے گھورتی رہی۔

"تم بہت اچھے ہو داؤد۔ لیکن تمہاری یہ عادت بالکل اچھی نہیں ہے۔ تم اپنی زندگی میں کب اس قابل ہو گے کہ کوئی فیصلہ سر اٹھا کر کر سکو۔ یہ کب تک چلے گا۔ آنٹی کب تک تمہیں پریشرائز کر کے وہ سب کرنے سے روکتی رہیں گی جو تم کرنا چاہتے ہو۔ کبھی تو تم ان کو بتاؤ کہ تمہیں بھی اپنے لیے کوئی اچھا فیصلہ کرنا آتا ہے۔ تمہارا اس ردِعمل کی وجہ سے وہ تمہیں چھوٹا سا بچہ سمجھتی ہیں۔ اور کسی چھوٹے بچے کو مجھ سے یہ پوچھنے کا اختیار نہیں ہے کہ۔ تم یہ کیسے کرو گی مہر۔" اس نے آخر میں داؤد کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔ داؤد کو بالکل اچھا نا لگا۔

"کرلوں گی میں۔ ڈونٹ وری۔ تم باقی پروسیجر پر دھیان دو۔"

اگلا جملہ اس نے سرد مہری سے بولا تھا۔ داؤد بد دلی اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات لیے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر وہ مسکرائی تھی۔

"میں نے کہا نا داؤد۔ پریشان مت ہو۔ میں کرلوں گی۔ تم جرمنی پڑھنے نہیں جاؤ گے۔" اب کی بار اس نے داؤد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''آئی ایم سوری مہر۔لیکن......'' داؤداس لمحے کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔وہ اس لمس کی تاثیر سے محظوظ ہونا چاہتا تھا لیکن نہیں ہو سکا تھا۔وہ مہر کو بتانا چاہتا تھا کہ ممی کو جس کام سے تکلیف ہوتی ہے وہ کام اس سے نہیں ہو پاتا۔وہ کوشش کرتا ہے لیکن ممی نے اس کے گرد اپنے احسانات کا ایسا مشروم بنا دیا تھا کہ اس سے آگے کا آسمان اسے نظر تو آتا تھا مگر صرف نظر بھر کر دیکھنے کے لیے۔اُڑان بھرنے کے لیے نہیں۔

اس کے کچھ دن بعد ممی نے اسے جرمنی کی بجائے لندن اپلائی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔مہر کب ممی سے ملنے آتی رہی،اس نے کب اور کیسے انہیں آمادہ کیا،داؤداس متعلق نہیں جانتا تھا لیکن اس کے دل میں مہر کا مقام بے پناہ بڑھ گیا تھا۔لندن جا کر بھی وہ مہر کے سحر سے نہ نکل سکا تھا لیکن......

قدرت کی ندرت ہی یہی ہے کہ اس کی چال وقت پر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

☆☆☆

''وہ میری بات سُن رہی ہے نہ باہر آنے کو تیار ہے۔بس لحاف سر تک تانے بستر میں لیٹی ہیں۔''

ماسی حبیبہ نے اکتائے ہوئے انداز میں خان بابا کو بتایا تھا۔انہوں نے سوپ کا پیالہ ابھی آگے سرکایا ہی تھا۔ماسی حبیبہ کی بات پر لحہ بھر کے لیے ان کا ہاتھ رُکا پھر دوبارہ سے پیالہ آگے کیا اور اس میں چمچ چلاتے ہوئے لاریب کو اشارہ کیا کہ وہ شروع کرے۔

''کیا رو تی رہی ہیں؟'' اب کی بار انہوں نے پشتو میں ہی سوال کیا تھا۔لاریب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بات جو بھی ہے اس سے مخفی رکھنے کا ارادہ ہے ورنہ خان بابا کبھی بھی پشتو کا سہارا نہ لیتے۔

اس نے سوپ کے پیالے سے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر ماسی حبیبہ کی جانب دیکھا۔یہ تو وہ سمجھ گئی تھی کہ گلِے کے متعلق بات ہو رہی ہے کیونکہ جب سے وہ کمرے سے نکل کر کھانے والے کمرے میں آئی تھی تب سے وہ کہیں نظر نہ آئی تھی اور عام حالات میں ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔خان بابا کو کھانا ہمیشہ وہ خود دیا کرتی تھی۔گلِے اسے اچھی لگتی تھی اگرچہ خان بابا سے کم۔لیکن اسے یہ بے ضرری خاتون پسند تھی۔وہ اس کا کافی خیال رکھتی تھیں اور لاریب کو اس کا گفتگو کا انداز بھی پسند تھا۔سادہ سے انداز میں بات کرتے کرتے وہ کوئی اچھی بات ضرور کہہ جایا کرتی تھی مگر وہ خان بابا کی طرح لاریب کی دوست نہیں تھی اور اس کی وجہ خوش الحان تھا۔دشمن کا دوست کبھی آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔گلِے اور اس میں اتنی دوستی تھی اور اسی لیے لاریب کبھی بھی گلِے سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔اس نے اب بھی کچھ نہیں پوچھا تھا بلکہ چُپ چاپ سوپ کے پیالے میں مگن ہو گئی۔

''آپ اطمینان سے سوپ ختم کیجیے۔میں ابھی آتا ہوں۔'' خان بابا یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔لاریب تب بھی کچھ نہیں بولی لیکن اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ان کے کمرے سے چلے جانے کے بعد چند لمحے وہ اسی طرح سوپ کے پیالے میں مگن رہی پھر اس نے ماسی حبیبہ کی جانب دیکھا تھا۔وہ سوالیہ انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔لاریب بلاوجہ مسکرائی۔وہ بھی مسکرا دی۔

''یہ آپ نے بنایا ہے؟'' اس نے سوپ کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ماسی حبیبہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سوپ ہی کے متعلق کچھ کہہ رہی ہو گی۔انہوں نے سوپ کی تعریف میں دو جملے بولے اور ساسز والی ٹرے اس کے آگے کر دی کہ شاید وہ ان میں سے کوئی مزید ڈالنا چاہے گی۔لاریب نے بنا کوئی تاثر دیے سوپ پینا شروع کر دیا۔یہ تو اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ماسی حبیبہ صرف پشتو سمجھتی ہے اب یقین بھی ہو گیا۔

''خوشحال کہاں ہے؟'' اس نے دوسرا سوال صرف اس نیت سے پوچھ لیا کہ وہ سر پر جو کھڑی ہے تو کوئی بات

ہی کر لی جائے مگر یہ سوال بھی ضائع ہی ہوا۔ ماسی حبیبہ نے پشتو میں اپنی سمجھ کے مطابق کوئی جواب دے دیا۔ لاریب کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی

''اوہ بھائی۔ کسی کام کی نہیں ہیں آپ میرے۔ جائیے تشریف لے جائیے۔''

اسی نے ذرا اونچی آواز میں کہا اور ہاتھ سے بھی چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ماسی حبیبہ کو اس کا سرد سا انداز عجیب اچھا نا لگا۔ اس انداز اور اونچی آواز میں یہاں اس سے کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''یہاں میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔'' لاریب سوپ پیتے ہوئے مسلسل کچھ سوچنے میں مگن تھی۔

☆☆☆

''یہ ٹرے کس کے لیے سجا رہی ہو؟'' زہرہ نے سدرہ کو چائے کے لوازمات کے ساتھ مصروف دیکھا تو پوچھ لیا۔ وہ نمازِ ظہر ادا کر کے آئی تھی۔ اس ہفتہ اس کی ڈیوٹی صرف سارے بچوں کے کھانے کی ٹرے سجانے تک محدود تھی جو آج کل اسی وقت شروع ہوتی تھی تو وہ عام طور سے دوپہر کے کھانے کے وقت ہی وہاں آتی تھی۔

درس گاہ کے باورچی خانے کا سارا انتظام چند بے بس اور لاچار خواتین کے ذمہ تھا جن کے خاندان والوں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ چونکہ ضرورت مند بھی تھیں اور لاوارث بھی اس لیے ان کا اوڑھنا بچھونا درس گاہ ہی تھی۔ وہ وہاں موجود سب لوگوں کا بہت اچھے طریقے سے خیال رکھتی تھیں۔ درس گاہ میں حفظ کرنے والے بچوں کے تین وقت کے کھانے کے علاوہ بھی باورچی خانہ سارا دن آباد ہی رہتا تھا لیکن وقت کی پابندی ایک ایسا امر تھا جس کی خلاف ورزی کم ہی کوئی کرتا تھا۔ بے وقت چائے وہاں کوئی بھی نہیں پیتا تھا اس لیے زہرہ کو چائے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے ایک جملے میں جواب دیا اور چائے کی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ لفظ مہمان پر زہرہ کے تمام تر حواس جیسے الرٹ ہوئے تھے

''ہری حویلی سے آیا ہے کوئی؟'' یہ سوال حیرت انگیز نہیں تھا۔ اس کا بے چین سا انداز حیرت انگیز تھا۔

سدرہ کے علاوہ تائی شاہدہ نے بھی چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر سدرہ تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے چپ چاپ ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔ تائی شاہدہ صافی سے پلیٹ صاف کرتی اس کے قریب آ گئیں۔

''اخبار والے ہیں۔ انٹرویو کرنے آئے ہیں۔'' انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ انہیں وہاں پڑھنے والی سب لڑکیاں بہت عزیز تھیں اور بالخصوص وہ لڑکیاں جو بہت دور سے آئی ہوئی تھیں ان کے ساتھ ان کا رویہ کچھ زیادہ ہی مشفق تھا لیکن ان کی شفقت سونے کے نوالے اور شیر کی نظر والے محاورے کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔ صندل بی سب لڑکیوں کے معاملے میں ان پر بہت بھروسا کرتی تھیں اس لیے وہ محتاط رہنا ضروری سمجھتی تھیں۔ تب تک زہرہ اپنی بے صبری پر قابو پا چکی تھی اور ابھی کچھ شرمندہ نظر آتی تھی۔

''جی اچھا۔ میں کھانا نکالنا شروع کروں؟'' اس نے ان کی جانب دیکھے بنا پوچھا تھا

''ابھی آدھ گھنٹہ اور ٹھہر جاؤ۔ ابھی تو سب نماز وغیرہ پڑھ رہے ہوں گے۔'' انہوں نے کہا پھر بغور اس کی جانب دیکھا۔ اس کا نظریں چرانا صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''ہری حویلی سے آنا تھا کسی نے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''نہیں تو...... میرا مطلب، مجھے کیا پتا۔ شاید۔'' اس سے بات نہ بن پائی تھی۔

''تو پھر؟ تم نے کیوں پوچھا کہ ہری حویلی سے آیا ہے کوئی؟''

وہ بالکل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ چپ رہی۔ دل کی دھڑکن کافی تیز ہوئی جا رہی تھی اور

چہرے کا رنگ دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اسے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ بھی بدلا ہوا ہوگا۔ اس نے یک دم ہی اپنی پشت ان کی جانب کی اور ان ہی کی طرح صافی اٹھا کر پلیٹوں کی نادیدہ گرد صاف کرنی شروع کر دی۔

''تمہیں کیوں انتظار ہے ہری حویلی والوں کا؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ تب تک زہرہ کو جواب سوجھ چکا تھا۔

''جی۔ ہاں جی۔ وہ اخروٹ آتے ہوتے ہیں نا وہاں سے۔ اور پستہ کاجو بھی۔ تو میں نے سوچا کوئی آیا ہوگا تو یقیناً سوغاتیں بھی لایا ہوگا۔ اس لیے خوش ہو گئی تھی۔ بہت دل چاہ رہا تھا بہت سارا پستہ بادام ڈال کر کشمیری چائے پینے کا۔''

اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ تائی شاہدہ کے چہرے پر ممتا تڑپ کر ابھری تھی۔ کھانے پینے والی باتیں ان کا دل فوراً موم کر دیتی تھیں۔

''ارے جھلی۔ کہتی تو سہی۔ میں بنا دیتی۔ میرے کمرے میں پڑے ہیں پستہ بادام۔ مجھ سے لے لیتی۔'' انہوں نے محبت سے تلقین کی پھر پہلی والی پلیٹ واپس رکھ کر دوسری اٹھاتے ہوئے بولیں۔

''کسی اور کے سامنے بھی دوبارہ ہری حویلی کے متعلق ایسے نہیں پوچھنا۔ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ رائی کا پہاڑ ہی نہیں بناتے۔ اس پہاڑ پر چڑھ کر آپ کو دھکا بھی دے دیتے ہیں۔'' زہرہ چوری بنی چپ چاپ مسلسل پلیٹ کو رگڑنے میں مصروف رہی۔

☆☆☆

''کیا واقعی نور القلوب اس ننھی سی پرچی میں مقید ہے؟''

بیس اکیس سال کی اس لڑکی کے چہرے پر حیرت نہیں تھی، وہ صرف سوال برائے سوال کی نیت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اب عقیدت کا اظہار نمایاں ہونے لگا تھا۔ صندل بی کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ انہوں نے دیکھا تھا لوگ ان سے پُراعتماد ہو کر ملنے آتے تھے اور پھر ان کی شخصیت کے سحر سے سحر زدہ ہو کر گھبرائے ہوئے لگنے لگتے تھے۔ وہ لڑکی مردان سے ان کا انٹرویو کرنے کی غرض سے آئی تھی۔ اس کی یونیورسٹی کی کوئی اسائنمنٹ کے سلسلے میں وہ ایسی خواتین کے متعلق معلومات جمع کر رہی تھیں جن کی شخصیت متاثر کن تھی۔

صندل بی انٹرویوز وغیرہ نہیں دیتی تھیں لیکن یہ بچی کسی جاننے والے کے توسط سے آئی تھی تو انہوں نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا تھا۔ اسے درس گاہ کا وزٹ بھی کروا دیا تھا اور چائے بھی پلا دی تھی لیکن ساتھ ہی پابند بھی کیا تھا کہ وہ کوئی تصویر لے گی نہ ان کا کوئی موقف کسی جگہ شائع کرے گی۔

''میں نے یہ تو کبھی کسی سے نہیں کہا۔'' اس کے سوال کے جواب میں وہ سادہ سے انداز میں بولی تھیں۔

''آپ نے نہیں کہا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ درس گاہ پر آنے والے ہر شخص کو دلی سکون کے لیے ایک پرچی دیتی تو ہیں۔'' وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔ صندل بی نے اس کا سوال تحمل سے سنا پھر اس کا سوال اسی کو لوٹا دیا۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے انہیں کیا دینا چاہیے؟'' وہ لڑکی اس دوٹوک جواب پر لحہ بھر کے لیے گڑبڑائی پھر دوبارہ سے اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی

''میں تو یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا ایک سفید پرچی کسی کو سکون فراہم کر سکتی ہے؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔

''اگر ایک سفید گولی کسی کو درد سے نجات دے سکتی ہے تو ایک سفید پرچی دل کو سکون کیوں نہیں دے سکتی۔'' وہ اسی انداز میں بولیں۔ اس لڑکی نے سر ہلایا۔

''لیکن اس پرچی پر کیا لکھتی ہیں آپ؟'' صندل بی نے چاندی کے کٹورے کو اسی جانب سرکایا جس میں پرچیاں ہی پرچیاں تھیں۔

''میں تو کچھ بھی نہیں لکھتی؟'' اس جواب پر وہ لڑکی کنفیوژ نظر آنے لگی تھی۔

''واقعی؟ تو کیا وہ تعویذ بلینک ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی کسی کو تعویذ نہیں دیا۔'' صندل بی کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ صندل بی نے چاندی کا کٹورا اس کے آگے سرکایا جس میں بہت سی سفید پرچیاں تھیں۔

''ان میں سے کوئی ایک اٹھائے۔ جو تمہارا دل چاہے۔'' وہ اسے دعوت دے رہی تھیں۔ اس لڑکی نے تذبذب کے عالم میں وہ پرچی اٹھائی پھر استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھ کر پوچھنا چاہا کہ آیا وہ اس پرچی کو کھولے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس لڑکی نے وہ پرچی کھول لی تھی۔ وہ واقعی سادہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔

''یہ تو واقعی خالی ہے۔'' وہ حیران تھی۔ صندل بی کا شہرہ جس بنا پر تھا وہ وجہ جھوٹی لگنے لگی تھی۔

''ایک اور اٹھا لو۔'' انہوں نے ترغیب دی۔ اب کی بار لڑکی نے ایک اور پرچی چُن کر اٹھائی اور اسے بعجلت کھول کر دیکھا۔ وہ بھی خالی تھی۔ اس نے بنا اجازت لیے پھر ایک پرچی اٹھائی اور وہ بھی خالی نکلی۔

''یہ سب تو واقعی خالی ہیں۔'' وہ مایوس نظر آنے لگی تھی۔

''میں نے کبھی یہ دعوا نہیں کیا کہ میں اس پر کچھ لکھتی بھی ہوں۔ میں نے فقط اتنا کہا کہ ایک سفید پرچی بھی سکون فراہم کر سکتی ہے۔''

''لیکن کیسے۔ مطلب یہ کیسا تعویذ ہے۔ جس پر کچھ لکھا ہوا ہی نہیں ہے۔''

''اس لیے کہ یہ تعویذ نہیں ہے۔ میں تعویذ نہیں دیتی۔ میں صرف یہ سادہ کاغذ کا ٹکڑا دیتی ہوں۔ اس کے نیچے ایک ننھا سا واٹر مارک ہے جس پر نور القلوب لکھا ہے۔'' ان کے کہنے کے بعد لڑکی نے پرچی کو بغور دیکھا تھا۔ اس پر واقعی ایک واٹر مارک تھا۔

''اب لینے والے کی مرضی ہے کہ وہ اس کاغذ پر جو مرضی لکھ لے کیونکہ میرا ماننا ہے یہ سفید پرچی انسان کے دل کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی یہ آپ کے دل کا استعارہ ہے۔ آپ کے دل کو اتنا ہی صاف ہونا چاہیے۔ جتنا کہ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ آپ کا دل، آپ کا قلب صاف ستھرا ہوگا تو روشنی خود اپنی جگہ بنا لے گی۔ پھر آپ کو نور القلوب کے لیے کہیں بھٹکنا نہیں پڑے گا۔''

وہ نہایت مطمئن لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر مایوسی مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ صندل بی کا بہت چرچا سن کر آئی تھی۔

''میں جانتی ہوں اب تم اس بات کے لیے پریشان ہو رہی ہو کہ اس کاغذ کی بنا کسی حروف والی پرچی کی اتنی شہرت کیوں ہے۔'' انہوں نے اس سے سوال کیا تھا۔

''دیکھو بچی! بات یہ کہ تم بہت دور سے آئی ہو۔ اور شاید بہت سی کہانیاں سُن کر آئی ہو لیکن یقین کرو۔ وہ سب کہانیاں جھوٹ ہیں۔ من گھڑت ہیں اور سادہ لوح عورتوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ میں نے ہمیشہ ایسی کہانیوں کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اگر میں چاہتی تو میں تمہیں کوئی ایسی بات گھڑ کر سنا دیتی جس سے تمہارے تجسس کی تسکین ہو جاتی لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سے یہی نصیحت کرتی آئی ہوں کہ اگر نور القلوب چاہیے تو اپنے دل میں جھانکیں۔ اپنی روح میں تلاش کریں۔ بھلا اپنے گھر کی روشنی کوئی غیروں سے لینے جاتا ہے۔ اور پھر بھی یہ روشنی کہیں کھو بیٹھے ہیں تو اللہ کی ذات سے مانگیں۔ وہی قادر ہے۔ جس کو چاہے منور کردے۔ جس کو

چاہے معطر کر دے۔"

وہ خاموش ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے بڑی لمبی سانس بھری۔

"یہ پرچی بھی صرف اس غرض سے رکھ چھوڑی ہے کہ سادہ لوح عورتیں اس کے بغیر مانتی نہیں ہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ وہ مایوس ہو کر کسی جعلی عامل کے آستانے پر خوار ہوں۔ میں اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتی ہوں۔ میں ان کو یہ پرچی دیتی ہوں اور کہتی ہوں قرآن پڑھو۔ درود پڑھو۔ اللہ کے ننانوے نام ہیں۔ رسول اللہ کے ننانوے نام ہیں۔ ان میں سے جو دل کو بھائے اسے ہی اپنا معمول بنالیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ دل اس پرچی کی طرح صاف ہو پھر نور القلوب کے لیے تو لفظ "اللہ" ہی کافی ہے۔"

صندل بی کا انداز اتنا دو ٹوک تھا کہ وہ لڑکی مزید کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

"انہوں نے واقعی تم سے ایک بار بھی نہیں پوچھا؟" ارباب نے ساری بات سُن لینے کے بعد تیسری دفعہ سوال کیا تھا۔

"نہیں۔" خوشل جو دل ہی دل میں اب سخت کوفت کا شکار ہو رہا تھا کہ دوست کے سامنے بھرم کھل گیا تھا۔ اس نے تفصیل تو بتادی تھی کہ اسے ایک سامع کی اشد ضرورت تھی کیونکہ اپنی بہترین سامع (گلے) سے تو وہ ناراض ہو کر آ گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اگر اب بھی کسی سے کچھ نہیں کہے گا تو شاید اس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی لیکن کہہ دینے کے بعد بھی دل میں چور سا محسوس کر رہا تھا خود کو۔ اور پھر ارباب کا ری ایکشن بھی اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس لڑکے کو سنجیدگی چھو کر نہیں گزری تھی۔

"حیرت ہے۔ خان صاحب تو اتنے لبرل لگتے ہیں۔ انہوں نے تم سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔" وہ بڑبڑایا پھر اس کی جانب جھکا۔

"وہ لڑکی اچھی نہیں ہے کیا؟" لہجے میں افسوس پہلے سے زیادہ در آیا تھا۔ خوشل نے اسے نکاح کا ہی بتایا تھا۔ یہ نکاح کس کے ساتھ ہوا یہ نہیں بتایا۔ تھا

"نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔ لاریب کے برا ہونے کے متعلق تو کوئی دو رائے تھیں ہی نہیں۔

"تم بالکل خوش نہیں ہو؟" ارباب کا تیسرا سوال پہلے دو سے بھی گیا گزرا تھا۔

"نہیں......" خوشل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ جو پہلے دو سوالوں سے ہی اچھا خاصا چڑ چکا تھا، اونچی اور ناگوار آواز میں غرا کر بولا۔ ارباب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ناگواری سے اس کی جانب دیکھا۔

"ایسی "نہیں" ایک بار اپنے باپ کے آگے کی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑ رہا ہوتا۔ اونہہ کان کا پردہ پھٹتے پھٹتے بچا ہے میرا۔"

خوش الحان نے شاکی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔ اسے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ اتنے کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا اور آج سے پہلے کسی کے سامنے اس طرح کمزور پڑا بھی نہیں تھا لیکن اسے جب جب یہ احساس ستاتا تھا کہ خان بابا نے لاریب کو اس پر فوقیت دی ہے تو اسے بے پناہ تکلیف ہوتی تھی۔ ارباب کا رویہ اس تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔

"ارباب! معاف کر دو مجھے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی جو تم پر بھروسا کر کے دو لفظ کہہ بیٹھا۔ تم سمجھو تم کوئی فضول قسم کا ڈرامہ دیکھ رہے تھے جس نے تمہارا وقت ضائع کیا۔ اور جو بھی بکواس میں کر بیٹھا ہوں اسے بھول جاؤ۔" وہ نہایت شاکی لہجے میں بولا تھا۔

"اگر نہ کروں تو۔ مطلب کے معاف نہ کروں تو کیا کر لو گے تم؟" وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھ کر بولا۔

خوش الحان ایک ساعت کے لیے تو کچھ بول نہ سکا پھر جیسے اس نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا اور وہاں سے اٹھ جانا چاہا۔

"اوہ مریں۔ اینا نخرہ وی چنگا نئیں ہوندا۔ (اوہ ظالم۔ اتنا نخرہ بھی اچھا نہیں ہوتا)۔" ارباب نے اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی اٹھنے کی کوشش ناکام بنادی۔

"میری جان۔ مجھ سے ناراض ہو کر کیا ملے گا تمہیں۔ میں تو تمہارا دل بہلانے کے لیے یہ سب بکواس کیے چلے جارہا ہوں۔ اچھا چلو نہیں کرتا۔ سوری۔ اب یہاں بیٹھو اور تحمل سے میری بات سنو۔" وہ اب کی بار سنجیدہ تھا۔ خوش الحان نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ اچھا کیا ہے۔ لیکن تم جو اپنے ساتھ کر رہے ہو۔ وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اتنا کچھ غلط ہو جانے کے بعد تم کوکین لینا شروع کر دو گے تو مزید غلط کر دو گے۔" اس کی بات سن کر خوش الحان نے استہزائیہ مگر تھکے ہوئے انداز میں سر جھٹکا۔

"کوکین میں اپنے لیے نہیں تلاش کر رہا۔ وہ تو میں لاریب کے لیے مانگ رہا ہوں۔ کوکین لے حشیش لے یا جو مرضی گولیاں پھانکتی رہے۔ اب نہیں روکوں گا میں۔ بلکہ اپنے ہاتھوں سے لا کر دیتا رہوں گا۔ میری طرف سے جہنم میں جائے وہ۔" وہ بنا سوچے سمجھے بولتا چلا جارہا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ ارباب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"لاریب کے لیے۔ لیکن اس کے لیے کیوں؟" وہ پوچھ تو رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر لکھا تھا کہ خوش الحان نے جو بات چھپانی چاہی تھی، وہ افشا ہو چکی ہے۔ خوش الحان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اس سے نکاح ہوا ہے تمہارا؟ اوہ یار واقعی؟ اس لیے اس روز رات کو فون کر کے اس کا پوچھ رہے تھے تم؟" وہ حیران پریشان مسلسل بولے چلے جارہا تھا۔ خوش الحان اس کے پاس سے اٹھ گیا تاکہ الماری میں سے سونے کے لیے کپڑے نکال سکے۔

"ہائے میرے دوست۔ کیا ہوگا تیرا۔ اتنا ظالم باپ ہے تیرا۔ اتنی زیادتی وہ بھی سگی اولاد سے کون کرتا ہے۔" پہلے افسوس کرنے والے انداز میں کہا پھر مکاری سے بولا۔

"لیکن اچھا ہی ہوا۔ تو نے بھی کون سا اچھی کی ہے کسی کے ساتھ۔ دو دو سو روپے اُدھار دے کر پوری یونیورسٹی میں کتنا ذلیل کرتا رہا ہے مجھے۔ اب میری باری ہے۔"

وہ خباثت سے اسے گھورتے ہوئے کسی فلم کے ولن کی طرح کہہ رہا تھا۔ خوش الحان نے بالکل پروانہ کی کیونکہ یہ اسے بھی پتا تھا ارباب کی شخصیت میں فضول گوئی کے علاوہ ساری عادات اچھی ہیں اور دوستی کا دم بھرتے ہوئے راز کو راز رکھنا ان ہی اچھی عادات میں سے ایک تھا۔

☆☆☆

حویلی میں دوپہر کے وقت عام طور سے اتنا سناٹا ہوتا نہیں تھا کیونکہ حویلی کے صحن میں تندور نصب تھا اور پڑوس والی خواتین روٹی لگانے کے لیے آتی جاتی رہتی تھیں مگر چونکہ آج گلے اپنے کمرے میں بند تھی تو ماسی حبیبہ نے تندور کو دہکایا ہی نہیں تھا۔ چند ایک خواتین پوچھنے آئی تھیں لیکن تندور کو ٹھنڈا دیکھ کر واپس چلی گئی تھیں۔

لاریب پہلے تو اپنے کمرے میں بیٹھی رہی پھر بوریت سے اکتا کر باہر آگئی۔ اس کے پاس کرنے والا کوئی کام نہیں تھا اور اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس کی پڑھائی، اس کی دلچسپیاں، اس کی زندگی سب کچھ ایک سوالیہ نشان بن چکے تھے۔ مستقبل میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ وہ خود کیا کرنے والی تھی۔ اس کے متعلق اس نے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا لیکن وہ پریشان بھی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پاس سوچنے سمجھنے کی کوئی صلاحیت

ہی نہیں ہے۔ پانی پر رکھی کاغذ کی کشتی کی طرح وہ بس بہہ رہی تھی۔ اور مزے سے بہہ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی زندگی گزشتہ چند دنوں میں کتنے ہی مدوجزر دیکھ چکی ہے۔

وہ بے پروائی سے چلتی ہوئی اپنے لیے مخصوص کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ سردی چونکہ پنجاب سے زیادہ تھی، اس لیے جینز کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی مگر خان بابا کا احساس کر کے کندھوں پر شال بھی اوڑھ لی تھی کیونکہ کلثے کو اس نے ہمیشہ چادر اوڑھے ہی دیکھا تھا۔ برآمدے کے باہر صحن میں بھی سناٹا ہی تھا۔ دور کہیں سے پالتو پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی بالکل باہر کی جانب آ گئی جہاں سے حویلی کا آہنی گیٹ نظر آتا تھا۔

گیٹ کے قریب خان بابا کی وہی جیپ کھڑی تھی جس میں وہ یہاں آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی جیپ کے قریب آ گئی تھی پھر اسے سراہنے والے انداز میں جیپ کو دیکھا تھا۔

حویلی کی ایک بات اسے بہت متاثر کن لگی تھی یہاں صفائی بے حد تھی اور ہر چیز میں ایک عجیب ہی سلیقہ اور قرینہ تھا۔ یہی حال اس جیپ کا بھی تھا۔ وہ بظاہر ایک پرانی گاڑی تھی لیکن اسے اتنی نفاست سے استعمال کیا جاتا تھا کہ وہ نئے ماڈل کی طرح چم چم کرتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو حیرت انگیز طور پر وہ لاک نہیں تھا۔ اگنیشن میں چابی بھی اٹکی تھی وہ بنا سوچے سمجھے اندر سوار ہو گئی اور چابی کو گھما دیا۔ ذرا سی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ انجن کے چلنے کا مخصوص شور پیدا ہوا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ وہ بہت اچھی ڈرائیور تھی لیکن کوئی کتنا بھی اچھا ڈرائیور کیوں نہ ہو۔ کسی اور کی گاڑی قابو میں آتے کچھ وقت لیتی ہے۔ یہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ذرا سے تذبذب میں گاڑی پورچ تک لے گئی تھی۔

"ارے ارے۔ کون ہے بھائی۔" اسے اپنے عقب سے کوئی خونخوار انداز میں چلاتا ہوا نظر آیا۔ وہ چونکہ پشتو بول رہا تھا تو اسے جملے کا متن سمجھ میں نہیں آیا مگر اس نے وہیں بریک لگا دی تھی۔

"چور ہو تم؟" وہ شخص قریب آ کر غصے سے چلایا تھا پھر جب اس پر نگاہ پڑی تو خاموش ہو گیا۔ آنکھوں میں خفگی کی جگہ حیرت نے لے لی۔

"میں تمہاری جیپ کھانے نہیں لگی تھی وراثت۔ ذرا سا شوق پورا کرنے کی کوشش میں یہاں تک لے آئی تھی۔"

لاریب نے اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ اپنایا تھا۔ خان بابا کے ڈرائیو سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھی لیکن اسے براہِ راست مخاطب پہلی بار کر رہی تھی۔ وراثت کے جواب کا انتظار کیے بغیر گاڑی ریورس کرتے ہوئے انتہائی تیزی سے اسی مقام پر لے آئی تھی جہاں سے چلا کر گیٹ کے قریب لے گئی تھی۔ وراثت کو اتنے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اسے امید تھی کہ یہ شہری خاتون اسے اس کا نام لے کر مخاطب کرے گی۔

"معاف کیجیے گا بی بی۔ مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ آپ ہیں۔"

اس نے قریب آ کر معذرت کی تھی۔ لاریب ایک جھٹکے سے نیچے اتری تھی۔ کمزوری تا حال جسم میں موجود تھی سو گرتے گرتے بچی۔ وراثت نے فوراً ہاتھ سے سہارا دیا تھا۔ وہ سنبھل گئی تو وراثت فوراً پیچھے ہو کر مؤدب کھڑا ہو گیا تھا۔

"ورنہ۔ تم کیا کرتے۔ مجھے گاڑی چلا لینے دیتے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ وراثت نے ذرا کی ذرا آنکھیں اٹھا کر جیپ کی جانب دیکھا اور کن اکھیوں سے اس کی جانب۔

"میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں بی بی۔ خان کی جاگیر میں ہر چیز خان کی ہے۔ اور جو چیز خان کی ہے۔ وہ آپ کی ہی ہے۔" لاریب نے سر ہلایا جیسے یہ بات اچھی لگی ہو۔

''اچھی بات ہے۔ یہ بات ذرا اپنے خوشل خان کو بھی سمجھا دو۔ اسے یہ بات اکثر بھول جاتی ہے۔'' اس نے حکم دینے والے انداز میں کہا تھا۔ اب کی بار وراثت کچھ نہیں بولا تھا لیکن کچھ اُلجھ سا گیا تھا۔ لاریب مزید کچھ کہے بنا واپس مُڑ گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا بچکانہ حرکت ہے گلِ لالہ!'' وہ اس کے بستر پر اس کے سامنے بیٹھے سوال کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ اُٹھ کر تو بیٹھ گئی تھی مگر رندھا لہجہ اور سرخ آنکھیں چھپائے نہ چھپ رہی تھیں۔ وہ اس کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔

''میں بس آ رہی تھی باہر۔'' اس نے نظریں چُراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ انہوں نے محبت سے اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے اسکے چہرے کو تھپتھپایا تھا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ باہر آئیں۔ آپ بھلے سے سارا دن اس کمرے میں بیٹھیں لیکن ایسے حلیے میں نا بیٹھیں۔ یہ روئی روئی سی پریشان حال گلِ لالہ ہری حویلی کو پسند نہیں ہے۔ اور مجھے بھی۔''

خان نے اپنی دلِ داری عام حالات میں بھی کی ہوتی تو گلے قربان ہو جاتی مگر ابھی صورتحال بالکل مختلف تھی۔ اسے ان کی باتیں سُن کر مزید رونا آنے لگا۔

''میں تو برباد ہو گئی خان! وہ میرے منہ پر ہی کہہ گیا کہ میں اس کی کچھ نہیں لگتی۔ ایک ہی جست میں سارے رشتے ختم کر دیے اس نے۔ کہتا ہے میں بس اس کی مری ہوئی ماں کی بہن ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں۔''

وہ کچھ اور بات کر رہے تھے لیکن گلے کے ذہن سے اس کا خوشل ہی چمٹا تھا۔ جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھیں پھر بہنے لگی تھیں۔

''کیا کہہ دینے سے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ کہہ دے گا اور آپ کا اس سے رشتہ ختم ہو جائے گا۔'' خان نے زِچ ہو کر سوال کیا تھا۔

''وہ تو یہی سمجھتا ہے نا۔ اور سوتیلے رشتے بس سمجھ بوجھ کے ہی ہوتے ہیں۔ تسلیم کر لیے جائیں۔ تو ہیں۔ ورنہ نہیں۔ وہ توڑ گیا ہے سب رشتے۔'' وہ اسی گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

''اس کے باپ کی بھی مجال نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ رشتہ توڑے۔ کیوں فکر کرتی ہیں آپ۔ اسے واپس آنے دیں۔ آپ کے سامنے کان کھینچوں گا اس کے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے تسلی کیسے دیں۔ انہیں اس کی جانب سے اس قسم کے ری ایکشن کی توقع بھی نہیں تھی۔

''کیسے خان؟ کیسے ٹھیک ہو گا۔ میں چھوٹی بچی ہوں کیا۔ جو آپ کی ایسی بچکانہ باتوں سے بہل جاؤں گی۔ آپ میری حالت تو دیکھیں۔ ساری عمر کی ریاضت خاک میں مل گئی ہے۔'' وہ سنبھل ہی نہ رہی تھی۔ ہر جملے سے پہلے وہ بھل بھل آنسو گراتی تھی اور پھر اپنی بات مکمل کرتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے برابر آ بیٹھے اور پھر یکدم اس کے کندھے پر اپنا بازو رکھ کر اسے قریب کیا تھا۔ ایک سمجھ دار مرد کی طرح انہیں بھی خبر تھی کہ روتی ہوئی عورت کو چُپ کروانے کا بہترین طریقہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ڈلار سے اس کے سر کو تھپتھپانے لگے تھے۔ گلے کے الاؤ کی طرح بھڑکتے دل کو واقعی سکون مل گیا

''میں نے کہا نا میں ساری صورت حال کو سنبھال لوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ پہلے خود کو سنبھالیں۔ آپ اگر اس طرح کریں گی تو میں بہت اکیلا پڑ جاؤں گا۔'' چند لمحے وہ اسی طرح اسے اپنے ساتھ لگائے بہلاتے رہے پھر جب احساس ہوا کہ وہ رونا بند کر چکی ہے تو انہوں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں۔ میں پریشان نہیں ہوں۔ کیا مجھے احساس نہیں ہے کہ خوش الحان اس ساری صورت حال سے ناخوش ہے۔ لیکن یقین کریں گلِ لالہ یہ آخری داؤ ہے۔ میری آخری قربانی۔ اس کے بعد کچھ اچھا ہی ہوگا۔ خدا مجھے مزید آزمائش میں نہیں ڈالے گا۔ ان شاء اللہ'' وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہے تھے۔ گلے ان کے لہجے کی استقامت پر دل ہی دل میں ماشاء اللہ بول چکی تھی لیکن زبان سے شکوہ ہی نکلا۔

''اللہ آپ کی مدد کرے خان۔ لیکن آپ میری اولاد کو قربان کیے بغیر بھی اپنے مالکوں کا احسان اتار سکتے تھے۔'' خان بابا کے بازو کی گرفت اس کے گرد نرم پڑی۔

''احسان تو کب کا اتار چکا ہوں گلِ لالہ۔ اب تو احساس کا بدلہ اتار رہا ہوں۔ وہ احساس جو اس خاندن کا میرے دل میں ہے۔''

انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ وقت جیسے کہیں بہت پیچھے کی طرف سفر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''یہ کون ہے ڈیڈی۔'' ایک آٹھ دس سال کی لڑکی اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بس سہا ڈرا ہوا اپنی ٹوٹی ہوئی چپل کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے چوری کی تھی یہ سچ تھا لیکن وہ کوئی چور نہیں تھا یہ بھی حقیقت تھی۔ وہ دور پہاڑوں سے اس میدانی علاقے کی طرف بہت رنگین قصے سُن کر آیا تھا۔

''وہاں ہر وقت گرم روٹی کھانے کو ملتی ہے۔''

''وہاں لوگ پانی بھر کر نہیں لاتے بلکہ پانی ٹونٹیوں میں آتا ہے''

''وہاں ہر کام کی اُجرت وقت پر مل جاتی ہے''

''وہاں ایک وقت کی روٹی کے لیے سیاحوں کی ''خدمت'' نہیں کرنی پڑتی۔''

اس کے چچازاد بھائی جو پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقوں میں کام کی غرض سے گئے تھے، وہ یہی قصے سنایا کرتے تھے اور اسے ان قصوں میں بہت کشش محسوس ہوتی تھی۔

گھر میں غربت اتنی تھی کہ دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے پوری پڑتی تھی اور رہی سہی کسر باپ کے انتقال نے پوری کر دی۔ ماں پہلے ہی سوتیلی تھی۔ ایسی صورت حال میں جب کسی نے کراچی کی راہ دکھائی تو وہ فوراً ساتھ چل پڑا لیکن کراچی آ کر اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ قصہ اور حقیقت کا فرق اصل میں ہوتا کیا ہے۔ قصہ جو سننے میں نرم گرم بستر کے جیسا تھا حقیقت میں کھردرے چبھتے ہوئے بستر کی مانند کاٹتا تھا۔ اسے اپنی ہی برادری کے ایک ڈھابے پر ملازمت تو مل گئی تھی لیکن کھانا وقت پر ملنا تو دور کی بات ہے کھانا ملتا ہی نہیں تھا۔ گندی پلیٹیں دھو دھو کر اس کی کمر دوہری ہو جاتی تھی اور پھر اس سے دس دس سال بڑے لڑکے جو ہیں ڈھابے پر ملازم تھے رات کو اسے تنگ کرتے تھے۔

ایک دن موقع پا کر وہ وہاں سے بھاگ نکلا لیکن دو دن بعد ہی اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ میدان تو پہاڑوں سے بھی زیادہ ظالم ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں رونے کے لیے اوٹ مل جاتی تھی، لیکن میدانوں میں رونے کے لیے بھی جگہ نا ملتی تھی۔ اسی کشمکش میں بھوکے پیٹ کو رام کرنے کے لیے اس نے ایک گھر کے کھلے گیٹ سے نقب لگا کر کھانا چوری کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش اتنی بُری طرح ناکام ہوئی کہ اسے گھر کے ملازمین نے پکڑ لیا اور پھر اس کی اتنی دھنائی ہوئی کہ اسے مری ہوئی ماں یاد آ گئی۔

☆☆☆

ان کا نام محمد خلیق تھا اور وہ اس گھر کے مالک تھے جہاں اس نے چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے

پہلے تو ملازمین سے اس کی پٹائی کروائی تھی پھر اسے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا تھا۔

”حبیب اللہ جس کے گھر کا رزق کھالو۔ اسے کبھی دغا نہ دینا۔“ انہوں نے پہلے نصیحت کی تھی پھر اس کے حالات زندگی کے بارے میں تفصیل سے پوچھا تھا اور آخر میں مہربانی کرتے ہوئے اسے اپنے یہاں ملازمت دے دی تھی۔

”میں پاکستان میں نہیں رہتا۔ میں اور فیملی ہر دو یا تین سال بعد پاکستان آتے ہیں۔ ہر سال یہاں آکر میری بیٹی لاتعداد پرندے خریدتی ہے اور تین مہینے ان کا خوب خیال رکھتی ہے پھر ہم واپس چلے جاتے ہیں تو یہ پرندے آہستہ آہستہ مر جاتے ہیں حالانکہ صفائی کی خاطر جو ایک ملازمہ آتی ہے ہم اسے پرندوں کا خیال رکھنے کے الگ سے پیسے دیتے ہیں مگر وہ لاپروائی کرتی ہے اور پرندے کبھی بھی چھ ماہ سے زیادہ نہیں بچ پاتے۔ میں چاہتا ہوں تم اس گھر میں رہو اور ان پرندوں کا خیال رکھو۔ تم مجھے اچھے اور سچے لگے ہو۔ میں تمہیں پرندوں کی خدمت کی شرط سے آزاد بھی کر سکتا ہوں لیکن حبیب اللہ۔ کبھی بھی کوئی ایسی کوئی چیز قبول نہ کرنا جو تمہیں بغیر تمہاری محنت کے دی جا رہی ہو۔ یہ انسان کی عظمت کے خلاف ہے۔“

حبیب اللہ کو اتنی محبت سے کبھی کچھ اس کے باپ نے بھی نہیں سمجھایا تھا۔ وہ اسی لمحے اس شخص کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

”یہ کون ہے ڈیڈی؟“ اسی لیے جب ان کی بچی نے ان سے پوچھا تو انہوں نے حبیب اللہ کی جانب اعتماد سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا

”یہ حبیب اللہ خان ہے۔ یہ ہمارے گھر میں رہے گا۔ آپ کو بہت ٹینشن ہوتی تھی نا کہ جب آپ چلی جاؤ گی تو آپ کے پرندوں کو دانہ پانی کون دیا کرے گا تو اس لیے میں نے حبیب اللہ کو ہائر کیا ہے۔ وہ یہیں رہے گا اور نا صرف پرندوں کو کھانا پانی دیا کرے گا بلکہ ان کے پنجروں کی صفائی بھی کیا کرے گا۔“

”حبیب اللہ خان نہیں۔ حبیب صاحب۔ جب کسی کو ہائر کرتے ہیں تو ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔ آیئے حبیب صاحب میں آپ کو پرندے دکھاتی ہوں۔“

ان کی بیٹی ان سے بھی زیادہ مہربان تھی۔ حبیب اللہ خان کو اس روز قدرت کے ہیر پھیر میں صحیح سمجھ میں آئی تھی۔ وہ جب آپ پر مہربان ہونا چاہتی ہے تو مواقع خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں پھر چاہے سنڈریلا ہو یا حبیب اللہ۔ راہیں خود ہموار ہو جاتی ہیں۔ چیزیں سنور جایا کرتی ہیں۔ حالات خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

”میں آجاؤں صندل بی!“ زہرہ نے ان سے اجازت طلب کی تھی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ نے بلایا تھا مجھے؟“ وہ مودب سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔ آجاؤ۔“ انہوں نے اجازت دی۔ زہرہ دبے پاؤں دبیز قالین پر چلتی ان کے قریب آگئی۔ وہ بستر پر تکیہ ٹکائے بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ بے حد پھیکا سا نظر آتا تھا جیسے کچھ بیمار ہوں۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے پوچھا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دھکن سی محسوس ہو رہی ہے اس لیے آج شام کا لیکچر تم نے کرنا ہے۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ بچیوں کا وقت ضائع ہو۔ وہ سب بہت دور سے آتی ہیں۔ اگر انہیں واپس لوٹائیں گے تو مایوس ہو کر جائیں گی اور نور القلوب سے کوئی مایوس ہو کر جائے یہ مجھے اچھا نہیں لگتا“ وہ پژمردگی سے بولی تھیں۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں کرلوں گی۔ آپ کے سر میں تیل ڈال دوں؟“ وہ محبت سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں

نے انکار میں سر ہلایا۔
''نہیں زہرہ۔ وقت ضائع نہیں کرو اور جا کر لیکچر تیار کرلو۔ اگر درمیان میں کوئی سوال کرے گا تو تمہیں پریشانی ہوگی۔'' انہوں نے رسانیت سے کہا۔
''میں نے تو پہلے ہی سے آپ کے سب لیکچرز زبانی رٹ رکھے ہیں صندل بی۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''
وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی تھی۔ صندل بی درس گاہ کی کسی بھی لڑکی کو جب اس طرح کی ڈیوٹی دیتی تھیں تو یہ بہت فخر کا لمحہ ہوتا تھا۔ صندل بی تھکے ہوئے انداز میں مسکرائیں۔
''نہیں زہرہ۔ پھر بھی تیاری کرلو۔ لوگ ہم جیسوں کی غلطیاں محدب عدسے لگا کر ڈھونڈتے ہیں۔ دین کو سکھانے والے کی غلطی یہ زمانہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم سے کوئی غلطی ہو۔ ایک ذرا سا لفظ بھی اوپر نیچے ہوا تو نور القلوب داؤ پر لگ جائے گا۔''
ان کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ زہرہ کی ان سے ایسی بے تکلفی تو نہیں تھی کہ کوئی سوال کرتی مگر پھر بھی جانے کیوں پوچھ بیٹھی۔
''کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان لگتی ہیں؟''
وہ ٹالنے والے انداز میں مسکرائیں۔
''ارے نہیں۔ پریشانی کس بات کی۔ بس سوچتی ہوں لوگ نور القلوب ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آتے ہیں۔ اور پھر عجیب عجیب قصے کہانیاں بھی مشہور کردیتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں لوگ۔''
زہرہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گئی تھی صندل بی ذہنی طور پر الجھی ہوئی ہیں۔ اسے وہی کرنا چاہیے تھا جس کا حکم اسے صندل بی نے دیا تھا لیکن پھر بھی وہ دوسرا سوال پوچھ لیا۔
''ایک بات پوچھوں صندل بی۔ کیا آپ کے پاس ہے نور القلوب؟'' صندل بی ششدر رہ گئی تھیں۔ یہ پوچھنے والا سوال تھا کیا؟ انہیں یہ سوال بالکل اچھا نہ لگا تھا۔
کیا ان کی نمازیں روزے عبادات زندگی بھر کی ریاضت یہ بتانے کو کافی نہیں تھی کہ ان کے پاس نور القلوب کی دولت ہے۔ کیا ان کا پُرنور چہرہ دنیا کو یہ بتانے کو کافی نہیں تھا کہ ان کا دل نور القلوب کی دولت سے مالا مال ہے۔ کیا ان سے کوئی غلطی ہوگئی تھی؟

☆☆☆

''یہ ایک ہفتہ گزر کیوں نہیں رہا۔ ایسا لگتا ہے وقت جیسے ایک ہی مقام پر ٹھہر گیا ہے۔'' داؤد نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور موبائل کو سامنے پڑے ہولڈر میں ایڈجسٹ کر کے رکھنے لگا۔ وہ شیریں سے ویڈیو کال پر بات کررہا تھا۔ ویڈیو میں شیریں اپنے بیڈ پر سلیپنگ پاجامہ میں بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے پاک تھا۔ اس نے داؤد کی بات پر نفی میں سر ہلایا۔
''مجھے تو لگتا ہے وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ ابھی اتنے کام کرنے باقی ہیں اور وقت ہے کہ بھاگا چلا جارہا ہے۔''
اس دوران فلپینو ملازمہ ایک شخص کے کھانے کے برتن ٹرے میں رکھ کر اس کے سامنے لے آئی تھی۔ اس کی موجودگی کی وجہ سے شیریں ذرا خاموش ہوئی پھر اس نے باقی جملہ اردو میں ادا کیا تھا۔
''تمہیں پتا ہے میرے ویڈنگ ڈریس کا کچھ ابھی تک ریڈی نہیں ہوا۔ مجھے اتنی اینزائٹی ہورہی ہے سوچ کر کہ اگر یہ وقت پر نہ ملا تو کیا ہوگا۔'' شیریں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ان کی ترتیب کو عادتاً دائیں

سے بائیں کیا تھا۔

"یار۔ ایسی چیزیں تو کہیں سے بھی مل جاتی ہیں۔ تم کہو تو میں یہاں دبئی سے لے آتا ہوں۔ بلکہ میں کل تمہیں کال کرلوں گا مارکیٹ سے۔ میری اپنی بھی دو ایک چیزیں رہتی ہیں۔ تم دیکھتی رہنا واٹس ایپ پر۔ جو تمہیں اچھا لگے بتا دینا۔ میں لے آؤں گا۔" داؤد نے چکن تکہ والی پلیٹ کو اپنے آگے کیا اور کانٹے کی مدد سے ان کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوہ کم آن داؤد۔ کسٹمائزڈ کلچ ہے میرا۔ ویڈنگ گاؤن کے ساتھ کمپلیمنٹ کرتے ہوئے بنوایا ہے۔ مجھے وہی چاہیے۔ اور تم اس طرح کہہ کر میری اینزائٹی میں اضافہ نہ کرو۔ میں تو اب ڈیزائنر کو کچا کھا جاؤں گی اگر اس نے کل تک مجھے ڈیلیور نہ کیا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ ویڈیو میں بھی اس کی تیکھی ناک کو دیکھ کر داؤد مسکرایا تھا۔

"تمہیں اتنی سی بات پر ہائپر ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ تم تو ویڈنگ گاؤن کے ساتھ پولی تھین بیگ بھی ہاتھ میں پکڑ لو گی تو مجھے وہ بھی اچھا لگے گا۔ تمہارے خوب صورت ہاتھ ان چیزوں کے محتاج نہیں ہیں۔" وہ اب پلیٹ میں کیچپ انڈیل رہا تھا۔ شیریں نے مصنوعی ناراضی سے اس کی بات کو سنا۔ ناک کی تیکھی سی اٹھان برقرار تھی۔

"اتنا مکھن مت لگاؤ۔ میں پہلے ہی ٹریڈمل پر دوڑ دوڑ کر پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا اتنا مہنگا ڈیزائنر ویئر مجھے فٹ نا آئے۔ پھر تم کہو گے تمہیں ڈیزائنر ویئر کی کیا ضرورت۔ تم کسی بھی ٹام اینڈ جیری کا ڈریس پہن کر بھی شادی کر سکتی ہو۔"

وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ داؤد کھل کر ہنسا پھر پہلے اپنی پلیٹ موبائل میں اس کو دکھا کر بظاہر کھانے کی دعوت دی پھر کہنے لگا۔

"ہاں تو مجھے تو تم ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ ہماری شادی سادگی سے ہو۔" شیریں نے عجلت بھرے انداز میں اس کی بات کاٹی۔

"اتنا اوور اسمارٹ ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر داؤد۔ یہ سادگی والی سادہ سادہ باتیں کسی اور سے کرنا۔ پہلی شادی ایک ہی بار ہوتی ہے۔ اور محبت کی شادی تو واقعی ایک بار ہوتی ہے۔ اگر ہماری شادی پر تمہاری فائیو فگرز والی دو تین سیلریز لگ بھی گئیں تو کوئی بات نہیں۔" داؤد نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

"ارے میری جان۔ دو تین سیلریز کیوں۔ تم دل کھول کر پورے سال کی سیلریز خرچ لو تو بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں نے تمہیں پرپوز کرتے ہوئے ہی خود کو سمجھا لیا تھا کہ بھائی داؤد تو گیا کام سے۔ اب نہیں بچنے والا کوئی درہم و دینار۔" اس کا موڈ بے حد خوش گوار ہو گیا تھا۔ آفس کی دن بھر کی تھکن جیسے منٹوں میں اڑنچھو ہو گئی تھی۔ موبائل میں نظر آتی شیریں کی مصنوعی ناراضی سے گھورتی ہوئی نگاہیں اسے گدگدا رہی تھیں۔

"اس کا مطلب مجھے پرپوز کرنے سے پہلے کافی ڈر رہے تھے تم؟" اس نے اپنا انداز نشست بدلتے ہوئے کہا تھا۔ اب موبائل میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ عقبی دیوار کی کھڑکیاں زیادہ نمایاں ہونے لگی تھیں۔

"نہیں ڈرنا کیوں تھا۔ مجھے پہلے سے پتا تھا۔ انسان زندگی میں یا محبت بچا سکتا ہے یا درہم۔ سو میں نے محبت کو ترجیح دی۔ میں درہم کے بغیر گزارا کر سکتا ہوں۔ تمہارے بغیر نہیں۔" اس کے لہجے میں سچائی ہی سچائی تھی۔ چند لمحے تو شیریں کچھ بول ہی نہیں پائی۔

"اب کیا ہوا۔ کہاں غائب ہو گئی ہو۔ اور موبائل تو ٹھیک سے رکھو۔ تمہارے روم کی ونڈوز نہیں دیکھنی مجھے۔

میرے روم کی ونڈوز تمہارے روم کی ونڈوز سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ میں جب اِن کو خاطر میں نہیں لا رہا ہوں تو اُن کو کس لیے دیکھوں۔ تمہیں دیکھنا ہے مجھے۔'' وہ تکہ کا آخری پیس منہ میں رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا، شیریں نے موبائل ٹھیک کرتے ہوئے دوبارہ اپنے چہرے کو فوکس کیا تھا۔

''یار۔ تم مجھے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتے۔ تمہاری اتنی محبت میرے الفاظ کھا جاتی ہے۔'' وہ لاچاری بھرے انداز میں بولی تھی۔ داؤد نے میز پر پڑے ٹشو باکس میں سے ایک ٹشو کھینچا پھر دوسرے ہاتھ سے موبائل اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ابھی ٹریلر ہے۔ اصل ایپی سوڈ تو ابھی دکھائی ہی نہیں ہے میں نے۔ تب تو گونگی ہو جاؤ گی تم۔'' وہ موبائل لے کر اب بیڈروم کی جانب چل رہا تھا۔

''اچھا۔ زیادہ آؤٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کام کی بات کرو۔ ایک ویک رہ گیا ہے۔ کام وام بھی نبٹا رہے ہو یا آفس میں ہی بزی رہتے ہو۔ میں تو یہاں کام کر کر کے کھپ گئی ہوں لیکن کام ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے۔'' شیریں نے جان بوجھ کر بات بدلی تھی۔ داؤد اب بیڈروم میں داخل ہو گیا تھا۔

''تم اور ممی بس یہی طعنے دیتی رہنا مجھے۔ حالانکہ میں آفس کے ساتھ ساتھ فلیٹ بھی رینوویٹ کروا رہا ہوں۔ آج بھی دو گھنٹے سیڈار (گھر کی آرائش سے متعلقہ چیزوں کا ایک بڑا برانڈ) والوں کے ساتھ سر کھپایا ہے۔'' وہ بیڈ پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا تھا۔

''ارے ہاں کرٹنز آنے تھے آج آ گئے کیا؟'' شیریں کو یاد آیا تھا۔

''ہاں۔ شام کو ہی آ گئے تھے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے بیک کیمرہ آن کرتے ہوئے اسے دکھایا تھا۔

''یہ سیڈار والے لگا کر گئے ہیں۔ ویڈیو میں شاید اتنا کلیئر نظر نہ آ رہا ہو۔ لیکن کام اچھا ہو گیا ہے۔ ہمارا بیڈروم تو بہت امپریسو ہو گیا ہے۔'' وہ دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دو تین سوئچ ایک ساتھ آن کیے تھے۔ کمرے میں لگی ٹیوب لائٹس بند ہوئیں اور اس کی جگہ نیلگوں روشنی نے لے لی تھی۔

وہ بیک کیمرہ سے اسے پورا منظر دکھا رہا تھا۔ اس کا موبائل کھڑکیوں پر لگے بھاری پردے فوکس کر رہا تھا جن کے ساتھ ہم رنگ نیٹ کے پردے بھی تھے۔ ان کے اوپر چائنیز لائٹس لگی تھیں جن کی وجہ سے کمرے کا ماحول اور بھی رومینٹک ہو گیا تھا۔

''کرٹنز کا کلر تو نظر ہی نہیں آ رہا۔ اتنی نیلی نیلی سی روشنی ہے۔ تم پکچرز کھینچ کر بھیجو نا۔ یا پھر الگ سے ویڈیو بنا کر بھیج دو۔'' داؤد نے بُرا سا منہ بنایا پھر ناک چڑھا کر بولا

''یار۔ میں نہیں بنا رہا ویڈیو شیڈیو۔ یہ وہی کرٹنز ہیں جو تم نے سیڈار کی ویب سائٹ سے پسند کیے تھے۔ وہاں ساری پکچرز موجود ہیں۔ وہاں پر دیکھ لو۔'' شیریں اس کے چڑچڑے انداز پر ہنسی۔

''صبح سے میں انتظار کر رہا تھا کہ تم فارغ ہو تو تم سے بات کروں۔ تمہیں جی بھر کر دیکھوں اور تم ہو کہ کرٹنز کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ مجھے نہیں پتا۔ دو ویکس کی بات ہے پھر تم خود ہی یہاں آ کر دیکھتی رہنا یہ سب چیزیں۔ میرے بس کا روگ نہیں ہے یہ۔'' اس نے دوبارہ سے ساری نیلی روشنیاں آف کر کے ٹیوب لائٹ آن کر دی تھی اور چڑ کر بولا تھا۔ شیریں کھل کھل کر کے ہنس دی تھی۔

☆☆☆

''یہ میرا شادی کے لیے مارکیٹ کا آخری وزٹ ہے۔ آج کے بعد شادی تک میں گھر سے نہیں نکلنے والی۔ میں نے بس اب گھر میں رہنا ہے، آرام کرنا ہے۔ اپنی ڈائٹ پر فوکس کرنا ہے اور صرف پارلر جانا ہے۔ ارے بھئی میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے۔ میں ہی اگر فریش نہ نظر آئی تو کیا کہیں گے لوگ۔''

داؤد کی ممی نے مسکراتے ہوئے شرارتی سے انداز میں کہا تھا۔ شیریں کی ممی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر میز پر پڑی اپنی منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر دو گھونٹ بہت نزاکت سے حلق میں انڈیلے اور ان کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی کرنے والی ہوں۔ بہت ہوگئی۔ ارے بھئی جن کی شادی ہے وہ ہی سنبھالیں اب۔ ہم تو بس آج کے بعد پارلر کی اپائنٹمنٹ بھگتائیں گے اور اپنے آپ پر توجہ دیں گے۔ اتنے مہینے ہو گئے ہمیں خوار ہوتے ہوئے لیکن ان دونوں کی شادی کے کام ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ ایک ہفتہ رہ گیا ہے اور میں نے ابھی تک ہیئر ٹریٹمنٹ نہیں کروایا۔ اتنے رف ہو رہے ہیں میرے بال۔ مجھے لگتا ہے بارات والے روز مجھے ساڑھی کے ساتھ ایکسٹینشن لگوانی پڑیں گی۔ میرے اپنے بال تو اس قابل رہیں گے نہیں کہ انہیں کمر پر لہرایا جا سکے۔"

ایک بڑے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں بیٹھی وہ دونوں شیریں کو چڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شیریں موبائل پر مسلسل کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھی لیکن دھیان ان کی جانب بھی تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

"برائیڈ کے بارے میں بھی تو سوچیں جس نے ابھی تک مینی کیور بھی نہیں کروایا۔ مجھے تو خود نیل ایکسٹینشن لگوانی پڑے گی۔" اس نے بھی ہنستے ہوئے اپنا دکھڑا رویا تھا۔ وہ تینوں خریداری مکمل کر کے یہاں آئی تھیں۔ ولیمہ کا لباس ڈیزائنر نے کچھ ضروری تبدیلیوں کے بعد گھنٹہ بھر بعد دینے کا وعدہ کر رکھا تھا تو وہ تینوں کافی پینے کے لیے بیٹھ گئی تھیں۔ ان کا ارادہ نہیں تھا لیکن چونکہ ایک گھنٹہ گزارنا تھا تو کچھ اسنیکس بھی آرڈر کر دیے تھے اور کافی کے بجائے گرین ٹی آرڈر کر دی تھی۔ فوڈ کورٹ میں رش نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے وہ لاپروائی سے اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"برائیڈ کو کون دیکھتا ہے بھئی آج کل۔ ڈولہا ڈلہن کی اماں کی جانب ہوتی ہے سب کی توجہ۔ مووی میکر سے لے کر فوٹو گرافر تک سب ان ہی کو فوکس کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے پلیز ہمیں دوبارہ اپنے ساتھ گھسیٹ کر مت لانا۔" داؤد کی ممی نے مصنوعی ناراضی سے منہ کا زاویہ بگاڑ کر جتانے والے انداز میں کہا تھا اور تائیدی انداز میں اس کی ممی کی جانب دیکھا۔ شیریں نے سر پر ٹکائے سن گلاسز اتار کر اپنی ٹاپ کے گریبان میں اٹکائے اور موبائل میز پر اپنے سامنے رکھتے ہوئے ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"آنٹی یہ سب باتیں آپ لوگ داؤد سے بھی تو کہیں۔ وہ تو وہاں مزے سے بیٹھا ہے۔ اور میں یہاں خوار ہوئی جا رہی ہوں۔"

وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ اس کا سنہرا رنگ آج کل مزید چمکنے لگا تھا۔ اپنی ذات کے معاملے میں وہ کبھی لاپرواہ نہیں رہی تھی لیکن آج کل تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھ رہی تھی۔ اس کی پارلر کی سروسز بھی شروع ہو چکی تھیں تو اس کا نکھار دیکھنے والا تھا۔

"ارے ہم کیوں کہیں۔ تم کہو۔ تمہیں سونپ دیا ہے ہم نے اپنا جوان جہان بیٹا۔ تمہارا شوہر تمہاری پراپرٹی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔ شیریں کی ممی نے ان کا آدھا جملہ اُچک لیا۔

"اس بات کی ٹینشن نہ لیں آپ۔ یہ دونوں بہت چالاک ہیں۔ آئی ایم شیور اس نے ہی کہا ہوگا اسے کہ بھئی تم ابھی چھٹی مت لو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ تم شادی کے بعد چھٹیاں لینا تاکہ بعد میں مزے سے ہنی مون پر یورپ جا سکیں۔ بہت سیانے ہیں دونوں۔ ہماری طرح نہیں ہیں کہ ہنی مون پر جانے کے لیے بھی چھ چھ ماہ ساس سسر کے سامنے دھڑلے سے کہہ بھی نہیں پاتے تھے۔ اور جب ان سے اجازت ملتی تھیں تو میاں کو چھٹی

نہیں مل پاتی تھی

"ویسے اس بات سے میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ ماشاء اللہ ان دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ اتنی ریمارک ایبل ہے کہ میں دل ہی دل میں نظر اتارتی رہتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان دونوں کے درمیان محبت کو اسی طرح قائم ودائم رکھے۔" داؤد کی ممی نے محبت سے نثار ہوتے ہوئے شیریں کی جانب دیکھا تھا۔

"انڈر اسٹینڈنگ تو چھوٹا لفظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملے میں ان دونوں کی ایک رائے ہوتی ہے۔ ریسپشن کے ڈریس کے لیے کتنی بحث کی تھی اس نے ہم سے۔ سلیولیس نار کھنے پر سب سے الگ منہ ماری ہوئی شہلا کو بھی ناراض کیا۔ وقت بھی ضائع ہوا لیکن اس نے جب داؤد کو تصویریں بھیجیں اور اس نے اوکے کا سگنل دیا تو میڈم کی تسلی ہوئی۔" شیریں کی ممی آج کچھ زیادہ ہی شرارتی موڈ میں تھیں۔ شیریں آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ بھی کر رہی تھی کہ آنٹی کے سامنے ساری باتیں بھی نہ بیان کرتی جائیں لیکن وہ اس کی طرف دھیان ہی نہ دے رہی تھیں۔ داؤد کی ممی نے قہقہہ لگایا

"ہاں یہ بات تو ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ داؤد نے بتایا تھا مجھے۔ کہنے لگا۔ آپ سب لوگ کیوں شیریں کو تنگ کرتے ہیں۔ اسے سلیولیس زیادہ سوٹ کرتا ہے۔ اس لیے وہ اگر ڈریس کو آلٹر کروانا چاہ رہی ہے تو کروانے دیں۔ آخر پہننا تو اسی نے ہے۔"

وہ محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں لیکن شیریں مسکرائی بھی نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ سے اپنا فون ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس موضوع پر ان سب کے درمیان پہلے بھی کافی گرما گرم بحث ہو چکی تھی اور وہ مزید نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے موبائل سے کھیلنے کو فوقیت دی۔

"اب کچھ نہیں بولیں گی محترمہ۔ بس چپ چاپ میسج کرتی رہیں گی اسے کہ دیکھو تمہاری اماں اور اپنی اماں کو اچھا تنگ کر رکھا ہے۔" شیریں کی ممی نے اس کی عدم توجہی کو محسوس کر کے پھر اسے گفتگو میں گھسیٹنا چاہا تھا۔

"کرنے دیں اسے میسج۔ یہی تو دن ہوتے ہیں انجوائے منٹ والے۔ بعد میں تو انسان ان دنوں کو یاد ہی کرتا رہ جاتا ہے۔ بس آپ دعا کریں اللہ ان کے دلوں میں موجود محبت کو اسی طرح ہرا بھرا رکھے۔ آمین۔"

ایک عام ماں کی نسبت ایک سنگل مدر کو یہ خیال زیادہ ستاتا رہتا تھا کہ ان کے بہو بیٹے کی جوڑی سلامت رہے سو وہ دعائیں دینے میں بہت فراخ دل تھیں

"یہ دیکھیں میں کیا کر رہی ہوں۔" شیریں کی ممی نے اپنا موبائل داؤد کی ممی کی جانب کیا تھا۔ وہ ذرا سا آگے ہوئیں اور ان کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی جانب دیکھنے لگیں۔ اسی دوران ویٹر ان کا آرڈر لے کر آ گیا اور میز پر فرائیڈ فنگر فش اور گرین ٹی رکھنے لگا۔ داؤد کی ممی اپنے جذبات چھپائے فون کی جانب دیکھنے میں مگن تھیں۔ فون کی اسکرین پر شیریں کا چہرہ نمایاں تھا۔ اس کی ممی نے یہ تصویر ابھی ہی کھینچی تھی۔ تصویر میں فوڈ کورٹ کے پس منظر میں سنہرے بال کندھوں پر پھیلائے انتہائی فریش چہرے کے ساتھ سلیولیس میرون ٹاپ پہنے شیریں اپنے موبائل کی اسکرین میں گم تھی۔ چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ سی نمایاں تھی جیسے کسی من پسند شخصیت سے رابطے میں ہو۔

"میں نے یہ تصویر داؤد کو سینڈ کر دی ہے۔ ابھی دیکھیے گا فوراً جواب آئے گا۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ داؤد کی ممی بظاہر مسکراتے ہوئے پیچھے ہو گئیں۔ شیرین کی توجہ ان کے چہرے کی جانب تھی جس پر مصنوعی خوشی اور اطمینان نمایاں تھا۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔ فوراً جواب آئے گا۔ فرما رہا ہے۔ میں آج ہی آ رہا ہوں پاکستان۔"

شیریں کی ممی نے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر انہیں متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اب آگے نہیں ہوئی تھیں۔ چہرے پر

مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے وہ میز پر موجود لوازمات کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ شیریں موبائل میں گم ان کی جانب متوجہ نہ ہونے کی اداکاری کر رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان ان دونوں کی جانب ہی تھا۔ آنٹی کی دوغلی مسکراہٹ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی جبکہ اپنی ممی پر غصہ آنے لگا تھا۔

☆☆☆

"داؤد تم ہر بات آنٹی کو کیوں بتا دیتے ہو۔" اس روز رات کو جب داؤد نے بڑے خوش گوار موڈ میں اسے کال کی تو وہ چھوٹتے ہی بولی تھی۔ گھر آ کر بھی وہ کچھ باتوں کے لیے الجھی رہی تھی اور اب بھی ہینڈز فری کانوں سے لگائے سرہانے سے ٹیک لگائے وہ بظاہر فریش موڈ کے ساتھ ویڈیو کال کر رہی تھی مگر ذہنی انتشار چہرے سے مترشح تھا۔ اپنی ممی سے بھی اچھی خاصی بحث ہوئی تھی۔ وہ بھی اسے سمجھاتی رہی تھیں کہ وہ داؤد کی ممی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو لیکن یہ اس کے لیے بڑا مشکل تھا۔ آنٹی کا رویہ اسے الجھا ہی دیتا تھا

آنٹی بظاہر بہت اچھی تھیں لیکن جانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ جب جب ضرورت سے زیادہ میٹھی ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو ان کے دل میں کچھ اور چل رہا ہوتا ہے اور یہ چیز اسے پریشان کرتی تھی۔

"کم آن یار۔ وہ کون سا تمہاری دشمن ہیں کہ ان سے باتیں چھپائی جائیں۔ جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محبت وہ کرتی ہیں تم سے۔" وہ مخصوص محبت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی پھر نظر انداز کر دیا کہ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی جو اس وقت ہی زیر بحث لائی جاتی۔

"تمہارا دن کیسا گزرا۔ شاپنگ مکمل ہو گئی۔" اس نے موضوع ہی تبدیل کر دیا تھا۔ داؤد اپنے دن کا معمول اور شاپنگ کی تفصیل بتانے لگا تھا۔ وہ سنتی رہی مگر جانے کیوں طبیعت کچھ الجھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہ بیڈ سے نیچے اتری تا کہ کافی بنا کر لا سکے۔ اس وقت تک ملازمین سو چکے ہوتے تھے۔

"داؤد میں کافی بنا لاؤں۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے معذرت کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"تم کافی بناؤ گی؟" وہ ہنسا تھا۔ اسے کچن کے کسی کام سے کم ہی لگاؤ تھا۔

"ہاں بس یہی کچھ دن ہیں۔ پھر تم سے بنوا کر پیا کروں گی۔" اس نے بھی ہنس کر جواب دیا تھا۔ اسی دوران اسے ایک دم سے ہلکا سا چکر آ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابکائی آئے گی۔ اس نے فون بستر پر پھینکا اور باتھ روم کی جانب بھاگی تھی۔ وہ داؤد کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ فون بند کر رہی ہے مگر ہمت نہیں ہوئی تھی۔ دوسری جانب داؤد اسے آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔ وہ باتھ روم سے نکلی تب تک فون بند ہو چکا تھا۔ اسے عجیب سی نقاہت محسوس ہونے لگی۔ ایسا اس کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس دوران دوبارہ داؤد کی کال آنے لگی تھی۔

"ڈرا دیتی ہو تم۔" وہ ناراض ہونا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی نقاہت دیکھ کر گھبرا گیا

"کیا ہوا ہے تمہیں۔ چہرہ اتنا زرد کیوں ہو رہا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دینا چاہا مگر یکدم آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

قرۃ العین خرم ہاشمی

آج سے تقریباً ساڑھے نو سال پہلے تک، میرا ماننا تھا کہ سسرالی رشتے ٹام اینڈ جیری کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو برداشت بھی نہیں کرتے اور ایک دوسرے کے بغیر رہتے بھی نہیں ہیں۔

ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر کے نیچا بھی دکھاتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکلیف میں آگے بڑھتے اور مدد بھی ضرور کرتے ہیں۔

میرا یقین تھا کہ ان رشتوں میں سب کچھ مل سکتا ہے مگر اخلاص نہیں۔

مگر.......

آج تقریباً اپنی شادی کے دس سال بعد میں مان گئی ہوں کہ سسرالی رشتے بھی بعض اوقات خون کے رشتوں سے بڑھ کر خوبصورت اور مضبوط بن جاتے ہیں۔

کیسے؟

یہ بات شروع ہوئی تھی، ایک چھوٹے عمل سے۔ جس کے ننھے سے بیج نے اخلاص کے رشتے کا تناور درخت میرے دل میں اگا دیا ہے۔

☆☆☆

''اماں جی! آپ کو سب سوٹ تو پسند آئے ہیں نا؟''

صائمہ نے اپنی ساس کے سامنے چھ خوب صورت اور مہنگے سوٹ رکھے اور بہت نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔ اماں جی کو کھلتے ہوئے رنگ بہت پسند تھے۔ وہ پھیکے رنگوں سے بہت چڑتی تھیں۔ اس لیے صائمہ ہمیشہ ان کی پسند کو مدنظر رکھ کر شاپنگ کرتی۔ اماں جی کو اس کے لائے سارے سوٹ بہت پسند آئے۔ وہ سوٹ کھول کر دیکھتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھیں۔ صائمہ خوشی سے نہال ہو کر مزید اکڑ کر بیٹھ گئی اور داد طلب نظروں سے پاس بیٹھے شوہر کو دیکھا۔ ہارون بھی ماں کو خوش دیکھ کر بیوی کو سراہتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لاؤنج سے بچوں کے کھیلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور چائے کی ٹرے اٹھا کر سنبل اندر داخل ہوئی۔

سنبل پسینے میں شرابور تھی۔ اس نے اپنی جیٹھانی کو سلام کیا۔ جس کا جواب صائمہ نے بہت نخوت سے دیا۔

''اتنی گرمی میں چائے!''

صائمہ نے ایک طائرانہ نظر سلیقے سے سجی ٹرے پر ڈالی اور جب تنقید کرنے کے لیے کچھ نہیں ملا تو خوش رنگ چائے کو نشانہ بنا لیا۔

''بھابھی! آپ کے لیے ٹھنڈا لے آؤں؟''

سنبل نے شرمندگی سے کہا۔ ہارون کو بار بار چائے کی طلب ہوتی تھی، اس لیے سنبل نے انھیں دیکھتے ہی چائے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' صائمہ نے سر ہلا کر منع کیا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''یہ پکوڑے بھی لیں۔''

سنبل نے جلدی سے پلیٹ آگے بڑھائی۔

صائمہ نے سر ہلایا۔ سنبل زیادہ تر چیزیں گھر میں بناتی تھی۔ اسے مختلف تجربات کرنے کا شوق تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی تھا۔ اس لیے اس کے اکثر تجربات کامیاب ہی ہوتے تھے۔

''سنبل! یہ دیکھ کتنے پیارے سوٹ ہیں۔''

اچانک اماں جی نے سنبل کو متوجہ کیا۔ سنبل مسکراتے ہوئے اماں جی کے نئے کپڑے دیکھنے لگی۔

"جی بہت پیارے ہیں۔ ان کا کپڑا کتنا نرم ہے۔" سنبل نے سوٹ کے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہیں بھی تو مشہور برانڈ کے۔ بھلے پیسے زیادہ ہوتے ہیں مگر چیز کی کوالٹی بہترین ہوتی ہے۔"

صائمہ نے غرور سے کہا تو سنبل سر ہلانے لگی۔ صائمہ طنزیہ انداز میں مسکرا دی کہ سنبل نے بھلا کب کسی برانڈ کی کوئی چیز استعمال کی تھی۔

"یہ والا رنگ تو میرے پاس پہلے بھی ہے۔ فرحانہ نے تحفے میں دیا تھا۔ ایسا کرو سنبل! یہ تم لے لو۔"

اچانک اماں جی نے ایک سوٹ اٹھا کر سنبل

کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ سنبل ہکا بکا رہ گئی۔

"نہیں اماں جی! مجھے نہیں چاہیے۔" سنبل نے بوکھلا کر کہا کیونکہ صائمہ ہاتھ میں پکڑا پکوڑا کھانا بھول کر اب غصے سے اسے گھور رہی تھی۔

"اماں جی! میں اتنی محبت سے آپ کے لیے سوٹ لائی ہوں اور آپ سب میں بانٹ رہی ہیں۔" صائمہ نے تند لہجے میں فوراً احتجاج کیا۔

"تمہاری محبت کی قدر ہے۔ اس لیے تو انصاف سے تقسیم کر رہی ہوں۔ اس کا ثواب تمہیں بھی ملے گا۔"

اماں جی نے بے نیازی سے کہا تو صائمہ اونہہ کہہ کر سر جھٹک کر رہ گئی۔

"مجھے نہیں چاہیے۔" سنبل نے کمزور لہجے میں کہا۔

"اماں جی اتنے پیار سے دے رہی ہیں۔ منع مت کرو۔" ہارون نے بڑے بھائی والے رعب سے کہا تو سنبل جی اچھا کہہ کر رہ گئی مگر صائمہ کے چہرے کے ناگوار تاثرات دیکھ کر شرمندہ سی وہاں سے پلٹ گئی۔ واپسی کے سفر میں صائمہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ وہ بلاوجہ اپنے تینوں بچوں کو ڈانٹ رہی تھی۔ ہارون کو اس کے بگڑے موڈ کا اندازہ تھا، اس لیے نرمی سے سمجھانے لگا۔

"تم بلاوجہ اپنا موڈ خراب کر رہی ہو۔" ہارون نے تحمل سے کہا۔

"بلاوجہ؟ ایک تو آپ کی اماں جی کے لیے اتنے مہنگے برانڈ کے سوٹ لے کر گئی۔ انھوں نے کتنے آرام سے ایک سوٹ اٹھا کر اس مہارانی کو پکڑا دیا۔ کبھی ایسا سوٹ پہننا تو دور کی بات، ان جگہوں پہ گئی بھی نہیں ہو گی۔"

صائمہ نے تکبر سے کہا۔ ہارون نے موڈ کاٹتے ہوئے ایک سرسری نظر اپنی نک سک سے تیار بیوی پر ڈالی تھی۔

"احمد کی تنخواہ میں گھر کا خرچا مشکل سے چلتا ہے۔ وہ کہاں ایسی عیاشی افورڈ کر سکتا ہے۔"

ہارون نے چھوٹے بھائی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"سنبل کوشش تو بہت کرتی ہے میرا مقابلہ کرنے کی، مگر ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔"

صائمہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ہارون نے سر ہلا دیا۔ وہ عورتوں کی سیاست اور باتوں سے یکسر دور رہتا تھا۔

☆☆☆

"اماں جی! آپ کم از کم بھابھی کے سامنے تو سنبل کو سوٹ نہیں دیتیں۔" رات کو احمد جھنجھلایا ہوا ماں سے کہہ رہا تھا۔

اماں جی نے ایک نظر اپنے لاڈلے بیٹے پر ڈالی، جو کچھ دیر پہلے تھکا ہارا کام سے لوٹا تھا۔ سنبل نے اسے صائمہ کے آنے کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی سوٹ بھی دکھا کر ساری بات احمد کو بتائی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ چھپ کر دیتی؟" اماں نے معصومیت سے سوال کیا مگر ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ احمد بے ساختہ مسکرا دیا۔

"پیاری اماں! بھائی اور بھابھی یہ تحفے آپ کے لیے لائے تھے۔ اچھا نہیں لگتا کہ آپ......"

احمد نے ماں کے ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔

"میں بوڑھی عورت ہوں۔ کہیں آتی جاتی نہیں سنبل کو خاندان میں کہیں نہ کہیں جانا پڑ جاتا ہے۔ پچھلے ایک سال سے اس نے ایک بھی اچھا سوٹ نہیں بنایا ہے۔ بھلا ایک سوٹ دینے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے۔ نہ صائمہ کو کوئی کمی ہے اور نہ مجھے۔ مگر کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے آس پاس رہنے والوں کا خیال رکھیں۔ منہ سے مانگنا تو ضروری نہیں ہوتا ناں۔"

اماں جی نے سادگی سے کہا تو پاس کھڑی سنبل بھیگی آنکھوں کو چھپاتی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ ان دونوں سے اس کی بھیگی آنکھیں چھپی نہیں رہی تھیں۔ احمد اداس ہو گیا۔

"شاید میں سنبل کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں مگر کیا کروں؟ تنخواہ میں گھر کے دیگر اخراجات بمشکل پورے ہو رہے ہیں۔ اس کی خواہشات کو کہاں سے پورا کروں؟" احمد نے مایوسی سے کہا۔

"بیٹا! تم اپنی طرف سے محنت اور کوشش ہی کر سکتے ہو، باقی یہ اللہ کی تقسیم ہوتی ہے۔ کسی کو زیادہ، کسی کو کم ملتا ہے مگر کسی حال میں بھی رب سے شکوہ نہیں کرتے۔ جو وقت بھی خیر و عافیت سے گزر جائے، وہ غنیمت ہے۔ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔"

اماں جی نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔

"اور مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے بلکہ میں خوش نصیب ہوں کہ آپ بہترین انداز میں رزق حلال کما کر گھر چلا رہے ہیں۔"

سنبل چائے کے کپ اٹھا کر اندر داخل ہوئی اور نرمی سے شوہر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"اچھا تو یہ آنسو کس لیے تھے؟" احمد نے خفگی سے سوال کیا۔

"یہ آنسو تشکر کے تھے کہ اللہ نے مجھے اتنے اچھے اور ہمدرد لوگوں کا ساتھ عطا کیا ہے۔ جو میری تکلیف کو بن کہے جان لیتے ہیں۔"

سنبل نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا تو اماں جی مسکرا دیں۔

"تمہیں بہو نہیں بیٹی مانا ہے۔ بن کہے کیسے تمہارے دل کا حال نہ جانوں۔ کل ہی اپنا سوٹ سلنے دے آنا۔ کچھ دن کے بعد تمہاری بہن کے گھر دعوت ہے ناں۔"

اماں جی نے کہا تو سنبل ان کی یادداشت پر حیران رہ گئی۔ اس کی بڑی بہن نے نیا گھر بنایا تھا جس کی خوشی میں ایک شاندار سی دعوت کا انتظام کیا تھا۔

کچھ دن پہلے سنبل پریشانی سے احمد سے تذکرہ کر رہی تھی کہ اس کے پاس گرمیوں میں پہننے والا کوئی اچھا سوٹ نہیں ہے۔ ریشمی کپڑے اتنی گرمی میں پہننے کا حوصلہ نہیں تھا اور نہ وہ گرمی میں اچھے لگتے تھے۔ پچھلے ایک سال سے احمد کی کمپنی میں ہونے والے نقصان کی وجہ سے ان کی تنخواہ میں کٹوتی کر دی گئی تھی، جس کی وجہ سے کرایہ، بل اور دو بچوں کی اسکول فیس اور دیگر اخراجات ہی مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ اضافی خرچوں کے لیے بہت سوچنا پڑتا تھا۔ اماں جی کے باقی تین بچے بھی تھے (بڑا بیٹا ہارون، اور دو شادی شدہ بیٹیاں) جو انھیں کچھ نہ کچھ دے جاتے۔ اس لیے اماں جی کو اتنا مسئلہ نہیں ہوتا تھا جتنا احمد کو ہو رہا تھا۔ احمد سب سے چھوٹا تھا۔ اماں جی کا لاڈلا۔ اس لیے اماں جی اپنی خوشی سے احمد کے ساتھ رہ رہی تھیں ۔ ہارون کے پاس بھی کبھی کبھی رہنے چلی جاتیں مگر جلد ہی اکتا کر واپس آجاتی تھیں حالانکہ کہ ہارون کے گھر میں زیادہ عیش و آرام تھا مگر اماں جی کو احمد اور اس کے گھر سے زیادہ پیار تھا۔ اس بات پر سب سے زیادہ اعتراض صائمہ کو ہوتا تھا۔ وہ اکثر ساس سے بحث بھی کرتی۔ سنبل کو نیچا دکھانے کے لیے ساس اور نندوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر محبت جتاتی۔ تحفے تحائف دیتی۔ دعوتیں کرتی۔

یہ سب صائمہ خلوص دل سے نہیں بلکہ سنبل کو نیچا دکھانے کے لیے کرتی تھی۔ صائمہ نے ذہنی طور پر سنبل کو اپنا حریف سمجھ کر شطرنج کی بساط بچھائی ہوئی تھی جبکہ سنبل سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی درگزر سے کام لیتی تھی۔

☆☆☆

اماں جی کی بڑی بیٹی فرحانہ دبئی سے پاکستان آئی تو خاندان میں ہلچل مچ گئی۔ فرحانہ بہت امیر تھی۔ صائمہ نے ہمیشہ کی طرح اسے متاثر کرنے کے لیے مہنگے مہنگے تحفے تحائف دیے۔ اسے شاپنگ پر اپنے ساتھ لے گئی۔ مشہور ریسٹورنٹ میں دعوت کی۔ جبکہ سنبل نے اپنے حالات کے مطابق گھر میں اچھا سا کھانا بنا کر اس کی دعوت کی اور اپنی حیثیت کے مطابق اسے تحفہ پیش کیا۔ فرحانہ جانتی تھی کہ احمد

کے حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ احمد اور اس کی فیملی کے لیے خاص تحفے لائی تھی۔ فرحانہ کے واپس جانے کے بعد ایک دن صائمہ اماں جی سے ملنے آئی، تو سنبل کے بچوں کو مہنگے ویڈیو گیم سے کھیلتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جب اسے پتا چلا کہ بچوں کو یہ تحفے فرحانہ دے کر گئی ہے تو صائمہ کو بہت غصہ آیا۔

''میرے بچوں کو عام سی چیزیں گفٹ کیں اور سنبل کے بچوں کو اتنے مہنگے گفٹس۔''

صائمہ نے شوہر سے غصے سے کہا۔

''احمد کے بچے یہ سب کہاں افورڈ کر سکتے ہیں۔'' ہارون نے لاپروائی سے کہا۔

''یہ اچھا طریقہ ہے کہ مظلوم بن کر اپنا مطلب پورا کر لو۔''

صائمہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ہارون نے مزید بحث نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ صائمہ ہمیشہ سے سنبل سے ایک فاصلہ اور مقابلہ رکھنے کی قائل تھی۔ وہ سنبل کو دکھانے کے لیے اپنی ساس اور دونوں نندوں کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ خوش قسمتی سے وہ سنبل سے ہمیشہ آگے رہی۔ اکثر سنبل کو بہت سے جگہوں پر شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی۔ جب صائمہ جیٹھانی ہو کر آگے ہوتی اور سنبل اپنے حالات کی وجہ سے خاموشی سے پیچھے بیٹھ کر سب دیکھتی رہتی۔ خاندان میں بھی صائمہ نے شو آف کر کے اپنی عزت بنالی تھی۔

مادی دنیا ایک ہی اصول ہے......

کہ مادی دنیا ظاہر کو دیکھتی ہے۔ ظاہر کو پوجتی ہے۔ ظاہر کو سچ مانتی ہے۔ صائمہ کا ظاہر ہی اس کا حاصل تھا۔

☆☆☆

''اماں جی! آپ واپس کیوں جا رہی ہیں؟''

ہارون دو دن پہلے اماں جی کو اپنے گھر لایا تھا اور آج وہ واپس جانے کی ضد کر رہی تھیں۔ صائمہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔'' اماں جی نے معصومیت سے کہا۔

''تو کیا یہ آپ کا گھر نہیں ہے؟'' صائمہ نے تنک کر کہا۔

''ہے، مگر پہلا گھر وہ ہے، یہ دوسرا۔'' اماں جی نے سادگی سے جواب دیا۔ جس پر صائمہ کو آگ لگ گئی۔

''جبکہ ہارون آپ کا بڑا بیٹا ہے۔ بڑے بیٹے کا حق پہلا ہوتا ہے۔'' صائمہ نے منہ بنا کر کہا۔

''اللہ میرے بچوں کو سلامت رکھے۔ دونوں میرے حق میں بہت اچھے ہیں۔''

اماں جی نے بیٹے کو دعا دی۔ ہارون نے سعادت مندی سے ماں کا ہاتھ تھام کر چوما تھا۔

''مگر محبت آپ کو زیادہ احمد سے ہے۔'' صائمہ کا موڈ آج بحث کرنے کا تھا۔ ہارون نے بیوی کو گھورا مگر وہ نظر انداز کر گئی۔

''احمد چھوٹا ہے ناں! چھوٹے بچے زیادہ پیار لیتے ہیں۔'' اماں جی نے مسکرا کر کہا۔

''احمد کو چھوڑیں! آپ کو تو سنبل سے بھی اتنی ہی محبت ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔''

صائمہ نے دکھی انداز میں کہا تو اماں جی اس کے بچکانہ انداز پر ہنس پڑیں۔

''مجھے تم سے بھی بہت پیار ہے۔'' اماں جی نے اسے بہلایا۔

''مگر سنبل سے زیادہ ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس میں ایسا ہے کیا کہ آپ ہر وقت اس کے گن گاتی ہیں؟ مانا کہ اچھی ہے مگر اچھے تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔''

صائمہ آج سچ جاننا چاہتی تھی۔ اماں جی گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''بس اس کے بہت سے چھوٹے عمل ایسے ہیں جو دل پر نقش ہو گئے ہیں۔''

اماں جی نے دھیمے انداز میں کہا۔

''مثلاً؟'' صائمہ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''ساتھ رہتے ہوئے ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کو ایک وقت میں بیان کرنا مشکل ہے مگر سنبل بعض دفعہ ایسی نیکی یا عمل کر جاتی کہ میں دنگ رہ جاتی تھی جیسے ایک بار اچانک میری طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ مہینے کا آخر تھا۔ احمد کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ سنبل نے اپنے جمع شدہ پیسے نکال کر احمد کو دے دیے کہ اماں جی کو اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ وہ بہو تھی اگر نہ بھی دیتی تو خیر تھی۔ میں اپنے کسی دوسرے بچے کو فون کر دیتی مگر اس نے اپنی بچت مجھے دے دی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ سنبل کے پاس بہت خالص دل اور عمل ہے۔''

اماں جی نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو صائمہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

''اس لیے آپ نے ہمارے بجائے، ان کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی؟''

صائمہ نے کئی سال پہلے کا شکوہ کیا۔ جب وہ الگ گھر میں شفٹ ہو رہے تھے اور ہارون نے اماں جی کو ساتھ چلنے کا کہا تو انھوں نے انکار کر دیا تھا۔

''صائمہ بیٹی! سیانے کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اچھی طرح جاننا یا سمجھنا ہو تو اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں یا عمل کو دیکھیں۔ مجھے سنبل کے ساتھ رہتے ہوئے کچھ سال ہی ہوئے ہیں مگر میں نے اس کے اندر ایسی اعلا چھوٹی چھوٹی نیکیاں دیکھی ہیں جنھیں شاید میں لفظوں میں بیاں نہ کر سکوں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بہترین انسان ہے۔ اس لیے میں نے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

اماں جی نے مثال دیتے ہوئے کہا۔

''یعنی یہ خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں؟'' صائمہ نے منہ بنا کر کہا تو اماں جی ہنس پڑیں۔

''تم نے سنبل کے بارے میں پوچھا اور میں نے بتا دیا۔ یہاں تم دونوں کا مقابلہ تو نہیں ہو رہا۔'' اماں جی نے کہا۔

''میرے خیال سے اس بحث کو اب ختم کر دو۔''

ہارون نے سخت انداز میں بیوی کو دیکھ کر کہا تو صائمہ سمجھ گئی کہ اب اسے خاموش رہنا ہے کیونکہ ہارون بہت کم غصے میں آتا مگر جب آ جاتا تو پھر صائمہ خاموشی سے ایک طرف ہو جاتی کیونکہ ہارون کا غصہ بہت برا ہوتا تھا۔

☆☆☆

اس دن اماں جی کی باتیں سن کر صائمہ کو یہ ہی لگا تھا کہ اماں جی بلاوجہ اپنی سادگی میں سنبل کی سائیڈ لے رہی ہیں کیونکہ بہت بار غور کرنے پر بھی اسے آج تک سنبل میں چھپی وہ خاص بات نظر نہیں آئی، جس کی مثال اماں جی ہمیشہ یقین سے دیتی تھیں۔

جبکہ اماں جی کا کہنا تھا کہ کسی کی اچھائی کا اندازہ فوراً نہیں ہوتا اس کی اچھائی کسی عام یا چھوٹے سے عمل میں ڈھل کر ہم پر منکشف ہوتی ہے تب ہم جانتے ہیں کہ سامنے والی کی ذات میں اچھائی کا سورج چھپا ہے یا صرف نفس کا کالا اندھیرا ہی ہے۔

پتا نہیں صائمہ کی جستجو سچی تھی یا وقت اماں جی کی کہی بات کو درست ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ہارون جس کمپنی میں اعلا پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ وہ کمپنی ڈاون فال کی وجہ سے بند ہو گئی۔ ہارون بے روزگار ہو گیا تو زندگی میں پہلے والے عیش اور سکون بھی غائب ہو گئے۔

سیونگ سے بس عزت کے ساتھ وقت گزر رہا تھا۔ ہارون ان دنوں بہت پریشان تھا۔ صائمہ نے اپنے برے حالات کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح پیسے کے بل بوتے پر ہوا میں نہیں اڑ سکتی تھی۔ صائمہ اور ہارون دن بہ دن مشکل ہوتے حالات کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے۔ جبکہ دوسری طرف احمد کی ترقی ہو گئی تو اس کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہو گئے۔ ان کے گھر میں سکون بڑھ گیا اور معاشی پریشانی کا

بوجھ کم ہو گیا تھا۔ احمد یہ سب اپنی ماں کی دعاؤں کی کرامات کہتا تھا۔ جبکہ اماں جی کہتی تھیں کہ یہ سب آپس میں اتفاق اور شکر کی برکت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔

☆☆☆

فرحانہ ان دنوں پاکستان آئی ہوئی تھی کیونکہ اس کی ساس بہت بیمار تھیں۔ کچھ دن ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد وہ وفات پا گئیں۔ اماں جی فوتگی والے دن فرحانہ کے گھر گئیں تو فرحانہ نے ماں کو اپنے پاس رک لیا کہ "آپ قل کروا کے دو دن بعد چلی جایئے گا۔"

"اماں جی بھی اس کے اکیلے پن کو دیکھ کر رک گئیں۔ جس دن قل تھے۔" ہارون اور صائمہ اپنے تینوں بچوں کو لے کر احمد کے گھر آ گئے۔ فیصلہ ہوا کہ بچے گھر پر رہیں گے اور صرف بڑے قل پر جائیں گے۔ صائمہ کی بڑی بیٹی سمجھ دار تھی۔ کچھ اسے ہدایات دی گئیں اور سنبل نے اپنے پڑوس میں رہنے والی آپا ثریا کو بچوں کے پاس بیٹھنے کا کہہ دیا۔ آپا ثریا فوراً آ گئیں۔ ان کی اماں جی سے بہت اچھی دوستی تھی۔

بچوں کو ان کے پاس چھوڑ کر وہ چاروں احمد کی پرانی گاڑی میں فرحانہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ گاڑی میں بیٹھ کر صائمہ بہت خاموش تھی۔ کبھی احمد کی اس گاڑی کا صائمہ بہت مذاق اڑاتی تھی۔ اپنی مہنگی گاڑی سے مقابلہ کرتی۔ آج ان کی گاڑی آفس والوں نے واپس لے لی تو صائمہ کو اپنے تکبر میں کہے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

"بے شک سدا بادشاہت صرف اللہ کی ہے۔"

صائمہ نے گہری سانس لے کر شیشے سے باہر دیکھا۔ جب احمد نے اچانک گاڑی روکی۔ صائمہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو احمد گاڑی سے اتر کر پھل خرید رہا تھا۔ صائمہ چونک گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ نند کے گھر وہ خالی ہاتھ کیسے جائے گی؟ سنبل اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ صائمہ نے تھوڑا سا آگے ہو کر دبی آواز میں ہارون کو پھل خریدنے کا کہا مگر ہارون نے ان سنی کر دی۔ صائمہ شرمندہ ہو کر پیچھے سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"وقت وقت کی بات ہے! کبھی ان چند پیسوں کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس سے کئی زیادہ پیسے میں لوگوں پر لٹا دیتی تھی اور آج۔" صائمہ نے افسردگی سے سوچا۔

"فرحانہ کیا سوچے گی؟ فرحانہ کے سسرال والے کیا سوچیں گے کہ ایک بھابھی نے پھلوں کے تھیلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیں اور دوسری خالی ہاتھ آ گئی ہے؟"

صائمہ نے بے چین ہو کر سوچا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ خاندان میں ایسے کئی مواقع آئے تھے جب سنبل اس کے ساتھ خالی ہاتھ گئی اور وہ کئی کئی تھیلے اٹھا کر جاتی تھی۔ ہر طرف اس کی واہ واہ ہوتی اور سنبل شرمندگی سے سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ جاتی تھی۔

"وقت بھی کیا ظالم شے ہے۔" صائمہ نے سامنے لگے ٹینٹ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

احمد نے گاڑی سڑک کے ایک طرف پارک کی۔ مردوں کے لیے باہر بیٹھنے کا انتظام تھا جبکہ خواتین کے لیے اندر بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

احمد اور ہارون گاڑی سے اتر کر مردوں والے حصے کی طرف چل پڑے۔

"ایک منٹ بھابھی۔" صائمہ اپنے خیال میں چل رہی تھی جب سنبل نے پکارا۔ صائمہ نے پلٹ کر دیکھا۔

"یہ آپ پکڑ لیں۔ میں ڈوپٹہ ٹھیک کر لوں۔"

صائمہ نے ایک ہاتھ میں پکڑے پھلوں کے دو شاپر اسے پکڑاتے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔ دوسرے ہاتھ میں بھی اس نے پھلوں کے دو شاپر پکڑے ہوئے تھے۔ صائمہ نے سر جھٹک کر دو شاپر پکڑ لیے۔ سنبل اس سے باتیں کرتے ہوئے چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کندھے پر رکھی چادر کو ٹھیک کر رہی تھی۔ سر پر

اس نے سوٹ کے ہم رنگ ڈوپٹہ لیا ہوا تھا اور ایک طرف کندھے پر سلیقے سے چادر رکھی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم!"

گیٹ کے پاس فرحانہ کی نند اور فرحانہ کھڑی خواتین سے مل رہی تھیں جب سنبل نے اونچی آواز میں سلام کیا اور آگے بڑھ کر ان سے ملتے ہوئے پھلوں کے تھیلے ان کی طرف بڑھائے، جسے فرحانہ کے اشارے پر پاس کھڑی ملازمہ نے تھام کر ایک طرف رکھ دیا۔ سنبل پیچھے دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی جب صائمہ نے اسے یاد دلانے کے لیے ہاتھ میں پکڑے تھیلے تھوڑے اوپر کیے اور ایک دم چونک گئی۔ سنبل اندر جا چکی تھی۔

صائمہ حیرت میں گم فرحانہ اور اس کی نند سے گلے ملی تو فرحانہ نے ملازمہ کو اشارہ کیا جس نے صائمہ کے ہاتھ سے پھلوں کے شاپر پکڑ کر ایک طرف رکھ دیے۔ صائمہ گم صم سی اندر چلی گئی۔ اس نے عورتوں کے رش میں کچھ دور اماں جی کے پاس بیٹھی سنبل کی طرف دیکھا جو سیپارہ پڑھ رہی تھی۔ صائمہ خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟

کیا سنبل کا شکریہ ادا کرے یا خاموش رہے؟

قل ختم ہوئے تو شام کے وقت وہ سب واپس جانے لگے۔ جب فرحانہ ان سے گلے ملتے ہوئے آبدیدہ ہو گئی۔

"بہت شکریہ، آپ لوگوں نے سسرال میں میرے میکے کا مان رکھ لیا۔" فرحانہ نے سرگوشی کی۔ سنبل نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

صائمہ جانتی تھی کہ فرحانہ یہ شکریہ کیوں کہہ رہی ہے۔

صائمہ جانتی تھی کہ اس شکریے کا اصل حق دار کون تھا۔

صائمہ جانتی تھی کہ سنبل نے آج اس کی سفید پوشی کا بھرم کتنی عمدگی سے رکھا تھا۔

☆☆☆

"اماں جی! آپ ٹھیک کہتی تھیں کہ بہت چھوٹے چھوٹے عمل، نیکی کی سرزمین پر ہمیشہ رہنے والے نقش چھوڑتے ہیں۔ بہت چھوٹے عمل ہی انسان کے اصل کی پہچان کروا دیتے ہیں۔"

ہارون کو بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ وہ مٹھائی لے کر اماں جی سے ملنے آئے۔ جب صائمہ نے ان کے گلے لگتے ہوئے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اماں جی مسکرا دیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے اماں جی دیکھ رہی تھیں کہ صائمہ میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی۔ سنبل اور اس کے درمیان کئی سالوں سے جاری سرد جنگ اب خوش گوار تعلقات میں ڈھل چکی تھی۔ دونوں کے درمیان اچھی ذہنی ہم آہنگی اور دوستی ہو گئی تھی۔

اماں جی کو یہ دیکھ کر دلی اطمینان ہوتا تھا کہ ان کے بچے آپس میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احساس جیسا جذبہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

"اماں جی! یہ دو سوٹ آپ کے لیے ہیں اور یہ والا سنبل کا۔" ہارون کو پہلی تنخواہ ملی تو صائمہ بہت خوب صورت کپڑے لے کر آئی تھی۔

"بھابھی! اس کی کیا ضرورت تھی؟" سنبل نے حیرت سے سوال کیا۔

"ضرورت کی کیا بات ہے؟ تمہارا حق ہے۔" صائمہ نے محبت سے کہا تو سنبل مسکراتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

"اماں جی! آج ایک سوٹ میری بیوی کو نہیں ملے گا؟" احمد نے شرارت سے سوال کیا۔

"بالکل بھی نہیں۔"

اماں جی نے اپنے دونوں سوٹ اٹھا کر فوراً سائیڈ پر کیے تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اماں جی بھی بے ساختہ مسکرانے لگیں۔

بالکل ایسے جیسے زندگی اپنوں کے پاس ہونے سے خود بہ خود ہی مسکرانے لگتی ہے۔

عاصمہ فرحین

فلائیٹ کی آمد کا اعلان ہوتے ہی منتظر کھڑے شان اور روشنی مستعد ہو گئے۔ اور سارہ کی کیفیت ایسی تھی۔ جیسے کہ ابھی بھاگتی ہوئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے جا کر عمار سے لپٹ جائے گی۔ فراز سب کی یہ حالت دیکھ کر ہنس دیا۔

”کم آن یار...... تمہارے ماموں صاحب آنے ہی والے ہیں...... ٹیک اٹ ایزی......“

فراز نے شان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ اس کی اپنی یہ حالت تھی کہ اس کا دل پسلیوں سے باہر نکل آئے گا۔ پانچ سال کم نہیں ہوتے، اپنے عزیز دوست سے بچھڑے ہوئے۔

اور آخر کار کلیئرنس کروانے کے بعد عمار باہر نکل ہی آیا۔

اور سارہ نے وہ ہی کیا۔ جس کی توقع فراز کو تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب سارہ کو یقین آ ہی گیا کہ وہ عمار ہے تو دھیرے سے اس کے شانے سے ہٹ کر سائیڈ میں آ کھڑی ہوئی۔

”سارہ! تم کب سے اتنی جذباتی ہو گئیں۔“ وہ ہنسا تھا۔

اب اس نے اپنے بھائی کو دوبارہ سر اٹھا کر دیکھا وہ بلو جینز اور بلو شرٹ میں ملبوس تھا۔ ماہ و سال میں کی گئی محنت اس کے چہرے کی متانت اور سنجیدگی سے ٹپک رہی تھی۔ مگر آنکھوں میں شرارت تھی۔

”مجھے اپنے ان کیوٹیز سے تو ملنے دو۔“ شان کو پیار کرنے کے بعد اس نے چار سالہ روشی کو گود میں اٹھا لیا تھا۔

”اور میرا نمبر کب آئے گا۔“ فراز نے بازو پھیلائے تھے۔ اور وہ ہنستے ہوئے اس کے گلے لگ گیا تھا۔

مکمل ناول

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ سارہ اور فراز کے فلیٹ میں موجود تھا۔ فریش ہو کر کمرے سے نکلا۔ تو ڈائننگ ٹیبل اس کے پسندیدہ کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔

''کباب اچھے ہیں، مگر ابھی تک ان میں امی کے ہاتھ کا ذائقہ نہیں آیا۔'' خالص بھائیوں والا رویہ تھا۔

''شکر کر کے کھالو...... ویسے بھی امی سے امید نہ رکھنا کہ وہ تمہارے لیے کچن میں ہر وقت گھسی رہیں گی۔'' سارہ بھی تنک کر بولی تھی۔

لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ ایک گھنٹے پہلے والی جذباتی سی سارہ ہے۔

وہ کیوں......؟ ایک میں ہی تو ان کی لائق فائق اولاد ہوں۔'' اس نے کالر کھڑے کیے۔

''اور ساتھ ہی خود ساختہ شادی شدہ بھی۔'' سارہ نے ٹکڑا لگایا تھا۔

کباب حلق میں اٹک گیا تھا...... اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگالیا۔

''ویسے عمار کتنے خواب دیکھے تھے...... میں نے اور امی نے تمہاری شادی کے لیے...... مگر تم نے سب کچھ ختم کر دیا۔'' سارہ کی آواز میں تاسف جھلک رہا تھا۔

مگر وہ کان لپیٹے بریانی سے انصاف کر رہا تھا۔

''تم سن رہے ہو۔'' سارہ کو غصہ آیا تھا۔ جس پر فراز نے اسے گھورا تھا۔ بجائے اس کے کہ سارہ چپ ہو جاتی۔ مگر عمار کی خاموشی...... پھر فراز کے گھورنے نے اس کے غصے کو وہ شدت دی...... جس سے وہ خود بچنا چاہ رہی تھی۔

''آپ کو چاہیے تھا کہ اس سے کچھ پوچھتے......؟ بات کرتے...... اور بتاتے...... کہ امی کتنی پریشان ہیں؟ خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے......؟ اور فضا جو اس کے نام سے جڑی ہوئی ہے...... اس کا کیا ہوگا؟ یہ سوچا ہے...... اس نے......''

دل میں نہ جانے کب سے سوچی ہوئی باتیں الفاظ کا روپ دھار چکی تھیں۔ چکن کڑاہی میں ضرورت سے زیادہ مرچیں تھیں۔ یا اسے لگی تھیں۔ اس نے فروٹ کسٹرڈ نکال لیا تھا۔

''اسے دیکھیں۔ کتنے مزے سے کھا رہا ہے...... میری تو اب کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔''

''اُف......'' اس نے فروٹ کسٹرڈ جلدی جلدی معدے میں اتارا۔ اور کرسی سے اٹھ گیا۔

''کھانا کھالیا...... اتنی جلدی؟'' فراز نے حیرت سے کہا تھا۔

''میری چائے کمرے میں لے آنا۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے کا رخ کیا۔

''سارہ......!'' فراز نے اسے تاسف بھری نگاہ سے گھورا تھا۔

اور...... وہ بازوؤں میں سر دیے رونے لگی۔

''لگتا ہے...... اب چائے بھی مجھے بنانا پڑے گی......'' وہ بڑبڑایا تھا۔ ویسے بھی اسے سارہ کے اس وقت رونے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

صبح سارہ دیر سے اٹھی تھی۔ ویسے بھی سنڈے تھا۔ بچے سو رہے تھے۔ فراز اور عمار اس طرح غائب تھے۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... فون کالز بھی اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ آج اس کا ارادہ چائنیز پکانے کا تھا۔ شان اور روشی کے اٹھنے کے بعد انہیں ناشتہ کروایا۔ اس کے بعد وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر شاور لے چکی تھی۔ مگر ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔

تھک ہار کر اس نے بچوں کا ساتھ دینے کے لیے کچھ چکھ لیا تھا ورنہ حقیقتاً اب وہ پریشان ہو چکی تھی۔

اتنے سالوں میں عمار بالکل نہیں بدلا تھا۔ اس کا انداز، اسٹائل سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ تو سوچ کیسے بدل سکتی ہے......؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

امی کو بھی تک عمار کی آمد کا علم نہیں تھا۔ اور ایسا کرنے سے اسے اپنی عمار نے ہی منع کیا تھا الٹی سیدھی سوچوں کو جھٹلاتی ہوئی وہ کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔

چار بج چکے تھے۔ کھانا پک چکا تھا۔ اور وہ

بچوں کو بھی کھلا چکی تھی۔ مگر خود بھوکی تھی۔ ان کا انتظار کر رہی تھی۔

گھڑی نے جب چھ کے ہندسے کو عبور کیا۔ تب دروازے پر دستک ہوئی اور فراز اکیلا اندر داخل ہوا تھا۔

"عمار کہاں ہے؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"وہیں...... جہاں اسے ہونا چاہیے......" وہ مطمئن تھا۔

"مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ میں اسے پانچ والی ٹرین میں سوار کر کے آرہا ہوں۔"

"ایسے کیسے جاسکتا ہے...... وہ......؟ نہ ناشتہ کیا، نہ لنچ۔ میں نے چائنیز بنایا تھا......" وہ رو دینے کو تھی۔

"ہم نے ناشتہ اور لنچ باہر ہی کر لیا...... ویسے بھی ڈنر اتنا اسپائسی تھا کہ رات کو اسے قے ہوگئی تھی۔" اب کی بار فراز طنزیہ بولا۔ تو وہ کچھ شرمندہ سی ہوئی تھی۔

"آپ اسے معاف کر سکتے ہیں...... میں اور امی نہیں...... جواب دہ ہے...... وہ ہمارے آگے بڑی بہن نہیں ہوں...... تو کیا ہوا......؟ اکلوتی بہن ضرور ہوں۔ حق رکھتی ہوں میں ان پر۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"اور اسی حق سے تم نے یہ نہیں پوچھا......؟ کہ میرے پیارے بھائی تم نے پانچ سال کس طرح ابروڈ میں گزارے ہیں۔ فراز اسے اب بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ اس نے میری شادی آپ سے کیوں کروائی......؟" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"کیوں......؟" وہ اک پل کو حیران ہوا تھا۔

"تاکہ آپ ان کی ہر وقت حمایت کرتے رہیں۔" یہ کہہ کر وہ بھوک کی وجہ سے کچن میں جا گھسی اور وہ ہنس پڑا۔

☆☆☆

ٹنڈو آدم جانے کے لیے اسے تیز گام سے بہتر کوئی ٹرین نہیں لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹرین میں بیٹھا کھڑکی کے آر پار گزرتے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر گزرتا پل اسے پچھلے پانچ سالوں میں ہونے والی ترقی اور عمارتوں میں اضافے کی کہانی سنا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ بور ہوگیا۔ تو آنکھیں موند لی تھیں۔

آج پورا دن اس نے فراز کو خوار کیا تھا۔ جبکہ پوری رات انہوں نے باتیں کرتے گزاری تھی۔ پھر فجر کی نماز کے لیے دونوں مسجد چلے گئے تھے تھوڑی دیر سونے کے بعد جب اس نے فراز کو اپنا پروگرام بتایا تو اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔

وہ تو اسے پورے ہفتے کراچی میں روکنا چاہ رہا تھا۔ مگر عمار پاکستان آکر اب امی سے ایک پل بھی دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ناشتہ اور لنچ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے شاپنگ بھی کی تھی۔ اور دو میٹنگز بھی اٹینڈ کی تھیں۔ لیکن جب فراز کو دو گھنٹے اسٹیشن پر ٹرین کے لیے خوار ہونا پڑا۔ تب عمار کو اس کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑی تھیں۔

"پتا نہیں...... تمہیں کیا شوق ہے؟ ٹرین میں جانے کا...... کسی اے سی بس میں سفر کرتے تو آرام سے پہنچ جاتے۔"

مگر وہ عمار ہی کیا...... جو کسی کی مان لے...... اس نے بائیں کان سے سنا اور دائیں کان سے اس کی کڑوی کسیلی باتوں کو جانے دیا تھا۔

فراز بک بک جھک جھک کرتے ہوئے بھی اسٹیشن پر اس وقت تک کھڑا رہا تھا۔ جب تک ٹرین آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگئی تھی۔ اسے ہمیشہ سے ہی عمار سے اتنی محبت تھی۔

رات دس بجے وہ ٹنڈو آدم کے اسٹیشن پر موجود تھا۔ کھیتوں سے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اسے فرحت و تازگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ قلی نے سامان اٹھا لیا تھا۔ وہ اسٹیشن سے باہر نکلا تھا۔ رکشے، چنگ چی رکشے منتظر تھے۔ مگر وہ تو تانگے میں بیٹھنا چاہ رہا تھا جو کہ سامنے ہی کھڑا تھا۔

"کہاں جانا ہے......؟" تانگے والا عمر سے زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔

"گول گلی...... نور چاچا......" اور نور چاچا نے

غور سے عمار کو دیکھا تھا۔
"تو عمار پتر ہے نا......" اور وہ ان سے گلے ملتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔
پورے راستے وہ اسے گوٹھ میں ہونے والی تبدیلیوں کا بتاتے رہے۔ پھر جب گول گلی آ گئی۔ تو منع کرنے کے باوجود بھی اس کا سامان دروازے پر چھوڑا تھا۔
جب اس نے ان کے ہاتھ میں نوٹ تھمانا چاہے تو ہاتھ تھپتھپا کر واپس کر دیے اور کہنے لگے۔
"پتر اب تو آ گیا ہے۔ دیتے رہنا۔ منع نہیں کروں گا۔ بھلا بتا...... کوئی شہزادے سے بھی کرایہ لے گا۔ جا جلدی سے اپنی اماں سے جا کر مل......" اور واپس تانگے کی طرف لوٹ گئے۔
ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں نمی تیری تھی۔ یہی وہ خالص محبت تھی۔ جو اسے چاہ کر بھی پردیس میں نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

آج فضا نے جو کچھ بھی پکایا تھا۔ جوں کا توں رکھا تھا۔ صبح سے چائے کے ایک کپ کے سوا لبوں نے کچھ بھی نہیں چھوا تھا۔
ایسا نہیں تھا کہ بھوک نہیں تھی مگر بھوک کے ساتھ ساتھ ایک چاہ یہ بھی تھی کہ عزیز از جان بیٹا سامنے بیٹھا ہو بے شک اس سے کتنی بھی بڑی غلطی کیوں نہ ہو گئی ہو......؟
وہ اسے معاف کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔ مگر اب دور بھی نہیں رہا جا رہا تھا۔ سارہ کے بعد ایک وہی تو ان کی آنکھوں کی رونق تھا۔ ورنہ عاصم جیسا بیٹا تو...... اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔
عشاء کی نماز کے بعد وہ مصلے پر بیٹھی ہوئی دعا مانگ رہی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے۔ کلیجے سے لگانے کے لیے...... موت کا کیا بھروسہ؟ کب آ جائے......؟ کل ہی ایک جواں سال لڑکی کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔
دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ فضا کے پاس تو چابی تھی۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ دوسری دستک مانوس تھی۔ تیسری دستک پر پہچان گئیں کہ عمار آیا ہے۔
جائے نماز سے دروازے تک کا فاصلہ انہوں نے سیکنڈوں میں طے کیا تھا اور لاک کھولتے ہی ان کی آنکھوں اور دل کو قرار آ گیا تھا۔
ان کا صحت مند بیٹا کسی حد تک کمزور لگ رہا تھا۔ چہرے پر پرانی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور متانت بھی شامل تھی۔
اس سے پہلے کہ وہ اسے گلے لگاتیں۔ اپنی ممتا کو قرار دیتیں، اس کے پیچھے کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔ عمار کو حیرت ہوئی تھی۔
"کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟"
"تمہاری انگریز بیوی کو...... اسے کیوں نہیں لائے؟"
سچائی جاننے کے لیے انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔
"کیسے لاتا؟ اسے ویزا ہی نہیں ملا۔ ان شاء اللہ جلدی آ جائے گی وہ بھی۔" اس نے انہیں ایسے جتایا تھا جیسے کہ وہ اسے دیکھنے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ ان کی میٹھی ممتا کڑوی ہو گئی تھی۔
وہ پلٹ گئی تھیں اسے کچھ بھی کہے بغیر۔
چھوٹی سی حویلی ویسے ہی تھی جیسے پانچ سال پہلے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ شیشم کی لکڑی کا بڑا سا دروازہ ایک بہت بڑے صحن میں کھلتا تھا۔ پھر برآمدہ اور کشادہ کمرے تھے۔ ایک طرف لکڑی کا زینہ تھا جو اوپر کی طرف جاتا تھا۔ زینے کے ایک طرف چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو غلہ رکھنے کے کام آتی تھی۔ اوپر کھلی چھت تھی اور صرف ایک ہی کمرا تھا جو عمار کی فرمائش پر اسٹڈی کے لیے بنوایا گیا تھا۔
برآمدے میں جلتا ہوا سیور صحن کو روشن کر رہا تھا۔ وہ سوٹ کیسز گھسیٹتے ہوئے تخت تک لایا اور نیم دراز ہو گیا تھا۔
اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتیں، امی کی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔
"تاج علی! یہ صاحب کا سامان ان کے کمرے

میں رکھ کر آؤ...... اور زرینہ! تم بھی ذرا کمرے میں دیکھ کر آؤ، کہیں اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔"

"بی بی جی! روز ہی صفائی کرتی ہوں صاحب کے کمرے کی۔"

"تم زیادہ باتیں نہ بناؤ، جو کہا ہے وہی کرو۔"

صحن کی ٹھنڈک اور ٹھنڈی ہوائیں اس کے حواسوں پر چھانے لگیں اور وہ بے خبر سو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ فجر کی اذان پر ہی کھلی تھی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ تھوڑی دور تاج علی چارپائی بچھائے سو رہا تھا کہ شاید وہ اٹھے تو وہ اس کے ہر کام کے لیے حاضر ہو سکے۔

اس کے صاف ستھرے پیر جوتوں اور موزوں کی قید سے آزاد تھے۔ شاید یہ کام بھی تاج علی نے کیا تھا۔ وہ دبے پیر اٹھا۔ اپنے جوتے اٹھائے اور ننگے پیروں سے شبنم کی ٹھنڈک جذب کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

کمرا ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ الماری کھولی۔ سلیقے سے استری شدہ سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اپنی پسند کا ٹراؤزر شرٹ نکالا، نہایا، سلیپر نکالے اور مسجد کا رخ کیا۔

صبح سویرے ہی پورے گوٹھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ عمار باہر سے اپنی پڑھائی پوری کر کے آگیا ہے۔ واپسی پر اس کے ساتھ ماموں الیاس تھے، جن کا گھر بھی گول گلی میں تھا۔

"یہ درخت کس نے کاٹ دیا؟" گلی کے درمیان میں گول چبوترے کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"بہت بڑا ہو گیا تھا، تنگ کر رہا تھا۔ عاشق چاچا کے پوتے کے کمرے میں اس کی شاخیں گھس رہی تھیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ کچھ اسے غصہ تھا پھر تیری ممانی کو بچوں کا شور برا لگتا تھا۔"

"اب بچے شور نہیں کریں گے تو کیا بوڑھے کریں گے۔" اس نے بات کاٹی۔

"سن تو سہی کاکے! ثریا کو شکایت تھی کہ اس کے صحن میں پرندے بیٹ کرتے ہیں اور بھی بہت مسئلے تھے۔ سب نے مل ملا کر اس کا صفایا کر دیا۔"

"اور مسئلے حل ہو گئے اب۔" وہ طنزیہ ہوا۔

"مسئلے تو مسئلے ہی بنے ہوئے ہیں۔ تو بھی اب اپنے مسئلے سلجھا۔ تیری ماں بہت پریشان ہے اور عاصم کو اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اپنی سوچ...... دوسروں کی کب تک سوچے گا؟" اس کا کندھا دباتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ دروازہ تاج علی نے کھولا تھا۔

"چائے بنا کر اوپر لے آؤ۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اوپر چلا گیا تھا۔

اس کے کمرے کے آگے گیلری تھی جو ایک چھوٹے سے ٹیرس میں کھلتی تھی اور وہ وہیں بیٹھ کر اسٹڈی کیا کرتا تھا۔ اس کا آرام دہ صوفہ اور لکڑی کی گرل کے قریب موجود اونچا سا اسٹول بھی موجود تھا جہاں بیٹھ کر وہ پوری گول گلی کا جائزہ لیا کرتا تھا۔

اس گلی میں آنے کا ایک ہی راستہ تھا بلکہ اگر اسے ایک چھوٹی سڑک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے آپ نیچے سے اوپر کی طرف جا رہے ہیں اور بالکل سامنے ہی ان کی خوب صورت اور قدیم زمانے کی بنی ہوئی حویلی تھی جو کہ ہجرت کے بعد ان کے بزرگوں کو ملی تھی۔ حویلی کے دونوں اطراف دائرے کے ساتھ کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ جو کہ اکلوتی سڑک کے ساتھ ختم ہو جاتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عمار کے خاندان کے گھر تھے۔ عمار کی امی اسے بتاتی تھیں کہ پہلے حویلی کے دونوں اطراف کا حصہ خالی تھا تا کہ اس کی خوب صورتی خراب نہ ہو مگر بعد میں عمار کے دادا نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہی وہ جگہ رہنے کے لیے دے دی تھی۔ جس پر وہ گھر بنا کر رہنے لگے۔

گول گلی کی خاص بات یہ تھی کہ گلی کے درمیان میں پانچ سے چھ فٹ اونچا گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جس کے درمیان میں برگد کا پرانا درخت تھا۔ درخت کے تنے والا حصہ کچا تھا۔ اس کی شاخیں اتنی بڑی اور گھنی تھیں کہ گرمیوں میں سایہ تو ملتا ہی تھا، تیز سے تیز بارش میں بھی بہترین پناہ گاہ تھا۔

اور عمار نے بچپن سے لڑکپن اور جوانی تک کا سفر اسی درخت کے اردگرد ہی طے کیا تھا۔ اس درخت

کی محبت میں ہی اس نے کمرا چھت پر بنوایا تھا ورنہ حویلی میں بہت سے کمرے خالی تھے۔

حویلی کے دائیں طرف اس کے ننھیالی رشتے داروں کے گھر تھے اور بائیں طرف ددھیالی رشتے داروں کے۔

اس کی امی شمسہ بانو کے دو ہی بھائی تھے۔ الیاس اور فراست۔ الیاس ان سے بڑے تھے اور فراست چھوٹے۔ الیاس ماموں کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سوائے سبحان کے سب شادی شدہ تھے۔ ان کی دوسرے نمبر کی بیٹی شائلہ عمار کی بھابھی اور عاصم کی بیوی تھی۔ جسے بڑے چاؤ سے شمسہ نے اپنی بہو بنایا تھا۔ فراست ماموں کی ایک ہی بیٹی تھی فضا...... جو کہ بچپن میں ہی باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی تھی۔

برابر میں ہی شمسہ کے چچا اور پھوپھو کے خاندان تھے۔ بائیں جانب عمار کے والد عظمت علی کے چچازاد بھائی اور ان کی خالہ کے گھر تھے۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے گھر چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئے تھے۔ دلوں کی کشادگی تنگ ہونے لگی تھی مگر پھر بھی ابھی تک اس گلی میں ان کے خاندان کا راج تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا، تاج علی لسی کا گلاس لیے حاضر ہوا تھا۔

"میں نے چائے منگوائی تھی۔" اسے تعجب ہوا تھا۔

"تازہ لسی ہے صاحب جی! بی بی جی نے چائے کا منع کیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ ایک گھنٹے بعد نیچے آ جائیں ناشتہ کے لیے۔ اسی کے بعد چائے ملے گی۔"

اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

الارم بج بج کر تھک چکا تھا اور وہ تھی کہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخرکار سات بجے وہ بستر سے اٹھی تھی۔ فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ اسے افسوس ہوا تھا۔

کسلمندی سے بچنے کے لیے آخرکار اسے شاور لینا پڑا تھا۔ گیلے بالوں کو جلدی جلدی خشک کیا تھا۔ کیچر میں بال جکڑے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔

"پھوپھو کو کھیر دے کر آ جاؤں، کہہ دیں گی کہ فضا سے ایک کام نہیں ہوا۔" وہ فریج سے کھیر کا باؤل نکال کر بڑبڑائی۔

اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی پیچھے سے اسے اپنی مما کی آواز آئی تھی۔

"فضا!"

"جی مما۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"پھوپھو کو کھیر دینے۔"

"ٹائم دیکھا ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے نا کہ پھوپھو کے گھر جاتے ہوئے میں وقت نہیں دیکھتی۔"

"تو اب دیکھ لیا کرو۔" وہ نروٹھے انداز میں بولیں۔

اور وہ شانے اچکاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اس دروازے کی چابی شمسہ اور تاج علی کے علاوہ فضا کے پاس تھی۔ بڑے مزے سے باؤل کو زینے پر رکھا، لاک گھمایا اور اندر داخل ہوئی۔

"آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔" یہ مردانہ آواز تھی۔

"صرف اس چوہیا جیسے چہرے والی لڑکی کی وجہ سے۔" وہ رک گئی۔ چہرے کے ناک نین نقش بگڑنے لگے تھے۔

"گھوریں مت مجھے...... نہ گلے لگایا، نہ چمٹایا۔ نہ میری بلائیں لیں کہ شہزادہ عمار پڑھ لکھ کر آپ کا نام روشن کر کے آئے ہیں اور آپ...... بس...... اپنی اس فضول سی بھتیجی کی وجہ سے بیٹے سے ناراض ہو بیٹھی ہیں۔ اور پھر وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔" وہ اپنی امی کے چاروں طرف گھوم کر چکر کاٹ کر بولتے ہوئے جب سامنے کے رخ پر آیا تو ادھ کھلی کھڑکی سے ایک لڑکی چوروں کی طرح کھڑی نظر آئی تھی۔ لمبے بال، دوپٹے سے جھانکتا چہرہ، نہ دکھنے والے رنگ و روپ کی داستان سنا رہا تھا۔ چہرے پر نظر آنے والی خفگی اسے مزا دے گئی تھی۔

"اوپر سے سانولی رنگت۔" فضا نے اپنے

گورے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔

''دو چوٹیاں...... بہتی ناک...... اور چاکلیٹ سے بھرا منہ...... کیا ایسی بہو چاہتی ہیں آپ؟'' فضا کے بدلتے تاثرات اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔

شمسہ بانو کا غصہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ پراٹھا بناتا چمٹا اس کی کمر پر پڑا تھا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنستا تھا۔

جبکہ اس کی باتیں سن کر فضا کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کھیر کا باؤل ٹیبل پر پٹخا تھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

''اتنی جلدی آ گئیں۔'' فردوس شاید دروازے پر ہی تھیں۔

''جی، بس۔ آپ مجھے ناشتہ بنا دیں۔ کالج کا بہت سارا کام کرنا ہے۔''

''عمار سے مل آئیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''عمار بھائی کب آئے؟ اور آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''الیاس بھائی صبح بتا کر گئے تھے۔ تمہیں جلدی اتنی تھی کیا بتاتی؟'' انہوں نے وضاحت دی تھی۔

اور وہ تپ کر کمرے میں جا گھسی۔

☆☆☆

''واہ امی واہ...... ناشتہ کر کے تو مزا آ گیا۔ آپ کی نئی بہو کو پراٹھے بنانے ہی نہیں آتے۔ وہ تو روز جام، ڈبل روٹی، دلیا اور فریش جوسز ہی مجھے ناشتے میں کھلاتی تھی۔'' اس کی باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے جب شمسہ اپنے لیے روٹی پکا کر لائیں تو ٹیبل پر کھیر کا باؤل رکھا تھا۔

''یہ فضا آئی تھی۔ مجھ سے کیوں نہیں مل کر گئی؟'' وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ ''تم نے فضا کو دیکھا تھا؟'' انہوں نے اسے گھورا۔

''نہیں، امی جان۔ میں تو آپ کو پراٹھے بناتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔'' وہ معصوم بنا ہوا تھا۔

اور وہ اس کی اتنی کی جانے والی برائیوں کی وجہ سمجھ گئی تھیں۔

''تمہاری پہلی بیوی کو قتل کر کے ہی میں اپنی مرضی کی بہو لا سکتی ہوں۔'' وہ بڑبڑائی تھیں اور وہ دوبارہ ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

عظمت علی اور ثانیہ علی اپنے والدین کے دو ہی بچے تھے۔ عظمت کی شادی اپنی خالہ زاد شمسہ بانو سے ہوئی تھی۔ ان کے تین ہی بچے تھے۔ عاصم، عمار اور سارہ......

عظمت علی کے والد کو ہجرت کے بعد کلیم میں یہ حویلی اور زمینیں مل گئی تھیں۔ جس کی بنا پر انہیں پاکستان میں اپنے قدم جمانے میں مشکل نہیں ہوئی۔ وہ ایک محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ اس لیے زمینیں بڑھانے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

ثانیہ علی شادی ہو کر کراچی گئی تھی جبکہ عظمت علی اپنی زمینیں سنبھال رہے تھے۔ عاصم علی نے مشکل سے گریجویٹ کیا تھا اور پھر وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر جاگیرداری نظام میں شامل ہو گیا تھا۔ کسی حد تک وہ سخت گیر اور خود غرض انسان تھا۔ اس کے برعکس عمار اپنی ماں کی طرح نرم خو، شائستہ اور سنجیدہ مزاج تھا۔ غریبوں سے دلی ہمدردی نے ہی اسے میڈیکل کی فیلڈ کی طرف راغب کیا اور اس طرح اس نے پہلے کراچی کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا پھر اسپشلائزیشن کے لیے ابروڈ کا رخ کیا تھا۔

عاصم کی شادی خود اس کی اور شمسہ کی پسند کے مطابق الیاس ماموں کی بیٹی شمائلہ سے ہو گئی تھی۔ عمار کو ذاتی طور پر شمائلہ اپنی بھابھی کے طور پر پسند نہیں تھی۔ محض میٹرک کرنے کے بعد ہی وہ گھر داری میں تو کیا دلچسپی لیتی؟ اس کی عاصم سے گاڑھی چھننے لگی۔ یہاں تک کہ نوبت شادی تک آ پہنچی تھی۔ ان کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے اور ان کا ایک بیٹا عثمان اور پانچ سالہ بیٹی شیبا تھی۔

شادی کے بعد کچھ عرصے تو شمائلہ طریقے سے رہی تھی مگر جب عظمت علی بیمار ہو کر بستر سے لگے اور زمین داری کا نظام مکمل طور پر عاصم کے کنٹرول میں آیا۔ تو شمائلہ کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے۔ تب شمسہ

کو سارہ کی فکر لاحق ہوئی جو کہ اس وقت تشویش میں بدل گئی جب شمائلہ سارہ کے لیے اپنے بھائی دانش کا رشتہ لے کر آئی۔ عظمت علی سمجھ چکے تھے کہ یہ سب جائیداد ہتھیانے کے گر ہیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تانیہ اپنے بھائی کی عیادت کے لیے آئیں اور اپنے بھائی کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے سارہ کی انگلی میں فراز کے نام کی انگوٹھی پہنادی اور شادی کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ فراز کے بی اے کرنے کے بعد ہوگی۔ مگر عظمت علی کی بگڑتی ہوئی طبیعت نے تانیہ کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کردیا تھا اور انجینئرنگ کے تیسرے سال ہی فراز کو اپنے سر پر سہرا باندھنا پڑا۔

شمائلہ کو اس معاملے میں منہ کی کھانی پڑی تھی اور اسے معلوم تھا کہ عمار اس کی باتوں میں آنے والا نہیں۔ اس لیے وہ اب کھل کر سامنے آگئی۔ روز روز کے تماشوں کی وجہ سے عظمت نے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ عمار نے سارہ کو بھی کراچی سے بلوالیا تھا۔ وہ اپنے جیتے جی زمینیں اور جائیداد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے مگر انہیں مہلت ہی نہیں ملی۔ جس دن یہ سب اکٹھے ہوئے، عاصم اور شمائلہ کے ہنگاموں نے یہ نوبت آنے ہی نہیں دی۔ وہ رات عظمت علی کے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی۔ بی پی شوٹ کر جانے کے ساتھ ساتھ دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

پوری رات ایک اچھا ہسپتال ڈھونڈنے اور ٹنڈو آدم سے حیدرآباد جاتے ہوئے عمار کو احساس ہو چکا تھا کہ ان کے اس چھوٹے سے شہر میں طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تب ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک چھوٹا سا ہسپتال ضرور بنائے گا تاکہ قیمتی انسانی جانوں کو بچایا جاسکے اور اب یہی اس کا مشن تھا۔

☆☆☆

آج پورا دن اس نے ٹیکنیکل ٹیم کے ساتھ ہسپتال والی زمین کا سروے کرنے میں گزار دیا تھا۔ شام کو جب واپس آیا تو شمسہ منتظر تھیں۔

''تم پورا دن کہاں تھے؟ سب تمہارا پوچھ رہے تھے۔ آج تو کم از کم گھر پر ہونا چاہیے تھا۔'' وہ فکر مندی سے بولیں۔

''گھر پر رہ لیتا، اگر آپ مجھ سے ناراض نہ ہوتیں۔'' وہ ان کے برابر میں تخت پر آبیٹھا۔

''وہ تو میں اب بھی ہوں۔'' وہ تروٹھے انداز میں بولیں۔

''اوکے۔ میں فریش ہوکر آتا ہوں۔ پھر آپ کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے تخت پر سے اٹھ گیا تھا۔

شاور لینے کے بعد وہ شمسہ کے کمرے میں سوٹ کیس لے آیا تھا اور انہیں سب کے لیے لائے جانے والے تحائف دکھانے لگا۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اس نے ایک پیکٹ شمسہ کو تھمایا۔

ایک خوب صورت سا نفیس کوٹ، گھڑی، جیولری سیٹ باکس میں سلیقے سے موجود تھا۔

''اس جیولری سیٹ کا میں کیا کروں گی؟'' وہ ہنسیں۔

''آپ مجھے پہن کر دکھائے گا۔'' وہ ان کے ہنسنے پر خوش ہوا تھا۔

''میں کیا کروں گی پہن کر۔ تمہاری دلہن کے لیے رکھوں گی۔'' وہ بھی خوش تھیں۔

''اسے میں کافی شاپنگ کرواچکا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''قسم کھاؤ میری کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی جھوٹا ہوں، جو قسمیں کھاؤں۔'' وہ ناراض ہوا۔

''پھر تم مجھ سے بات نہیں کیا کرو۔'' وہ بھی ناراض ہوگئی تھیں۔

''تو آپ بھی مجھ سے دلہن والی بات نہ کیا کریں'' ترکی بہ ترکی اس نے جواب دیا جس پر وہ چپ ہوگئی تھیں۔

اپنی امی کا خراب موڈ دیکھ کر اس نے گہری سانس اندر لی تھی۔

"یہ عاصم بھائی کا۔ یہ بڑے ماموں کی فیملی کا۔ یہ چھوٹی مامی اور فضا کے لیے۔" وہ آہستہ آہستہ بتاتا جارہا تھا۔

"اچھا، اب کل چلیں گے سب کو تحفے دینے۔ آخر میرا بیٹا اتنی دور سے لایا ہے۔" اپنا موڈ بدل کر انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔ اور وہ بھی ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ روزانہ صبح فجر کے بعد کچھ دیر کے لیے کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر کالج کے لیے تیار ہونے لگتی۔ وہ صبح روزانہ ٹرین سے ٹنڈو آدم سے حیدرآباد جاتی تھی اور واپس آتی تھی۔ یہ اس کا ایم بی بی ایس کا تیسرا سال تھا۔

مگر شاید آج دن کا آغاز ہی الگ تھا کیونکہ پوری رات اس نے صبح ہونے والی بے عزتی یاد کر کے گزار دی تھی۔ فجر ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی اور وہ وقت اس کے اٹھنے کا تھا۔

"یہ ابھی تک اٹھی کیوں نہیں؟" فردوس نے جب آکر اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ مزے سے سو رہی تھی۔

"فضا...... فضا......" انہوں نے اسے نیند سے جگایا تھا۔

فضا نے جلدی جلدی کتابیں سمیٹیں، تیار ہوئی۔ موبائل بجا تھا۔

"اوہ......" وہ موبائل چیک کرتے ہوئے بولی تھی۔

"اب کیا ہوا؟" فردوس زچ ہوئی تھیں۔

"مما! آج رکشے والا نہیں آئے گا۔ اس کا رکشہ خراب ہے۔ میری ٹرین نکل جائے گی۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"تم چلو، میں دیکھتی ہوں۔" وہ اس کے ساتھ چادر اوڑھ کر باہر آئی تھیں مگر اس وقت رکشہ ملنا مشکل تھے۔

"فضا! آج تم چھٹی کر لو یا پھر اگر بس سے جاؤ گی تب بھی تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

اسی وقت عمار نے گاڑی گول گلی کے کنارے پر کھڑی کی تھی۔

"السلام علیکم چھوٹی ممانی!" جہاں وہ فردوس کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ وہیں فضا کو ساتھ دیکھ کر حیران بھی۔

"کوئی مسئلہ؟"

فردوس اسے جلدی جلدی بتانے لگیں۔

"آپ اجازت دیں تو میں حیدرآباد چھوڑ دیتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے اپنے کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانا ہے۔"

اگر کوئی عام دن ہوتا تو شاید فضا اپنی ناک نیچی نہ ہونے دیتی۔ مگر مسئلہ اسائنمنٹ پلس پریزنٹیشن کا تھا اور آج جانا لازمی تھا۔

"فضا! تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اب عمار تمہیں لے جائے گا اور...... یاد سے کچھ کھا لینا۔ تمہیں بھوک برداشت نہیں ہے۔"

اور فضا نے بڑی بڑی آنکھوں سے انہیں گھورا تھا۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ تم ایم بی بی ایس کر رہی ہو اور امی نے مجھے بتایا ہی نہیں۔" ہائی وے پر گاڑی لانے کے بعد وہ اس سے پوچھ رہا تھا یا شکایت، اسے سمجھ میں نہیں آئی۔

"مجھے تو شروع سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لیکن اگر پھوپھو سپورٹ نہ کرتیں تو میں کبھی بھی ڈاکٹر نہ بن پاتی۔" وہ اپنی پھوپھو کی مشکور تھی۔

اس کے بعد عمار نے اس کی اسٹڈی کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تھا جس پر وہ اسے جواب دینے لگی۔

وہ پریشان تب ہوئی جب عمار نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے آگے روکی تھی، وہ ناسمجھی میں اسے دیکھنے لگی۔

"اترو۔ ناشتہ کرنا ہے، ویسے بھی مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ لاک کر کے اندر کی طرف چلا گیا۔

"عمار بھائی! ساڑھے نو بجے میری کلاس ہے اور ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں۔" وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔" اس نے کاندھے اچکائے۔

دس منٹ بعد ہی وہ حلوہ پوری سے انصاف کر رہا تھا اور وہ مشکل سے لقمے حلق میں اتار رہی تھی۔

''میں اپنا ناشتہ کر چکا ہوں۔'' چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اس نے کہا۔ ''اگر تم بھی کچھ کھا لو تو ہم چلیں۔''

وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں؟ جب آپ چاہتے ہی نہیں تھے کہ میں وقت پر پہنچوں تو آپ مجھے کیوں لے کر آئے؟'' وہ ہتھے سے اکھڑی۔

''ٹیک اٹ ایزی۔ ناشتہ ختم کرلو، پھر ہم چلتے ہیں۔'' اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

مرتی کیا نہ کرتی۔ دس سیکنڈ میں پوری ختم کی اور چائے حلق میں انڈیلی تھی اور اس سے پہلے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ کالج پہنچے تو نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔

اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ چوکیدار بہت برا تھا ٹائمنگ کے معاملے میں۔ مگر عمار کو دیکھ کر اس نے سلام کیا تھا۔ کچھ کہتا تو کیا؟ اسے حیرت ہوئی تھی۔

''اب تم چلی جاؤ۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔''

اور خود کالج کے اندر گم ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ اچانک اسے عمار کا خیال آیا، تو وہ پیچھے مڑی مگر وہ ایسے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

ہانپتی کانپتی وہ کلاس میں بیٹھی تھی، بیگ چیک کیا تو اسائنمنٹ غائب تھا۔ وہ جلدی میں اسائنمنٹ رکھنا بھول گئی تھی۔

اوہ شٹ...... وہ اللہ کو یاد کرنے لگی۔

جب نیہا نے آ کر بتایا کہ آج ڈاکٹر شمسی نے اپنے کسی فارن گیسٹ کی وجہ سے کلاس آف کردی ہے تو سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

وہ تھک گیا تھا۔ اس لیے حیدر آباد سے آ کر لیٹ گیا تھا۔ جب شام کو شمسہ اسے جگانے لگیں تو اسے برا لگا۔

''امی! آپ خود ہی تحائف دے کر آ جائیں۔'' اس نے کروٹ بدلی تھی۔

''اس بہانے تم سب سے مل لو گے، پھر کہاں فرصت ملے گی؟ اور سب شکایت بھی کر رہے ہیں کہ تمہارا بیٹا ابھی تک ملنے نہیں آیا۔''

''آپ کی فضا بھی یہ ہی کہہ رہی تھی۔'' وہ باز نہ آیا۔

''صرف پندرہ منٹ دے رہی ہوں۔'' وہ حکم دے کر چلی گئیں۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ہاشم چچا کے گھر میں موجود تھے۔ ہاشم چچا کے تین بیٹے تھے اور تینوں ہی الگ رہ رہے تھے۔ آپس میں بات چیت بھی مشکل سے ہی ہوتی تھی۔ چچی کا انتقال تین سال پہلے ہو گیا تھا۔ اب چچا ایک وقت کی روٹی کے لیے بھی اپنے بیٹوں اور بہوؤں کے محتاج تھے۔ کچھ عرصہ پہلے بیمار ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے کاروبار پر بھی توجہ نہیں دے پا رہے تھے اور اسی وجہ سے چھوٹا بیٹا ناراض بھی تھا کیونکہ سارا کام اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔

عمار کو سن کر افسوس ہوا تھا۔

''چچا! آپ کسی کام میں دل لگائیں۔ اچھی خوراک لیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے انہیں تسلی دی تھی۔

''کیا کام کروں؟ کاروبار بیٹوں کے حوالے کر دیا۔ محنت نہیں ہوتی اب مجھ سے۔'' وہ سادگی سے بولے۔

''کوئی بات نہیں چچا۔ اللہ آپ کو حوصلہ دے۔'' وہ کہہ کر اٹھ گیا تھا۔

اگلا گھر مہناز پھپھو کا تھا۔ وہ ہاشم چچا کی سگی بہن تھیں اور عظمت علی کی کزن......

ان کے دو بیٹے اور اکلوتی بیٹی تھی۔ چھوٹا بیٹا سعودی عرب گیا ہوا تھا۔ بڑا بیٹا شادی شدہ تھا۔ جبکہ بیٹی اریج اپنے شوہر سے ناراض ہو کر گھر آ بیٹھی تھی۔ جس پر بڑا بیٹا ارشد اپنی ماں سے ناراض تھا۔

ماسی اللہ رکھی اپنی غربت سے پریشان تھی۔ تو چاچا احسان کا بیٹا ایکسیڈنٹ میں ایک ٹانگ کھو چکا تھا۔ عمار کو محسوس ہوا کہ یہاں سب ہی پریشان ہیں۔

الیاس ماموں کا رویہ اچھا تھا۔ مگر شکیلہ مامی لیے دیے ہی رہیں۔ شاید انہیں سارہ کا رشتہ نہ ہونے کا اب تک دکھ تھا۔

مگر گھر کا ماحول وہی تھا۔ جس سے عمار کو چڑ تھی۔ شمائلہ سے بڑی بہن شائستہ اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ لیکن کہیں سے بھی ان میں ادب و تمیز نہیں تھی۔ شائستہ خود بھی پہلے کی طرح نک چڑھی اور مغرور تھی۔

''دانش بھائی نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' اس نے الیاس ماموں کے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا تھا۔

''کراچی میں ہی رہتے ہیں دانش بھائی۔ بزنس بھی اچھا ہو گیا ہے۔ اور بنگلہ بھی لے لیا ہے...... شائستہ فخریہ بولی تھی۔

عمار سمجھ گیا تھا کہ اتنی جلدی ترقی کی کیا وجہ ہے......؟

''اور سبحان کے رشتے کا کیا ہوا......؟'' شمسہ نے بات بدلی تھی۔

''فیملی اچھی نہیں ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ رشتہ ختم کر دیں۔'' بڑی مامی اور ماموں چپ تھے۔ مگر شائستہ کی زبان چل رہی تھی۔

''میں نے تو سنا تھا کہ سبحان کی حرکتوں کی وجہ سے لڑکی والوں نے رشتہ ختم کر دیا ہے۔'' شمسہ بولی تھیں۔

جس پر شائستہ نے منہ بنایا اور کہنے لگی۔

''اپنے گھٹیا کارناموں کو لوگ دوسرے کے ہی نام سے بیان کرتے ہیں۔''

''سبحان اس وقت کہاں ہے؟'' عمار نے یہ ٹاپک ختم کیا تھا۔

''اپنے دوستوں کے ساتھ ہوگا۔ شام کا زیادہ تر وقت وہ وہیں گزارتا ہے۔'' مامی نے مزے سے بتایا تھا۔

الیاس ماموں کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا۔ وہ اپنے بیوی اور بچوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو کوئی اور لڑکی پسند آ گئی ہو؟''

''یہ تم نے ٹھیک کہا...... لڑکی ہے نا...... اپنے ہی گھر کی......''

شائستہ نے مزے لیتے ہوئے کہا تھا۔

''تو بات آگے بڑھائی۔'' شمسہ نے تعجب سے عمار کو دیکھا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے سر کھپانے کی۔

''پرپوزل جا چکا ہے۔ یقین ہے کہ جواب ہاں میں ہوگا۔'' شائستہ کو اعتماد تھا۔ بڑے ماموں اور مامی سے اجازت لے کر وہ خالہ ثریا کے گھر گیا تھا۔

خالہ ثریا بچوں کو گھر میں قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ ان کے شوہر ایک عالم دین تھے۔ خالو کے انتقال کو دو سال ہو چکے تھے۔ تین بیٹیاں تھیں۔ اور تینوں کی شادی ہو چکی تھی۔ خالہ گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے صحن چھوٹا پڑ رہا تھا داماد مصروف تھے۔ چھت پر کام کروانا چاہ رہی تھیں۔ مگر اکیلی ہونے کی وجہ سے پریشان تھیں۔

''اب میں آ گیا ہوں...... کوشش کروں گا کہ آپ کے کسی کام آ سکوں۔'' عمار نے سعادت مندی سے کہا تھا۔ اور انہوں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

ان کا آخری پڑاؤ فراست ماموں کا گھر تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہر چیز نفاست اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

عمار کو شروع سے ہی ذاتی طور پر فراست ماموں اور فردوس مامی پسند تھے فضا کا بھی وہ ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ مگر شمسہ کے خود کہنے کے باوجود بھی اس نے فضا سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اور شمسہ کو یہی کہا تھا کہ وہ ابروڈ میں شادی کر چکا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ شمسہ نے یقین نہیں کیا تھا۔ مامی اور فضا نے ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ یہ عمار کے لیے سرپرائز تھا۔ مگر شمسہ کو مطمئن دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے وہ جانتی تھیں۔

ساری روایتی ڈشز تھیں۔ قورمہ، بریانی، بھنا مغز، کھیر، سلاد......

''واہ مامی واہ...... مزہ آ گیا۔ کھانا تو سارہ نے بھی اچھا پکایا تھا۔ مگر اس کی تقریر نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔''

اوہ...... اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے غلط جگہ غلط بات کہہ دی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟ سارہ...... اور یہ بتاؤ...... تم سب کے لیے کچھ نہ کچھ لائے ہو۔ اس کے لیے کیا شاپنگ کی......" شمسہ کو اب بیٹی کی یاد ستائی تھی۔

"آپ کی لاڈلی بیٹی اور اپنی لاڈلی بہن کو سب سے بڑا سوٹ کیس تھما کر آیا ہوں...... اور فضا تمہارا بیگ بھی کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔" اپنی بہن کے لیے اس کی زبان سے ٹپکتی محبت کی چاشنی تلاشتی وہ گڑبڑا گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے۔ دروازہ بجا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں......" عمار نے دروازہ کھولا تھا۔

سامنے اٹھائیس انتیس سالہ نوجوان تھا۔ چست جینز وڈارک کمبی نیشن کی ٹی شرٹ، گلے میں لٹکتا لاکٹ...... انگوٹھیوں سے بھری انگلیاں...... اس سے پہلے کہ عمار کچھ کہتا۔ اس نے عمار کو بازوؤں میں بھرلیا تھا۔

"یار! تم ہو کون......؟" عمار اس آفت جہاں سے پریشان ہوا تھا۔

"سجان بھائی!" فضا نے عمار کے پیچھے آ کر آسانی کردی تھی۔

"یار فضا! تم مجھے بھائی وائی نہ کہا کرو......" عمار کو اس کے طرز تخاطب پر حیرانی ہوئی تھی۔

"امی نے بتایا کہ عمار بھائی میرا پوچھ رہے تھے۔ میں نے سوچا...... چلو اپنے گھر نہ سہی...... چاچی کے گھر مل لیتے ہیں۔" اس نے زبردستی قہقہہ لگایا تھا۔ جبکہ باقی سب سنجیدہ تھے۔

"یار! ادھر آؤ...... میرے برابر میں بیٹھو......" عمار نے اسے ٹوکا تھا۔ فضا کے برابر والی کرسی پر بیٹھنے سے......

"ارے بھائی! آپ تو اب آئے ہیں نا یہاں پر۔ میں ہی چاچی اور فضا کے سارے کام کرتا ہوں۔ پوچھ لیں آپ چاچی سے۔ اس نے ایک نظر فضا پر ڈالی تھی جو کہ پانی کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ رہی تھی۔

"سچ یار بھائی! اتنا کام ہوتا تھا۔ تھک جاتا تھا۔ مگر اب چاچی کو تو منع نہیں کر سکتا نا......" وہ ان پر احسان جتا رہا تھا۔

"سمجھو...... تمہاری ڈیوٹی ختم۔"

"وہ...... کیسے؟"

"وہ...... ایسے کہ میں نے مامی کے لیے ایک ملازم رکھ دیا ہے۔ وہ سارے کام کرے گا۔"

عمار نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

"تم اپنا فیوچر بناؤ...... لگ رہا ہے کہ آج کل ٹک ٹاک بنا رہے ہو۔" عمار نے اس کے حلیے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے! آپ سچ سمجھے...... یہ دیکھیں، آپ کا چھوٹا بھائی کتنا مشہور ہے؟" وہ بچوں کی طرح خوش ہوا تھا۔

فضا چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اور وہ چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ٹک ٹاک ویڈیو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

صبح سے ہی گول گلی میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ صفائی کے بعد مرمت کا کام شروع ہو گیا تھا۔ سب نے ہی اپنی کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکا تھا۔ شرٹ ٹراؤزر اور پی کیپ میں ملبوس عمار اپنی نگرانی میں کام کروا رہا تھا۔ برگد کے تنے پر کچھ ہی شاخیں بچی تھیں۔ اس کی ہدایت پر تاج علی اسے روز پانی ڈال رہا تھا۔

ایک ہفتے بعد گول گلی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ حویلی میں مردانہ بیٹھک کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے کو اس نے اپنے کلینک کے لیے صاف کروا لیا تھا۔

پھر وہ کراچی چلا آیا۔ پہلے سارہ کے گھر گیا تھا۔ وہ اس سے اب تک ناراض تھی۔ مگر شان اور روشی کو اپنے کھلونے اور چاکلیٹ بہت پسند آئے تھے۔ فراز کو آف نہیں ملا تھا۔ اسے مارکیٹ اکیلے ہی جانا پڑا تھا۔

پورا دن مصروف گزارنے کے بعد اس نے شام روشی اور شان کے ساتھ کھیلنے میں گزار دی تھی۔ یہاں تک کہ بچے تھک ہار کر اس کے دونوں ہاتھوں پر سر دیے سو گئے تھے اور وہ بھی درمیان میں لیٹا خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر عمار کو سرپرائز ملا تھا کہ سارہ بھی اس کے ہمراہ جائے گی۔ بائی روڈ جانے کے لیے عمار تو راضی نہیں تھا۔ مگر فراز کے آگے اس کی نہیں، چلی۔ سارہ آگے بیٹھی تھی۔ اور وہ مزے سے روشی اور شان کے ساتھ پیچھے تھا۔ سفر مزے سے گزرا تھا۔ جب فراز نے حویلی کے سامنے گاڑی روکی۔ تو تاج علی ان کا منتظر تھا۔ سارہ بچوں کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ فراز نے چابی تاج علی کو تھمائی تا کہ وہ بیگز اور دوسرا سامان لے کر اندر آجائے۔

جبکہ عمار برگد کے درخت کے پاس چلا آیا تھا۔ درخت کے آس پاس کھاد ڈال دی گئی تھی۔ اور مٹی بھی نم تھی۔ کسی نے پانی بھی ڈال دیا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا۔ اس سے پہلے کہ حویلی کی جانب مڑتا۔ خالہ ثریا نے بلند آواز سے اسے بلایا تھا۔

☆☆☆

"یہاں پر سب موجود ہیں۔ عمار کہاں ہے؟" شمسہ فراز سے پوچھ رہی تھیں۔

"ممانی جان! وہ برگد والے چبوترے پر گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔" فراز نے بے فکری سے کہا تھا۔

"توقیر جا کر عمار بھائی کو بلا کر لاؤ۔" اب شمسہ نے توقیر کو کہا تھا۔ یہ تاج علی اور زرینہ کا چودہ سالہ بیٹا تھا۔ وہ ابھی باہر سے آیا تھا۔ اور دونوں ہاتھ شاپرز سے لدے ہوئے تھے۔ زرینہ نے شاپرز توقیر سے لیے۔ اور کچن میں گھس گئی۔

توقیر جب باہر نکلا۔ تو عمار خالہ ثریا اور ہاشم چچا سے محو گفتگو تھا۔

"بھائی جان! آپ کو امی جان بلا رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... خالہ...... میں فارغ ہو کر آپ کی طرف آتا ہوں۔" جب عمار حویلی میں داخل ہوا۔ تو در و دیوار بچوں کی قلقاریوں اور بڑوں کے قہقہوں سے گونج رہے تھے۔

شمسہ کو اس نے صحن میں منتظر پایا تھا۔ "جاؤ...... جلدی سے فریش ہو کر آؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔"

جب وہ نیچے آیا۔ تو سب افراد ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ زرینہ باجی، فضا...... کھانا سرو کر رہے تھے جبکہ شمسہ ان کی نگرانی کر رہی تھیں۔ سارہ فراز و روشی اور شان سے اس کی نظریں گزرتی ہوئی عاصم بھائی پر جا ٹھہری تھیں اور اس نے بے اختیاری میں شمسہ کو دیکھا تھا۔ ناگواری کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے سے گزری تھی۔ عاصم کے برابر میں شمائلہ۔ شیبا اور دس سالہ عثمان تھا۔

اس کے قدم من بھر کے ہو چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جا کر بیٹھے...... یا واپس اپنے کمرے میں چلا جائے۔ شمسہ...... کو اندازہ ہو گیا تھا۔ تبھی بلند آواز سے بولی تھیں۔

"آؤ...... عمار! میں نے سب کو تمہاری وجہ سے اکٹھا کیا ہے۔" عمار نے زخمی نگاہوں سے شمسہ کو دیکھا تھا۔

"لنچ میں تم سب بہن بھائیوں کے پسندیدہ کھانے ہیں۔ عاصم کے لیے سری پائے، سارہ کے لیے پلاؤ، اور تمہارے لیے کڑاہی گوشت بنایا ہے۔" شمسہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر میں اس طرح بٹھایا تھا کہ کہیں مبادا وہ بھاگ ہی نہ جائے۔

"رک تو جائیں امی! اتنے سالوں بعد بھائی جان کو دیکھا ہے۔ ملنے تو دیں......" وہ شمسہ کے شکنجے میں کسمسایا تھا۔ اور ماحول کا تناؤ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

عاصم اور عمار اٹھے تھے۔ اور گرمجوشی سے گلے ملے تھے۔ شمسہ کی آنکھوں میں نمی اتری تھی۔ شمائلہ کا رویہ لیا دیا ہی تھا۔

عثمان زبردستی اپنے چچا عمار کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ سب ہی مزے دار کھانے سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ شمسہ بھی اس کے برابر میں تھیں۔ بہت سالوں کے بعد شمسہ نے سب کو اکٹھے دیکھا تھا۔

"امی! کڑاہی گوشت میں بہت مرچیں ہیں۔" وہ سی سی کر رہا تھا۔ تو چکن منچورین کھا لو...... یہ فضا نے خاص طور پر تمہارے لیے بنوایا ہے۔

"فضا کہاں ہے......؟" شمسہ سے اس کا نام

سن کر اس نے پوچھا تھا۔
"وہی تو تم سب کی میزبانی کر رہی ہے۔ مجھے بھی بٹھا دیا ہے کہ پھپھو میں سب کچھ خود کر لوں گی۔"
"تو کیا وہ اکیلے کھانا کھائے گی......؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔
"تو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا لو۔" فراز نے سرگوشی کی تھی۔
عمار اسے نظر انداز کرتا ہوا فضا سے مخاطب ہوا تھا۔ "چلو...... تم سب کے ساتھ کھانا کھاؤ......" ٹیبل پر سب موجود ہیں۔ میں تخت پر بیٹھ کر کھا لوں گا۔ وہ اپنی پلیٹیں اٹھا کر کمرے میں موجود چھوٹے تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ شمائلہ نے معنی خیز نظروں سے عاصم کو گھورا تھا۔ جبکہ سارہ اس کی حرکت پر خوش ہوئی تھی۔

☆☆☆

خالہ ثریا کا اوپر والا پورشن بن رہا تھا اور عمار نے اس کی ذمے داری ہاشم چچا کو سونپی تھی۔ کچھ دنوں پہلے خالہ ثریا نے عمار کو اسی لیے بلایا تھا۔ درخت کے پاس کرسی بچھائے صبح کے وقت وہ اور ہاشم چچا اس معاملے پر ڈسکس کر رہے تھے۔ اتنے میں ہاشم چچا کا پوتا رحمٰن اپنے ہاتھ میں کچھ دبائے آیا تھا۔
"دادا ابو! آپ کو امی بلا رہی ہیں۔ ناشتہ کر لیں۔" عمار نے اسے سر سے پیر تک بخوبی دیکھا تھا۔ وہ بمشکل چار سے پانچ سالہ پھرتیلا بچہ تھا۔
"یہ کیا ہے......؟" عمار نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔
"مرغی!" عمار نے حیرت سے رحمٰن کو اور اس کی مرغی کو دیکھا تھا۔
"یہ انڈہ دیتی ہے۔"
"جی...... ہاں......!"
"یار! ایک دو انڈے مجھے بھی لا دینا۔ میں کل ناشتے میں کھاؤں گا۔ ٹھیک ہے...... پرامس۔"
"پرامس...... انقل (انکل)۔" اور ہنستا مسکراتا اپنے دادا کے ساتھ چلا گیا۔
حویلی کے اندر آیا۔ تو شمسہ کو سب کے ناشتے کی فکر تھی...... تاکہ وہ آرام سے دن بھر کے کام نبٹا سکیں۔
آج عمار کے چھوٹے سے کلینک کی اوپننگ تھی۔ اس کے کچھ مہمان بھی آئے تھے اسی لیے دوپہر کو حویلی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ حویلی کے باہر دیگیں پک رہی تھیں۔ تو اندر قرآن خوانی اور محفل میلاد کا اہتمام تھا۔ سبحان زبردستی عمار کے ساتھ اس کے کلینک کی سیٹنگ کروا رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسی دوران وہ سو سے زیادہ سیلفیز اور تین چار سے ٹک ٹاک ویڈیو بنا چکا تھا۔ بمشکل کمرہ کلینک کے طرز پر سیٹ کر کے عمار اسے اپنے ساتھ باہر لے آیا تھا۔ اور ربن توقیر نے لگا دی تھی۔
عصر کے بعد کلینک کا افتتاح تھا۔ خواتین اور لڑکیاں چھت پر سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ اور خوش تھیں۔ ربن کاٹنے والی شخصیت دیکھ کر فضا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں وہ کوئی اور نہیں سرجن ڈاکٹر شمسی تھے۔ انہوں نے ربن کاٹ کر عمار کو گلے لگایا تھا جبکہ عاصم اور فراز بھی ساتھ کھڑے تھے۔
سب سے پہلا مریض چاچا احسان کا بیٹا فیاض تھا۔ ڈاکٹر شمسی نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ پھر انہیں کراچی کے اسپتال میں چیک اپ کا مشورہ دیا تھا۔ اور ان باپ بیٹوں کا حوصلہ بھی بڑھایا تھا۔
ماسی اللہ رکھی اور ہاشم چچا کو عمار نے اپنے مریضوں کو لائن سے بٹھانے اور دوسرے کاموں کے لیے متعین کر دیا تھا۔ وہ دونوں اس عمر میں بھی بڑی چابک دستی سے اپنے کام سرانجام دے رہے تھے۔ اگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تو عمار سے پوچھ لیتے۔
ایک بامقصد اور اچھے کام کے آغاز کے بعد ایک مزے دار ضیافت ڈاکٹر شمسی اور دوسرے مہمانوں کے لیے تھی۔
مہمانوں کو رخصت کر کے اور دوسرے ضروری کاموں کو نبٹاتے ہوئے وہ بہت تھک چکا تھا۔ مگر بہت خوش تھا۔

☆☆☆

وہ اور فراز آج صبح سے ہی اس زمین پر موجود

تھے۔ جس پر عمار اسپتال بنانا چاہتا تھا۔

نقشہ آخری مراحل میں تھا۔ کنسٹرکشن کے لیے عمار اس کا ٹھیکا فراز کی کمپنی کو دینا چاہتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ فراز ابھی تک ٹھنڈ و آدم میں ہی تھا۔ وہ دونوں شیڈ کے نیچے آپس میں ڈسکشن میں اتنے مصروف تھے۔ کہ انہیں عاصم کی آمد کا علم بھی نہیں ہو سکا تھا۔

"کیا...... اکیلے اکیلے کام کر رہے ہو۔ تم دونوں...... یار! کچھ مجھے بھی بتاتے......"

عاصم برابر میں بیٹھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"بھائی جان!" سب کچھ پلان تھا۔ عمار سنجیدہ تھا۔

"یار! اتنی اچھی زمین ہے...... شہر کے بیچوں بیچ...... ابا نے فائدے کے لیے لی تھی نا...... انڈے دینے والی مرغی کو ذبح مت کرو...... ہسپتال ہی بنوانا ہے۔ تو آم والے باغ میں بنوالے...... خدمت بھی ہو جائے گی۔ تیری ضد بھی پوری ہو جائے گی...... اور مریض بھی کم آئیں گے۔"

عاصم کے ہر لفظ سے حرص و ہوس ٹپک رہی تھی۔

فراز غصہ ضبط کر گیا تھا۔ مگر عمار کو شاید اسی کی توقع تھی۔

"بھائی جان! یہ زمین میری ہے...... اور ان شاء اللہ میں اسی پر اسپتال بناؤں گا۔ تاکہ کوئی بھی انسان کم از کم اسپتال دور ہونے کی وجہ سے مر نہ سکے۔"

"بڑوں کے آگے ضد نہیں باندھتے...... یہ غریب تجھے کیا دیں گے؟ کچھ بھی نہیں...... ڈاکٹر بننے کا شوق تھا...... وہ تو بن گیا...... نیکی کمانے کے لیے تو چندہ ہی دنیا کافی ہوتا ہے...... بھلا اتنا خرچ......"

"میں نے آپ سے مشورہ نہیں مانگا......"

عمارہ کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"دیکھو عمار! یہ سب ابا کا ہے...... لیکن میری بھی خون پسینے کی کمائی ہے۔ نوجوانی سے لے کر آج تک کام ہی کر رہا ہوں...... تمہاری طرح پیسہ نہیں بہایا تعلیم پر...... میں تمہیں پیار سے سمجھا رہا ہوں...... سمجھ جاؤ...... زمین بھی دے دوں گا...... اور سرمایہ بھی......"

"ورنہ......" عمار نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

"ورنہ...... تم یہاں ایک اینٹ بھی رکھ کر دکھاؤ......" عاصم اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا چلا گیا تھا۔

جبکہ فراز عمار کو دیکھنے لگا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اب کیا کرو گے......؟

☆☆☆

رات کے دو بج چکے تھے مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور ہوتی کیوں نہیں......؟ ماضی کی پرچھائیاں کمرے کی تیز روشنیوں پر بھی چھا رہی تھیں۔

وہ شروع سے ہی محنتی و دیانت دار اور اصول پرست تھا۔ اپنا گھرانہ اسے ہمیشہ سے ہی مکمل لگتا تھا۔ ایک بہت ہی پیار کرنے والی ماں اور بہت ہی ناز و نعم سے پرورش کرنے والے باپ...... عمار اور سارہ میں شروع سے ہی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ مگر عاصم کا مزاج ان دونوں سے تھوڑا مختلف تھا۔

ان کے گھر میں دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنے کچھ خرچے شام کو مختلف اکیڈمیز میں پڑھا کر پورا کرتا تھا۔ عظمت علی کو معلوم ہوا۔ تو وہ ناراض ہوئے تھے۔ کیونکہ اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں کافی بڑی رقم موجود تھی۔ اپنے بیٹے کی اس ذمے داری پر عظمت علی کو بھی فخر تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ وہ مکمل طور پر اپنی تعلیم پر دھیان دے۔

یہی بات عاصم کو بری لگتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ عمار کی تعلیم ان کی دولت پر ایک بوجھ ہے۔ اگر وہ بھی شروع سے ہی اس کی طرح ابا کے ساتھ کام کرتا...... تو دولت میں اضافہ ہوتا...... کمی نہیں......

اسی نظریے کی بنیاد پر عاصم اور عمار کی راہیں جدا ہو گئی تھیں...... اسی پر بس نہیں تھا...... جب عاصم کی زندگی میں شمائلہ شامل ہوئی تو اس کی حریصانہ فطرت مزید نکھری...... شمائلہ کی روز بروز کی جانے والی الٹی سیدھی باتوں نے عاصم کو عظمت علی اور شمسہ سے مزید دور کر دیا تھا۔

دوسری طرف عظمت علی بھی اپنے بڑے بیٹے سے متنفر ہوتے جا رہے تھے۔ عاصم کو اپنے اور اپنی

بیوی کے الٹے سیدھے خرچے نظر نہیں آتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے سسرال کو بھی سپورٹ کر رہا تھا۔ دانش کو کراچی میں بزنس کرنے کے لیے اسی نے رقم فراہم کی تھی۔

ان ہی دنوں جب عمار کراچی میں ہاؤس جاب کرنے کے بعد اسپشلائزیشن کے لیے باہر کی یونیورسٹیز میں اپلائی کر رہا تھا۔ عظمت علی بھی بیمار تھے مگر جیسے ہی یہ خبر عاصم کو ملی۔ اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا کہنا یہی تھا کہ عمار کو اب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر وہ آگے اپنی اسٹڈیز جاری رکھنا چاہتا ہے تو اپنا حصہ عظمت علی کے حصے میں سے لے۔ اور اسی میں سے خرچ کرے۔

عاصم کا رویہ عظمت علی کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر انہوں نے وکیل کو بلا کر اپنی وصیت تحریر کروائی تھی۔ شمسہ کے علاوہ باقی سب اس وصیت سے بے خبر تھے۔ پھر اس شام کو عظمت علی نے اپنے منشی قربان میاں کے ساتھ وکیل صاحب کو بھی بلوالیا تھا۔ عاصم و عمار اور فراز بھی موجود تھے۔

منشی قربان میاں کے پاس ایک ایک پائی کا ریکارڈ موجود تھا۔ عظمت علی کی محنت کے آگے عاصم علی کا کوئی کمال نہیں تھا۔ بلکہ اس کے کاموں میں ہیرا پھیری اور دو نمبری نمایاں تھی۔

اس پر عظمت علی نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ اگر وہ ابھی الگ ہونا چاہتا تھا۔ تو اپنی کمائی ہوئی دولت لے کر الگ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ سب کچھ عمار کے نام کر دیں گے۔ اور سارہ کو بھی شریعت کے مطابق اس کا حق دیا جائے گا۔ جبکہ عاصم کو وہ کچھ اور نہیں دے سکتے۔

اگر عاصم چاہتا ہے۔ کہ اسے اپنے باپ کی جائیداد میں سے حصہ ملے۔ تو وہ اسی صورت ممکن ہے کہ جس طرح وہ کام کر رہا ہے کرتا رہے۔ اس کی نگرانی منشی قربان میاں کریں گے۔ اور شمسہ کو بھی آگاہ کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ عمار اپنی اسٹڈی مکمل کر کے واپس نہ آ جائے۔

یہ چند سطریں عاصم علی کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھیں۔ دل اور دماغ میں عمار کے لیے حسد اور بغض میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر وہ یہ فیصلہ قبول نہیں کرتا۔ تو باپ کی جائیداد اس کے ہاتھ سے چلی جاتی۔

منشی اور وکیل کے جانے کے بعد عاصم اور شمائلہ نے ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عظمت علی کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔ ہسپتال میں سہولتیں نہ ہونے کے باعث وہ حیدر آباد جاتے ہوئے انتقال کر گئے تھے۔

عظمت علی کی موت شمسہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔ عاصم اور شمائلہ تو پہلے ہی گھر چھوڑ چکے تھے۔ سارہ اپنے گھر کی تھی۔ اور عمار کا ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا۔ اس بھری پری حویلی میں اکیلے رہنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اور اب انہی کی وجہ سے عمار باہر جانے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر شمسہ کے بعد فردوس ماسی کے سمجھانے پر ہی وہ باہر جانے پر راضی ہوا تھا۔

تاج علی اور زرینہ میاں بیوی ہونے کے ساتھ ان کے پرانے ملازم بھی تھے۔ حویلی کے پچھلے حصے میں ان کی رہائش تھی۔ شمسہ کا خیال وہی رکھتے تھے۔ پھر فضا جو کہ اپنی پھوپھو کو تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔

☆☆☆

وہ رات کو کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ جب فردوس کمرے میں آئی تھیں۔

”پڑھ رہی ہو......“

”جی......“

فردوس کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے پوچھیں؟

”الیاس بھائی اور بھابھی آئے تھے...... مجھ سے جواب مانگنے ......“ انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

فضا کے چہرے پر ناگواری کی ایک لہر آئی تھی۔

”فی الحال میں نے کہا ہے کہ تم ابھی پڑھ رہی

ہو۔اور میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔"
"آپ انہیں صاف انکار نہیں کر سکتی تھیں۔"
اس کا غصہ برقرار تھا۔
"کیسے انکار کردوں...... تمہارے تایا اور تائی ہیں تمہارے ابو کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی ہمارا خیال کیا ہے...... اور جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ عمار باہر شادی کر کے آیا ہے۔تب سے وہ تمہارا رشتہ مانگ رہے ہیں۔"
"آپ کو لگتا ہے کہ عمار بھائی نے شادی کرلی ہے۔" وہ بے ساختہ بولی تھی اور پھر لب بھینچ لیے تھے۔
"میرا مسئلہ یہ نہیں ہے۔کہ عمار نے شادی کی ہے یا نہیں...... میرا مسئلہ تمہارا مستقبل ہے...... تمہیں اچھے اور مضبوط ہاتھوں میں دیکھنا ہی میرا مقصد ہے۔"
دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اس کو نئی سوچیں دے گئی تھیں۔
عمار کا رویہ اس کے ساتھ برا نہیں تھا۔لیکن ایسا بھی کچھ خاص نہیں تھا۔جو اس کے دل کی دنیا کو زیرو زبر کر لیتا۔
اس نے اپنی ماں کے منہ سے اپنے ساتھ عمار کا نام بنا تھا۔اور اس کی وجہ شمسہ تھیں۔جو اس کو خاص الخاص رکھتی تھیں فردوس نے کئی دفعہ شمسہ سے پوچھا تھا کہ کیا عمار اس رشتے کے لیے راضی ہے......؟
اور شمسہ فخر سے کہتیں۔کہ میرا بیٹا میری نافرمانی نہیں کرے گا۔
ابروڈ جانے کے تین سال بعد عمار چھٹیوں پر پاکستان آنا چاہ رہا تھا۔جس پر شمسہ نے اسے اپنے دل کی بات بتائی تھی۔
فضا اتنا جانتی تھی کہ اس نے نہ صرف انہیں انکار کردیا تھا۔بلکہ اپنے ہی بیج کی کسی لڑکی کے لیے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔اور جب اس نے یہ سنا کہ شمسہ اس کی پاکستان آمد پر فضا سے رسم بھی کردیں گی تو اس نے پاکستان آنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔اور

اسے یہ سب کچھ سارہ آپی نے بتایا تھا۔
وہ بچپن میں ہی باپ کی محبت وشفقت سے محروم ہوگئی تھی۔اگر شمسہ،فردوس کا ساتھ نہ دیتیں تو اس کا ایم بی بی ایس کرنا ناممکن تھا۔ان کی محبت کا احساس ہی فضا پر بھاری تھا۔آگے اس کی قسمت تھی۔

☆☆☆

فردوس اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔مگر سکون انہیں بھی نہیں تھا۔وہ سمجھ رہی تھیں کہ اس رشتے کے پیچھے وہ خود ہی قصوروار ہیں۔کیونکہ ان کے گھر کے زیادہ تر کام الیاس بھائی ہی کرتے تھے۔
جب سے دانش کراچی شفٹ ہوا۔تو الیاس کو اپنے کاروبار پر زیادہ توجہ دینی پڑی۔جس کی وجہ سے سبحان کا فردوس کے گھر میں آنا جانا بڑھا۔سبحان انگیجڈ تھا۔اس لیے فردوس کو زیادہ پریشانی بھی نہیں تھی۔مگر اب یکدم عمار کے منع کرنے پر شمسہ کی خاموشی اور پھر سبحان کی منگنی کا ٹوٹنا اور پھر فضا کا رشتہ لے کر آنا فردوس کے لیے پریشان کن تھا۔
صبح فضا کے کالج جانے کے بعد وہ شمسہ کے پاس چلی آئی تھیں۔شمسہ ان کا چہرہ دیکھ کر بھانپ چکی تھیں۔کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔اور جب فردوس نے سبحان کے رشتے کا بتایا۔تو وہ بھی پریشان ہوگئیں۔
"شمائلہ تو کہیں بھی سکھ لینے نہیں دیتی۔اسی نے بڑی بھابھی کے کانوں میں یہ بات ڈالی ہوگی۔عمار کی شادی والی بات میں نے کسی کو نہیں بتائی۔مگر دیکھ لو...... سب کو پتا چل گیا۔مجھے اگر معلوم ہوتا کہ......"
"اب میں کیا کروں...... آپا؟" فردوس نے ان کی بات کاٹی تھی۔
"ان سے وقت مانگو...... شاید اللہ بہتری کرے......" انہوں نے آس دلائی۔
"جس لڑکی کا باپ سر پر نہ ہو۔کوئی بھائی بھی نہ ہو...... اس کا بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔" ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"کوئی ہے یا نہیں ہے۔ مگر اللہ تو ہے...... وہ تو اپنے بندوں کے دلوں کا حال جانتا ہے...... وہ سب بہتر کر دے گا۔" انہوں نے فردوس کو گلے لگا کر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ وہ خود بہت پریشان تھیں۔ ان کے خیال میں عمار کے لیے فضا سے بہترین شریک حیات کوئی اور نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ بھی نہیں...... جس کے بارے میں عمار بذات خود کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

آج وہ صبح سویرے اٹھ کر جاگنگ کے لیے اسٹیشن آ گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے حیدر آباد کے گورنمنٹ ہسپتال کو جوائن کرنا تھا۔ وہ چاہ یہی رہا تھا کہ اس کی پوسٹنگ حیدر آباد میں ہی ہو جائے۔ تاکہ ٹنڈو آدم سے حیدر آباد آنے اور جانے میں اس کا وقت بچ سکے۔ بلیک ٹراؤزر و بلیک ٹی شرٹ اور بلیک جوگرز میں ملبوس وہ اس وقت پسینے سے شرابور تھا۔ جب ٹرین کی آمد کا اعلان ہوا تو وہ رش سے بچنے کے لیے پل پر چڑھ گیا تھا۔ اس کی پشت پر اسٹیشن کا دوسرا رخ تھا۔ اور اس کی نظریں پنجاب کی طرف سے آنے والی ٹرین پر تھیں۔ چھک چھک کرتی ٹرین زناٹے سے گزر گئی تھی۔

اوہ...... اوہ...... اسے رکنا نہیں تھا۔ وہ بور ہو کر پل سے اترا تھا۔ سامنے اسٹیشن کے کنارے پر فضا کا رکشا رکا تھا۔

وائٹ کوٹ پر بلیک اسکارف کے ساتھ اس کا بیگ بھی بلیک ہی تھا۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھا رہی تھی۔ جیسے اسے بہت جلدی ہو۔ ایک اور اسٹوڈنٹ گرل اسے بنچ پر بیٹھی نظر آئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس کے قریب جاتا۔ اس کے پیچھے سبحان نے اپنی بائیک روکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا بکے تھا۔ وہ فضا کے پیچھے آیا تھا۔ اس طرح سے...... مگر کیوں......؟ اسے برا لگا تھا یکدم وہ فضا کے آگے آ گیا تھا۔ وہ شاید اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ فضا نے اس کو بغور سنا تھا۔ اور پھر اسے کچھ نرمی سے کہا تھا جس پر سبحان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

عمار پیپل کے درخت کی آڑ سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد فضا نے اسے ہاتھ سے اللہ حافظ کہا تھا اور اسی بنچ والی لڑکی کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی تھی۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔ عمار نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد فضا کی ٹرین آ گئی تھی۔ ٹرین کے جانے کے بعد سبحان بھی چلا گیا تھا۔

وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گول گلی پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک نیا تماشا لگا ہوا تھا۔ رحمٰن اپنی مرغی ہاتھ میں دبائے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور ہاشم چچا اسے ڈانٹ رہے تھے۔ آس پاس ہجوم لگ گیا تھا۔ کوئی رحمٰن کو سمجھاتا۔ کوئی ہاشم کو...... مگر دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کچھ کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

وہ ہجوم میں راستہ بناتا ہوا اندر گیا تھا۔ ہاشم چچا کو وہ مرغی کاٹ کر کھانی تھی۔ جبکہ وہ انہیں دینے کو تیار نہیں تھا۔

"یار!" یہ انڈہ نہیں دے گی۔ ہم اس کا سوپ بنا کر پئیں گے۔ اور اس کی ٹانگ کھائیں گے۔" ہاشم چچا اسے بہلا رہے تھے۔

"یہ دے گی انڈہ......" رحمٰن بضد تھا...... اور عمار کے ساتھ ساتھ پورا مجمع مسکرا اٹھا۔

"کیا ہاشم چچا...... چھوڑیں رحمٰن کو...... اور اس کی مرغی کو...... میں آپ کو دیسی مرغا بھجواتا ہوں۔" عمار نے رحمٰن کی جان چچا سے چھڑوا دی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ حویلی میں جاتا...... فردوس مامی نے اسے بلند آواز سے پکارا تھا۔ "جی مامی......" وہ سعادت مندی سے گویا ہوا تھا۔

"بیٹا! اگر شہر کی طرف کسی کام جانا ہو...... تو میرا یہ سامان منگوا دینا۔ اگر جلدی آ جائے۔ تو مہربانی ہو گی۔"

"ارے مامی...... مہربانی کیسی......؟ میں آج فارغ ہوں...... ناشتہ کر کے لا دوں گا۔"

لسٹ لے کر وہ نکلا۔ تو سبحان اپنے دروازے پر کسی لڑکے سے باتوں میں محو تھا۔

فضا اور سبحان کے درمیان بات چیت نارمل انداز میں ہوئی تھی۔ اگر مامی چاہتیں تو لسٹ سبحان کو بھی دے سکتی تھیں۔ مجھے کیوں بلایا......؟ وہ الجھا تھا۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا۔ کل سے اسے ڈیوٹی جوائن کرنا تھی۔ ہسپتال کا نقشہ ابھی تک پاس نہیں ہو سکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا کام آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ البتہ رات کے وقت اس کے کلینک پر رش بڑھ گیا تھا۔ بعض اوقات اسے گیارہ بھی بج جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے اسے شمسہ کی ڈانٹ کھانی پڑتی۔

اتوار کو کلینک کی چھٹی ہوتی تھی۔ اور اسے کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ شمسہ فردوس کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ آج فراست ماموں کے کچھ مہمان آئے تھے۔

حویلی میں اس وقت سناٹے کا راج تھا۔ کرسٹینا سے بات کرنے کا اس سے اچھا موقع اسے نہیں مل سکتا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد کرسٹینا نے اس کی کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"سوری...... مجھے معاف کر دو......"

"مجھے معلوم ہے...... کہ تم بہت پریشان تھیں...... میری وجہ سے......"

"لیکن میں کیا کروں......؟ ابھی یہاں کا ماحول تمہارے لیے سازگار نہیں ہے۔ پھر بچوں کا بھی مسئلہ ہے...... یہاں ایڈجسٹمنٹ کا...... پھر ایجوکیشن ہے...... بہت سارے مسائل ہیں۔"

"جب تم میرے لیے اتنی بڑی قربانی دے سکتی ہو...... تو کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تھا۔ وہ ہنسا تھا۔

اسے بلانے کے لیے آنے والی فضا سر سے پیر تک پسینے میں نہا گئی تھی۔ ایک کپکپی سی اس کے وجود پر طاری ہوئی تھی۔

وہ پیچھے مڑی تھی...... مگر چھوٹا سا گملا اس کے پیروں کی چال نہ سمجھ سکا اور گر کر ٹوٹا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ گملے کی آواز سن کر عمار چونکا تھا۔

"کون ہے......؟ کون ہے یہاں پر......؟" وہ سیڑھیوں کی گرل تک پہنچا۔ تو اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ جب کہ ٹوٹا ہوا گملا کسی کی آمد کا بتا رہا تھا۔

"میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں......" اس نے کرسٹینا کو کہہ کر موبائل آف کیا...... اور نیچے اترا۔

دروازہ کھول کر باہر نکلا...... تو توقیر فردوس مامی کے گھر سے آ رہا تھا۔

"بھائی جان! آپ کو فردوس مامی بلا رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... میں آتا ہوں۔"

اپنا حلیہ درست کر کے دس منٹ بعد وہ فردوس مامی کے گیسٹ روم میں بیٹھا تھا۔

حاجی شوکت...... فراست ماموں کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک تھے، اب کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ بقول ان کے وہ اپنی فیملی کے ساتھ فراست ماموں کی بیوہ اور بیٹی کی خیر خبر لینے آئے تھے۔ عمار اپنا تعارف کروا چکا تھا...... پورے گھر میں مزیدار کھانوں کی خوشبوئیں۔ پھیلی ہوئی تھیں۔ یعنی جو سامان منگوایا تھا۔ وہ ان ہی مہمانوں کے لیے تھا۔ اس نے سوچا تھا۔

"دیکھو بیٹا!" الیاس بھائی تو مجھے آج ملے نہیں...... وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔ اور بھابی مجھ سے پردہ کرتی ہیں۔ تم مجھے سمجھ دار لگتے ہو...... میں اور فراست بہت گہرے دوست تھے۔ ہنسی مذاق میں ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر ہماری اولادیں شادی کے قابل ہوئیں تو ہم آپس میں رشتے داری کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب اس وعدے کی پاسداری کا وقت آ گیا ہے۔"

"کیا یہ واقعی میں اتنے بھولے بھالے ہیں......؟ جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔" عمار

نے سوچا تھا۔

"آپ کے صاحبزادے کیا کرتے ہیں؟"

"یہ ہے نا...... خرم اپنے بارے میں بتاؤ نا۔" حاجی شوکت سینہ چوڑا کرکے بولے۔

وہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ عمار کو اس سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا۔ کہ وہ محض انٹر پاس ہے اور آج کل کسی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ اور اگر خوش قسمتی سے اس کی شادی فضا سے ہوگئی۔ تو وہ آگے پڑھنے کی کوشش کرے گا...... آخر کو وہ ڈاکٹر فضا جو ہوگی۔

عمار کا دل تو چاہا کہ ان باپ بیٹا کو گریبان سے پکڑے اور باہر نکال دے۔ مگر نہ تو یہ اخلاقیات کا تقاضہ تھا اور نہ ہی مہمان داری کا......

اسی وقت فضا ٹرے تھامے آئی تھی۔ خرم اسے دیکھ کر فضول میں مسکرایا تھا۔ عمار کو تو کم از کم یہ سب فضول اور بکواس لگ رہا تھا۔

"تم کیوں آئیں......؟" وہ غصہ ہوا تھا۔

"ٹیبل سیٹ کرنے......" وہ منمنائی

"مجھے...... اور توقیر کو بھیجو۔"

پھر وہ دوبارہ نہیں آئی تھی۔ توقیر نے ہی سارے کام نبٹائے تھے۔ لنچ کے بعد جب توقیر چائے لایا تو عمار حاجی شوکت کو کچھ اس طرح کہہ رہا تھا۔

"فی الحال ابھی فضا پڑھ رہی ہے۔ مامی کا اس کی شادی یا منگنی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں اتنے قابل نوجوان موجود ہیں کہ ہمیں فضا کی شادی خاندان سے باہر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اور جہاں تک بات کی جائے۔ ماموں جان کے وعدے کی...... تو مامی کو ایسے کسی وعدے کا علم نہیں ہے...... اگر آپ آئندہ اس آس کے ساتھ نہ آئیں تو بہت مہربانی ہوگی۔"

تھوڑی دیر بعد حاجی شوکت اپنی فیملی سمیت رخصت ہو رہے تھے۔

"مامی! کیا آپ کو معلوم ہے؟ کہ یہ کس مقصد کے لیے آئے تھے؟" اب وہ فردوس سے پوچھ رہا تھا۔

"جس گھر میں بیٹیاں ہوتی ہیں۔ وہاں کوئی بھی سوالی بن کر آسکتا ہے۔" وہ حوصلے سے مسکرا رہی تھیں۔

شمسہ بیٹھی ہوئی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔

"آخر آپ اس کی شادی کے لیے پریشان کیوں ہیں۔ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ اس طرح وہ ڈسٹرب ہوگی۔" وہ انہیں سمجھا رہا تھا۔

"پھر میں کیا کروں......؟ تم ہی بتادو۔" انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

"بہترین وقت کا انتظار اور ایک اچھے لڑکے کا بھی۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"یہ کون آیا تھا چاچی......؟ عجیب وغریب لوگ تھے۔ میری ٹک ٹاک ویڈیو آخری لمحے میں خراب کردی۔ کہہ رہے تھے۔ دو چار جماعتیں پڑھ کر لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں اتنا قابل ہے۔ تو خود شادی کیوں نہیں کرلیتا۔"

دروازہ شاید کھلا رہ گیا تھا۔ سبحان اندر آکر جلدی جلدی کہہ رہا تھا سب ہنس پڑے تھے۔

"اب آپ سب مجھ پر کیوں ہنس رہے ہیں؟ میں چلتا ہوں۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"ارے رکو بھئی...... سیلیبریشن کرنی ہے یار......" عمار نے اسے روکا تھا۔

"کیا سیلیبریٹ کرنا ہے؟" اس نے سوال داغا؟

"فضا کا برتھ ڈے......"

"آپ لیٹ ہوگئے ہیں میں کل صبح ہی اسے وش کرچکا ہوں۔" (اس نے منہ بنایا)

"ایک تو تم ہر کام میں جلد بازی کرتے ہو...... اور اسی وجہ سے غلطی کرجاتے ہو دس مارچ آج ہے...... کیوں مامی......؟"

"تمہاری یادداشت پر حیرت ہے عمار۔" مامی نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی مگر سبحان بھی کم نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے معلوم تھا کہ فضا کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے۔ کل وش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں سب سے پہلے فضا کو وش کروں۔"

شمسہ کو اس پر پیار آیا تھا۔ انہوں نے اس کا کان کھینچا تھا۔ سب ہنسنے لگے۔ توقیر کیک لے آیا تھا۔ بقول عمار کے وہ اپنی امی کی لاڈلی کا کیک حیدرآباد سے بنوا کر لایا ہے۔

ایک چھوٹا سا گفٹ باکس اور سرخ گلاب کی کلیوں کے بکے اس کے ٹیبل کی زینت بن گئے تھے۔

کیک کاٹتے وقت فضا نروس تھی اور چپ بھی۔ جبکہ توقیر، عمار اور سبحان نے گلا پھاڑ پھاڑ کر ہیپی برتھ ڈے ٹو فضا کہا تھا۔

جبکہ فردوس اسے دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھیں کہ آج عمار نے جس طرح حاجی شوکت کے سامنے ان کا مان رکھا۔ اور اب یہ سب کچھ جو کہ صرف اور صرف فضا کی خوشی کے لیے تھا۔ مگر انہیں فضا خوش دکھائی نہیں دی۔ لیکن فضا خوش کیوں نہیں تھی؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

☆☆☆

عمار کی روٹین لائف مزید ٹف ہو چکی تھی۔ گورنمنٹ ہاسپٹل میں ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد وہ شام کے وقت کلینک میں باقاعدگی سے مریضوں کا چیک اپ کر رہا تھا۔

اس دوران اس نے محسوس کیا کہ مارکیٹ میں بہت سی دوائیں جعلی ہیں۔ جس کی وجہ سے مریضوں کی جلد صحت یابی کی شرح میں کمی تھی۔ بعض دیہاتی خواتین خوشی خوشی اپنا چیک اپ کروانے آتیں۔ کہ وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ اور بعض کو اپنے مسائل بتاتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر فضا کو تھوڑی ٹریننگ دے دی جائے۔ تو ان خواتین کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اور اس مقصد کے لیے اسے موقع محل دیکھ کر فضا سے بات کرنا تھی۔

آج سنڈے تھا۔ لیکن وہ اپنی روٹین کے مطابق صبح سویرے اٹھ گیا تھا۔ شمسہ کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنا کمرہ بند کر کے بیٹھ گیا تھا۔ تاکہ باہر سے آنے والی آوازیں اسے ڈسٹرب نہ کر سکیں۔

سب سے پہلے اس نے لیپ ٹاپ کھولا۔ اور پھر ای میلز چیک کی تھیں۔ کچھ میلز کا ریپلائی کیا۔ اس کے بعد اپنے کلینک کے لیے میڈیسن کا اسٹاک دیکھا تھا۔ پھر اسی لسٹ کو دیکھتے ہوئے میڈیسن کا آرڈر دے دیا تھا۔

اس کے بعد وہ ہسپتال کی فائل کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ زمین اس کی اپنی تھی۔ مگر وہ اس کے تعمیراتی اخراجات کا تخمینہ کرنا چاہ رہا تھا۔ تاکہ اندازہ کر سکے کہ وہ کب تک اسے مکمل کروا لے گا۔ فائنلی اس کا تخمینہ فراز کی کمپنی کی طرف سے بتایا جانا تھا۔

وہ فائل دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ درمیان میں فراز کا فون آیا۔ جس پر اس نے فراز سے اس کی رائے مانگی تھی فراز کا جواب سننے کے بعد اس نے اپنا بینک اکاؤنٹ چیک کیا تھا۔

اگلا فون اس نے وکیل صاحب کو کیا تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ ان کے ساتھ بحث کرتا رہا تھا۔ جس پر انہوں نے اسے ملاقات کے لیے کہا تھا۔

اگلے اتوار کا دن طے کر کے وہ کچھ دیر کے لیے بیڈ پر آڑھا ترچھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔

کسلمندی دور کرنے کے لیے اس نے کافی میکر سے کافی بنائی تھی۔ اور اپنے کمرے کے ٹیرس میں آ گیا تھا۔

اپنے مخصوص اسٹول پر بیٹھا ہاتھ میں کپ پکڑ کر وہ مزے سے کافی پینے لگا۔ جبکہ دل اور دماغ کہیں اور مصروف تھے۔

سبحان کی بھی آج چھٹی تھی۔ وہ برگد کے نیچے ٹک ٹاک بنانے میں مصروف تھا۔ ایک لمحے کو عمار اسے دیکھ کر ہنسا تھا۔

اسی اثناء میں فضا دروازے سے باہر نکلی تھی۔
وائٹ ٹراؤزر پر بلیک کرتی کے ساتھ ریڈ دوپٹہ اس پر سوٹ کر رہا تھا، ہاتھ میں ٹرے تھی۔
سبحان اپنی ٹک ٹاک ویڈیو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا تھا۔ اور اس کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
فضا کو جتنی جلدی تھی۔ اتنی ہی سبحان کو کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کھڑا ہی اس سے باتیں کرنے کے لیے ہوا تھا۔
عمار کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رویہ دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے فضا کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ شاید سبحان...... اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا۔ سبحان نے اپنی جگہ چھوڑی تھی۔ اور گھوم کر فضا کے آگے ایکشن سے ہاتھ لہراتا ہوا آیا۔ شاید کوئی گانا گا رہا تھا۔ اسی دوران اس نے کن انکھیوں سے اپنی سامنے والی عمارت کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی شرارت عمار سے چھپی نہ رہ سکی۔ سبحان کی آنکھوں کے تعاقب میں جو لڑکی ادھ کھلی کھڑکی سے اسے جھانکتی نظر آئی۔ وہ مہناز پھپھو کی ارینج کی۔
سبحان کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا تھا۔
پھر اس نے سر خم کرتے ہوئے فضا کو رستہ دے دیا تھا۔ جس پر فضا نے اسے بادل نخواستہ تھینکس کہا تھا۔
فضا حویلی میں داخل ہو گئی تھی۔ سبحان اپنا موبائل اسٹینڈ اٹھا کر اپنے گھر میں گھس گیا تھا۔
جبکہ وہ لڑکی ابھی بھی وہیں کھڑی تھی۔
گول گلی میں اب سناٹا تھا۔ کافی کی آخری چسکی کے ساتھ وہ اب اپنا موبائل فون چیک کر رہا تھا۔
تبھی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا۔ تو سامنے فضا تھی۔
اس کے آنے کا مقصد پوچھنے کے بجائے وہ واپس اسی انداز میں اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔
گرے ٹراؤزر پر گرے ٹی شرٹ کے ساتھ اس کے سلیپرز بھی گرے ہی تھے۔ میچنگ کا تو خوب معلوم ہے۔ ڈاکٹر عمار کو...... مگر اخلاقیات کا نہیں معلوم...... اسے لاپروائی سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر اسے غصہ آ رہا تھا۔
"کیا کر رہے ہیں...... آپ......؟" اس نے رسما پوچھا تھا۔
"گول گلی میں ہونے والا تماشا دیکھ رہا تھا۔" وہ موبائل پر نظریں جھکائے ہوئے ہی بولا تھا۔
"جب آپ کا تماشا دیکھ کر دل بھر جائے تو نیچے آ جائیے گا۔ پھپھو جان بلا رہی ہیں۔" اسے برا لگا تھا عمار کو محسوس ہوا۔
"کیوں؟"
"لنچ کرنے کے لیے......" اس نے وجہ پیش کی۔
"یہ تم روز روز کیا پکا کر لاتی ہو؟ اتنا ٹائم کہاں سے ملتا ہے تمہیں؟" اب وہ اسٹول سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔
"اپنی پھپھو کے لیے لاتی ہوں۔" وہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔
"ویسے سبحان کیسا لڑکا ہے؟" سادگی سے پوچھتے ہوئے وہ بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔
"اچھے ہیں سبحان بھائی، ہمارا خیال رکھتے ہیں۔" اس نے بھی بھول پن سے جواب دیا تھا۔
"وہ تو لگ ہی رہا تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ جس پر فضا نے مڑ کر اسے غصیلی نگاہوں سے گھورا تھا۔
اس کے مزید سوال و جواب سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے اترنے لگی۔ غلطی سے پہلے اسٹیپ کے بجائے دوسرے پر پاؤں رکھا تھا۔ اگر عمار اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ وہ تو منہ کے بل گرتی اس کی آنکھوں سے نمی چھلکی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا۔
جبکہ عمار کو سامنے دیکھ کر وہ سٹ پٹائی تھی۔ اپنے آپ کو اس سے آزاد کرتی۔ دوپٹا سنبھالتی۔ وہ گھر کی طرف بھاگی تھی۔
اپنی بدلتی کیفیت کو سنبھالتے ہوئے ایک گہرا سانس اس نے اندر لیا تھا۔ اور ڈائننگ ٹیبل کے آگے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہ فضا کہاں ہے؟" شمسہ پوچھ رہی تھیں۔
"وہ گھر چلی گئی، اسے کوئی کام تھا......" عمار نے بات بنائی تھی۔
"یہ لو کڑھی چاول کھاؤ۔ فضا لائی تھی۔" شمسہ نے ڈش اس کے آگے سرکاتے ہوئے کہا تھا۔
وہ بھی چپ چاپ کھانا نکال کر کھانے لگا۔
اس کا دل اس کے دماغ کے ساتھ سرکشی کر رہا تھا۔ کیوں......؟ وہ یہ جان کر بھی نہیں جاننا چاہتا تھا۔

☆☆☆

آج کالج سے واپسی پر وہ بہت تھک چکی تھی۔ ٹرین لیٹ تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ گھر جا کر آرام کرے گی۔ سنڈے کی اہمیت اسٹوڈنٹ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔
گھر آئی۔ تو فردوس کو پریشان دیکھا تھا۔
اس کے پوچھنے پر بھی نہیں بتایا اور اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگیں۔ وہ فریش ہو کر آئی تو انہیں بھی منتظر پایا۔
"آپ نے کھانا نہیں کھایا...... مگر کیوں؟" وہ بھی پریشان ہوئی تھی۔
"آپ کو معلوم ہے کہ اگر آپ وقت پر کھانا نہ کھائیں تو آپ کا معدہ پرابلم کرتا ہے۔ پھر آپ کا بی۔ پی ہائی ہو جاتا ہے۔"
"تنہا رہنے سے بھی انسان بور ہو جاتا ہے۔ بس آج اکیلے کھانا کھانے کا دل نہیں کیا۔" انہوں نے وجہ پیش کی تھی۔
"اچھا جلدی کھالو۔ مجھے شمسہ باجی کی طرف جانا ہے۔"
"خیریت ہے۔" نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے وہ اب تک حویلی نہیں گئی تھی۔
"ہاں، خیریت ہے ایسے ہی۔ ویسے بھی بہت دنوں سے حویلی نہیں گئی۔ فردوس نے گول مول جواب دیا تھا۔
فضا چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھ گئی تھی۔ اور فردوس شمسہ کی طرف آگئیں۔ شمسہ فارغ تھیں۔ اور برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس لیے فردوس کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔
"آپا! اکیلی بیٹھی ہیں۔"
"ظاہر سی بات ہے۔ عمار ویسے تو میری وجہ سے اب نیچے سونے لگ گیا ہے۔ لیکن اپنے کاموں کے لیے وہ اوپر والے کمرے میں ہی جاتا ہے۔ بہو بیٹا سمجھو تو...... ہو کر بھی نہیں ہیں...... اور دوسرے کا کچھ اتا پتا نہیں ہے...... آیا شادی کی بھی ہے یا نہیں...... اگر کی ہے۔ تو وہ لڑکی کہاں ہے؟ اور اگر نہیں کی ہے۔ تو شادی نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟"
فردوس کو دیکھتے ہی وہ دل کی بھڑاس نکالنے لگی تھیں۔ مگر جب فردوس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اور وہ چپ چاپ انہی کو سنتی گئیں۔ تو انہیں فکر ہوئی۔
"کیا ہوا خیر تو ہے؟ فضا ٹھیک ہے۔"
اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ وہ پریشان تو تھیں ہی۔ شمسہ کی محبت دیکھی تو رونے لگیں۔
"کیا ہوا؟ زرینہ! فردوس کے لیے پانی لاؤ۔" شمسہ نے گھبرا کر زرینہ کو آواز دی تھی۔
پانی پینے کے بعد جب فردوس کو تھوڑی تسلی ہوئی۔ تو وہ شمسہ کو بتانے لگیں۔ "کہ صبح الیاس بھائی اور بھابھی آئے تھے۔ اور بھابھی دھمکی دے کے گئی ہیں کہ اگر میں نے فضا کا رشتہ سبحان سے نہیں کیا تو وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔ اب بتائیں۔ میں کیا کروں......؟
"بھلا یہ کیا بات ہوئی...... ماں باپ کی مرضی ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کی شادی جہاں دل چاہے کریں دھونس اور زبردستی سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔" شمسہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔
"تم کہو...... تو میں الیاس بھائی اور بھابھی سے بات کرتی ہوں...... اور عمار سے بھی......"
"آپا! کیا کریں گی عمار سے بات کرکے۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی میں اس نے شادی کر لی ہو۔ یا پھر

اسے کوئی اور لڑکی پسند ہو۔ اب میں فضا کو اس کی دوسری بیوی تو بنانے سے رہی۔ رہی سبحان کے رشتے کی بات۔ تو کم از کم ایک بات ہے۔ انہیں فضا میں دلچسپی تو ہے۔" فردوس نے بڑی صفائی سے اپنے دل کی بات کہی تھی۔ اور شمسہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ فضا کے لیے انہیں جواب دے چکی ہیں۔

☆☆☆

نیوسوسائٹی ٹنڈو آدم کے اس خوب صورت بنگلے میں کسی حد تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

عثمان اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ جبکہ عاصم اور شمائلہ اپنے بیڈ روم میں موجود تھے۔ ننھی شیبا سو رہی تھی۔ ان دونوں کو ایک ہی فکر تھی۔ کسی طرح عمار کو اس کے ارادے سے باز رکھنا۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کا بھائی ساری دولت غریبوں میں لگا دے گا۔" شمائلہ منہ بناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ساری کیوں......؟ اپنا حصہ ہی وہ ان بھیک منگوں پر لگا سکتا ہے۔ اسی پر اختیار ہے...... اس کا۔" عاصم کے لہجے میں نخوت اور غرور تھا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر مجھے تمہاری ماں سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔" شمائلہ کا موڈ ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔ میں امی جان کے کسی بہکاوے میں نہیں آؤں گا۔" عاصم نے اسے تسلی دی تھی۔

"دیکھ لو...... کہیں ماں کی محبت میں سب کچھ اس لاڈلے کے حوالے کر دو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ جو تم چاہوں گی۔ ویسا ہی ہوگا۔ اب میرا تمہارے علاوہ ہے ہی کون؟ بس تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔"

"وعدہ۔" شمائلہ نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا تھا۔ "وعدہ۔" عاصم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تھا۔

"اب تو خوش ہونا۔"

اور شمائلہ نے سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

عمار صبح ناشتے کے بعد سے غائب تھا۔ جبکہ شمسہ کو اس سے ضروری بات کرنی تھی۔

وہ پہر تین بجے وہ حویلی میں داخل ہوا تھا۔ اور کسی حد تک تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اگر شمسہ اسے آواز نہ دیتیں۔ تو وہ اوپر والے کمرے میں چلا جاتا۔

"جی امی جان!" وہ فرمانبرداری سے ان کے پاس چلا آیا۔ "کھانا لگوا دوں......"

"نہیں ابھی موڈ نہیں ہے۔ آپ بتایئے۔ کوئی ضروری کام تھا۔ مجھ سے۔"

"ہاں! ایسا ہی سمجھ لو۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں تم سے جو کچھ بھی پوچھوں۔ اس کا سچ سچ جواب دینا۔"

"پوچھیے؟" اسے تعجب ہوا تھا۔

"کیا تم نے واقعی میں باہر شادی کر لی ہے......؟"

"آخر آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا؟" وہ غصہ ہوا تھا۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میری اولاد میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولی تھیں۔

"میں روزانہ فضا کی وجہ سے آپ کی ڈانٹ نہیں کھا سکتا۔" وہ ناراض ہو کر اصل مدعے پر آیا تھا۔

"اور میں نہیں چاہتی کہ روز روز فردوس...... فضا کی وجہ سے پریشان ہو کر میرے در پر آئے۔" وہ اس پر غصہ ہوئی تھیں۔

"آخر آپ لوگوں کا مسئلہ کیا ہے۔" وہ تخت پر سے اٹھ گیا تھا۔

"مجھے فضا میں فی الوقت کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ اگر مامی کو اتنی ہی جلدی ہے۔ اسے بیاہنے کی۔ تو وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ مجھے ابھی اور بھی بہت

سے کام ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اوپر جاتا۔ شمسہ کی آواز اس کے پیروں کی زنجیر بن گئی تھی۔

"عمار! یہ حویلی تمہارے بابا اور میں نے تمہارے نام کی تھی۔ کیوں کہ تم ہمارے فرماں بردار اور اچھے بیٹے ہو۔ مگر لگتا ہے کہ مجھے اپنا یہ فیصلہ واپس لینا پڑے گا۔"

"امی جان! آپ ابھی بھی مجھے اپنا فرماں بردار پائیں گی جو چاہیں کریں۔" پرعزم لہجے میں کہتا وہ اوپر زینے چڑھتا چلا گیا۔ شمسہ اس کے فیصلے سے نڈھال تخت پر ڈھے گئی تھیں۔

☆☆☆

وکیل صاحب سے فائنل میٹنگ کرنے کے بعد آج اس کے ہمراہ ڈاکٹرز کا ایک پینل موجود تھا۔

عمار چاہ رہا تھا کہ جب تک اسپتال مکمل ہو۔ اس سے پہلے ہی کسی نیم سرکاری اسپتال میں گورنمنٹ اجازت نامے کے ساتھ مریضوں کا چیک اپ شروع کردیا جائے۔ تاکہ جب تک نیا اسپتال کام کرنا شروع کرے۔ اس وقت تک وہ شہر میں اپنے آپ کو مصروف کرسکیں۔

اسی سلسلے میں یہ میٹنگ رکھی گئی تھی۔ ان میں سے کچھ سرجن ڈاکٹرز ریٹائرڈ تھے۔ کچھ آن ڈیوٹی تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق حیدرآباد، ٹنڈو آدم اور آس پاس کے شہروں سے تھا۔

خدمت خلق کی اس راہ پر چلتے ہوئے عمار کو معلوم ہوا تھا کہ اس راہ پر وہ اکیلا نہیں ہے۔ بلکہ اس راہ پر ہر گزرنے والا اپنا حصہ اس کے ساتھ ادا کررہا تھا۔

یہ میٹنگ امید افزا ضرور تھی۔ مگر ابھی بھی کچھ پہلوؤں پر غوروفکر کرنا ضروری تھا۔

دوسرے میٹنگ کے ساتھ اس اسپتال میں ضروری آلات اور مشینیں لائی گئی تھیں۔

تیسری میٹنگ میں میڈیکل ٹیسٹ کی سہولتوں میں آسانی کے ساتھ ساتھ ایک ڈیمو ایمرجنسی منعقد کی گئی۔ جس کا مقصد آئندہ ہونے والے چیک اپ کی سہولتوں کا جائزہ لینا تھا۔

چوتھی میٹنگ کے ساتھ ساتھ ایک میڈیکل کیمپ بھی تھا۔ جس میں کافی تعداد میں سرجن اور اسپشلائزڈ ڈاکٹرز موجود تھے۔ بلاشبہ یہ عمار کا ایک کارنامہ تھا۔ میڈیکل کیمپ کے بعد عمار نے حویلی میں ڈاکٹرز کے لیے ایک ظہرانے کا اہتمام بھی کیا تھا۔

پرتکلف ظہرانے کے بعد جب تاج علی اور توقیر چائے لے کر آئے۔ تو عمار کو اطلاع دی گئی تھی۔ کہ وکیل صاحب آئے ہیں۔ اور عمار کو اندر بلایا جارہا ہے۔ جب عمار اندرونی کمرے میں گیا۔ تو وکیل صاحب کے ساتھ شمسہ اور عاصم بھی موجود تھے۔

وکیل صاحب اور شمسہ کے درمیان بات چیت ہوچکی تھی۔ اسی لیے عمار کو دیکھ کر شمسہ اس پر برس پڑیں۔

"عمار! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ تم اپنی زمینیں بیچ رہے ہو۔" جواباً عمار خاموش تھا۔

"اور اگر بھابھی آپ نے حویلی بھی ان کے نام نہیں کی۔ تو ان کے پاس عظمت صاحب کی جائیداد میں سے کچھ بھی نہیں بچے گا۔" وکیل صاحب نے وضاحت کی۔

"امی جان! بات دراصل یہ ہے کہ اسپتال بنانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کے لیے کروڑوں سے اربوں روپے تک کا بجٹ چاہیے۔ اب بتایئے کہ اتنی رقم میں کہاں سے لاؤں؟ زمین داری میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ تو زمینیں بیچ کر ہی اسی بجٹ کے لحاظ سے میں کنسٹرکشن کا کام شروع کرواسکتا ہوں۔" عمار نے آرام سے شمسہ کو رام کیا تھا۔

"اور میں کہتا ہوں کہ یہ اسپتال ہی نہیں بننا چاہیے۔ یہ خود تو کنگال ہونے جارہا ہے۔ اور ہمیں بھی کرے گا۔" عاصم طیش میں آکر بولا تھا۔

"چاہے مجھے کچھ ملے یا نہ ملے۔ بھائی جان! مگر یہ اسپتال ضرور بنے گا۔" عمار کا بھی لہجہ خودبخود سخت ہوگیا تھا۔

''ایسی کی تیسی...... میں دیکھتا ہوں۔'' عاصم اٹھ کر حویلی کے اس کمرے میں گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹرز اب جانے کے لیے عمار کا انتظار کر رہے تھے۔

عاصم نے جاہلوں کی طرح سب سے پہلے بیٹھے ہوئے سرجن ڈاکٹر ابرار مرچنٹ کو گدی سے پکڑا اور اسی حالت میں عمار کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

''بھائی جان!'' ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ کا جھگڑا مجھ سے ہے۔ یہ اس وقت ہمارے مہمان ہیں۔''

اس سے پہلے کہ عمار اٹھتا۔ عاصم نے ریوالور نکال لیا تھا۔

''وہیں بیٹھے رہو۔ وکیل صاحب! اسپتال والی زمین کے کاغذات نکالیے......اور عمار کو دیں۔ تاکہ وہ سائن کرے۔''

شمسہ سکتے میں آ گئی تھیں۔ اور عمار سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ''او کے! آپ سر کو چھوڑیں۔ میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

عاصم نے اپنا الٹا ہاتھ ڈاکٹر ابرار کی گردن سے ہٹا لیا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو بیٹا؟ ایک اچھے کام کے لیے میری جان کا نذرانہ چاہیے تو مجھے قبول ہے۔'' ڈاکٹر ابرار اس صورت حال میں بھی عمار کو امید دلا رہے تھے۔

''حق اور سچ کے راستے میں ساتھ دینے والی طاقت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آج میں حق پر ہوا۔ تو میرا اور میرے کام کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' عمار ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔

کاغذات پر دستخط کر کے اس نے عاصم کے حوالے کر دیے تھے۔ شمسہ کو جیسے ہوش آیا تھا۔ عاصم کے قریب آئیں۔ اور اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔

''دفع ہو جا...... پوری عمر مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔''

پھر ڈاکٹر ابرار کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''بھائی صاحب! اگر حوصلہ ہو۔ تو مجھ غریب ماں کو معاف کر دیں۔ جانے انجانے میں تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔''

ڈاکٹر ابرار مسکرائے تھے۔ ''میری بہن! ہمارا کام بندوں سے ناراض ہونا نہیں ہے۔ ہم تو اس کے بندوں اور اس کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔ شفا وہ دیتا ہے۔ وسیلہ ہم بنتے ہیں۔''

''ان شاء اللہ...... اللہ نے چاہا...... تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹرز میں بے چینی اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر ابرار نے ہی ان کا غصہ کم کیا تھا۔

عمار چپ چاپ صوفے پر ٹکا تھا۔ اسے دکھ تھا۔ تو اپنے مہمان کی بے عزتی کا......

وہ نہ جانے کب تک وہاں بیٹھا رہتا۔ اگر اسے توقیر آ کر ڈاکٹرز کے جانے کی اطلاع نہ دیتا۔

وہ ڈھیلے ڈھالے انداز سے اٹھا تھا۔ وکیل صاحب کو تاج علی نے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔

تمام ڈاکٹرز اس سے مل کر جا رہے تھے۔ افسردہ اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ۔

''کم آن یار! یہ زمین گئی ہے ہمارا مشن نہیں...... اللہ! تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔'' ڈاکٹر شمسی نے اس کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔ اس نے بھی سر ہلا دیا تھا جب تمام گاڑیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو وہ اندر داخل ہوا تھا۔

حویلی کے صحن میں شائلہ بیٹھی چیخ رہی تھی جبکہ عاصم جیسے ہوش میں نہیں تھا۔

اس کی پیٹھ شمسہ اور عمار کی جانب تھی۔ شمسہ اسے دیکھ کر تیر کی طرح لپکیں اور اپنی چپل اتار کر عاصم کی کمر پر برسانے لگیں۔ مگر اسے جیسے کسی نے منجمد کر دیا تھا۔

دفعتاً عمار کی نظر بہتے ہوئے خون پر پڑی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا تھا۔ ساکت حویلی جیسے چلنے لگی۔ سب منتشر لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ عثمان

پتنگ اڑاتے ہوئے چھت پر سے گر گیا تھا۔ اور خون میں لت پت بے ہوشی کے عالم میں تھا۔

عمار اسے فرسٹ ایڈ دینے لگا۔

"مجھے اسے ہسپتال منتقل کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر ابرار...... اونہہ...... انہیں کیسے روکوں گا...... میں" وہ بڑبڑایا تھا۔ اور عاصم کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی تھی۔

"میں روکوں گا انہیں...... میرے بچے کو بچالو عمار...... میرے بچے کو......" خون میں لت پت وہ تیزی سے اپنی گاڑی لے گیا تھا۔ جبکہ عمار عثمان کو اسپتال لے جانے لگا۔ گلی میں ہلچل مچ گئی تھی۔ گوٹھ سے شہر کے درمیان ریلوے اسٹیشن تھا شومئی قسمت اس وقت ٹرین گزرنے والی تھی۔ پھاٹک بند تھا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹروں کا قافلہ ٹرین کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

عاصم خون میں لت پت پہنچا تھا۔ جسموں کے مسیحا آج پہلی بار باطن کی مسیحا گری کا نظارہ کر رہے تھے۔ آسمان پر پہنچا ہوا غرور آج ان کے قدموں کی خاک بنا ہوا تھا۔

ڈاکٹر ابرار نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ اور یہ قافلہ اسپتال پہنچ گیا تھا تاکہ عمار کے آتے ہی عثمان کا چیک اپ کیا جا سکے۔

"جس پہلو کے بل وہ گرا تھا۔ اس ہاتھ اور پیر دونوں کی ہڈیاں فریکچر ہوئی تھیں۔ جبکہ سر پر بھی گہری چوٹ تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ اگر بروقت سبحان کا خون اس کے خون سے میچ نہ کرتا۔ تو مسئلہ ہو جاتا۔ اور اگر اس وقت ڈاکٹرز موجود نہ ہوتے تو عثمان کی جان کو خطرہ تھا۔

خواتین میں گھری شمسہ کو یہ سب آہستگی سے بتا کر تو قیر اسپتال چلا گیا تھا اور شمسہ شکرانے کے نفل پڑھنے اٹھی تھیں۔

☆☆☆

فردوس بڑی بھابی اور الیاس بھائی کے ہاتھوں ہار گئی تھیں۔ انہوں نے سبحان کو فضا کے لیے قبول کر لیا تھا۔

گول گلی کے ساتھ ساتھ حویلی بھی برقی قمقموں سے سجی ہوئی تھی۔ حویلی کی کھلی چھت پر رسم کے لیے خوب صورت ارینجمنٹ کیا گیا تھا جس کے لیے عمار نے دو دن سے اپنی مصروفیات ترک کی ہوئی تھیں۔

فضا کو فردوس نے حیدر آباد سے بیوٹیشن بلوا کر تیار کروایا تھا۔ اور وہ اس وقت عمار کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔

سب موجود تھے۔ مگر سارہ بجھی بجھی سی تھی۔ اس نے عمار سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

عثمان وہیل چیئر پر تھا۔ شمائلہ اور عاصم اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ دونوں کی لالچ اور ہوس کا اختتام اسی دن ہو گیا تھا۔ جس دن اکلوتا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرا تھا۔ اسی دن عاصم کو احساس ہوا کہ جب کوئی اپنا جان سے پیارا محض ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے مرتا ہوگا۔ تو اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہوگا۔

وہ دونوں میاں بیوی شمسہ سے معافی مانگ کر حویلی واپس آ گئے تھے۔ شمسہ نے بھی انہیں معاف کر دیا تھا اور عمار کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ راہ راست پر آ گئے۔

فراز اور عمار ایک جانب کھڑے ہوئے تمام انتظامات دیکھ رہے تھے۔

"تم کس خوشی میں اتنا تیار ہوئے ہو...... مامی سے جوتے کھانے کی خوشی میں؟" فراز نے عمار کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ میرا راستہ صاف ہو گیا ہے۔" عمار نے اسی کی ٹون میں جواب دیا تھا۔

"ہم...... ہم......" فراز نے عمار کو ٹہوکا دیا تھا۔ عمار نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فضا اپنی سہیلیوں کی جھرمٹ میں تھی۔ مگر لگ رہا تھا کہ اس کا دھیان ان دونوں کی طرف تھا۔

"ویسے فردوس مامی نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور تم نے بھی۔" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ

کر فراز کو برا لگا تھا۔

تب ہی سبحان نے چھت پر انٹری دی تھی۔ لڑکے اور بچے اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ اور اس کے گرد بھنگڑا ڈالنے لگے۔

سبحان کو بڑی عزت واحترام کے ساتھ اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا۔ پھر سارہ فضا کو لے کر آئی تھی۔

"لو بیٹا! جلدی سے انگوٹھی پہنا دو...... بسم اللہ کرو۔" بڑی بھابھی کو بہت جلدی تھی۔

سبحان نے مسکراتے ہوئے انگوٹھی ہاتھ میں پکڑی ہی تھی کہ ان دونوں کے سامنے کھڑی اریج بھری شیرنی کی طرح سبحان پر جھپٹ پڑی۔

"پہلے میری زندگی برباد کی۔ اب فضا کی کرنا چاہتے ہو۔" ایک عجیب سا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا......؟

آخر کار خاندان کے بزرگوں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ اور پھر سب حویلی کے بڑے کمرے میں جمع ہوئے تھے۔ عقدہ کھلا کہ سبحان اور اریج ایک دوسرے کو کافی عرصے سے پسند کرتے تھے۔ مگر سبحان کی امی اور اریج کا بڑا بھائی دونوں اس رشتے کے خلاف تھے۔ جلد بازی میں اریج کی شادی حیدر آباد میں کر دی گئی تھی مگر اس لڑکے کو بھی اریج میں دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے دن سے ہی دونوں میں ان بن رہی۔ اور آخر کار اس نے اریج کو طلاق دے دی تھی۔

اریج نے دوبارہ سبحان سے رابطہ کیا۔ مگر سبحان نے اسے بتایا۔ کہ وہ اپنی امی کو نہیں منا سکا ہے۔ اور وہ اسے اپنی مرضی کرنے پر خودکشی کی دھمکی دے رہی ہیں۔ اس لیے اگر وہ اپنے طور پر کچھ کر سکتی ہے تو کر لے۔ ورنہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اس لیے مجبوراً اریج کو یہ سب کرنا پڑا۔ مہناز پھپھو شرمندگی سے رو رہی تھیں۔ اور شکیلہ خاتون اپنا منہ چھپائے پھر رہی تھیں۔

تب فردوس کے بڑے بھائی جمال دین جو خصوصی طور پر اس رسم میں شرکت کے لیے پنجاب سے آئے تھے۔ کہنے لگے۔

"جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ نکاح سے پہلے اپنے بچے اور بچیوں کی رضامندی معلوم کر لو۔ تو ہم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ شریعت اور معاشرت کے دائرے میں اگر ہم جتنی جلدی اس فرض سے نبٹ جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ گر یہ رشتہ ہو جاتا تو اس سے کتنی زندگیاں برباد ہوتیں۔ ایک طرف سبحان کے ساتھ زبردستی اور دوسری طرف فردوس پر دھونس۔ اریج تو ویسے ہی نادانی میں اپنا گھر کھو بیٹھی۔

اب اور کیا کرنا ہے......؟ شکیلہ خاتون!" انہوں نے رعب سے پوچھا۔

"جو حکم...... بھائی صاحب!"

"جتنی جلدی ہو...... سبحان اور اریج کی شادی کروا دو۔"

"لیکن وہ طلاق یافتہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں...... شرعی طور پر دوسری شادی کرنا بری بات نہیں ہے۔ ویسے بھی تمہاری نادانی نے یہ دن دکھائے ہیں۔" شکیلہ چپ ہو گئی تھیں۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب گیم ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔

☆☆☆

گول گلی اور حویلی کے سارے مسئلے حل ہو چکے تھے۔ فضا کالج جا رہی تھی اور عمار اپنی ڈیوٹیز سرانجام دے رہا تھا۔ سب کی روٹین ویسے ہی تھی جیسی پہلے تھی۔ اب تو شمسہ اور فردوس نے ان دونوں کی شادی کروانے کی ٹینشن بھی لینی چھوڑ دی تھی۔

اسپتال کا نقشہ پاس ہو چکا تھا۔ اب کنسٹرکشن کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ جس کی تمام تر ذمے داری عاصم نے اٹھالی تھی۔ اس نے ہی عمار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دونوں بھائی مل کر رہیں اور عمار مان گیا تھا۔

اس دن جب سب حویلی میں جمع تھے۔ تو سب نے عمار کی کمی محسوس کی تھی۔ "عمار کراچی گیا ہوا ہے ایک دو دن میں آ جائے گا۔" سب کو مطمئن کرنے والی شمسہ خود کو اطمینان نہیں دلا سکی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ کراچی کیوں گیا ہے؟

شام پانچ بجے گول گلی میں ہنگامہ مچ گیا تھا عمار کے ساتھ کچھ گورے انگریز آئے ہیں۔

فضا نے چھت پر سے جھانکا تھا۔

عمار کے چہرے پر تھکاوٹ صاف ظاہر تھی۔ مگر وہ پھر بھی خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ بے چین ہوئی تھی۔ ان کے چاروں طرف مجمع اکٹھا تھا۔ وہ فوراً نیچے آئی تھی۔ فردوس بھی کھڑکی سے جھانک رہی تھیں۔

''امی! عمار بھائی اپنی بیگم لے آئے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' وہ اس کی طرف مڑیں۔

''ظاہری بات ہے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے شادی کر لی ہے اسی لیے۔'' وہ گڑبڑائی۔

''چلو حویلی چلتے ہیں......'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

شمسہ مہمانوں کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑی تھیں۔ پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے تھے۔ عمار نے گلے میں ہار ڈلوانے کے بجائے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اور شمسہ سے مہمانوں کا تعارف کروانے لگا۔

''یہ ہیں مسز کرسٹینا...... ان کے بچے کینڈل اینڈ جولیانہ...... اور یہ ہیں ان کے شوہر ڈاکٹر ہیگن ووڈ......''

مہمانوں کو ان کے کمروں کی طرف لے جایا گیا تھا تاکہ وہ فریش ہو جائیں۔

''عمار! میری بہو کہاں ہے......؟''

''امی! آپ کی بہو وہی ہوگی۔ جو آپ کو پسند ہوگی۔''

''اس کا مطلب!''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کوئی شادی نہیں کی ہے۔ میں صرف اور صرف اسپتال بنانے کی وجہ سے کسی اور مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔''

''تو پھر یہ لڑکی کرسٹینا...... کیوں آئی ہے پاکستان؟''

''یہ دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں اور مجھے ابروڈ میں ملے تھے۔ انہیں پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں اپنے ملک میں اسپتال بنانا چاہتا ہوں تو یہ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر وہ اس سلسلے میں میری مدد کرنا چاہیں گے تو میں منع نہ کروں۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان وزٹ کرنے آئے ہیں کہ آیا پاکستان میں کام کرنا ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔'' عمار نے انہیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں نہیں معلوم عمار کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔'' شمسہ نے اسے گلے لگایا تھا۔

لیکن کمرے میں داخل ہوتی فضا یہ سب سن کر بھی ناخوش تھی۔

☆☆☆

شمسہ نے سارہ کو کراچی سے بلوالیا تھا۔ شمائلہ، عاصم، سارہ اور فراز کے ہمراہ مٹھائیاں اور تحائف لے کر فردوس کے گھر گئی تھیں۔ فضا کو عمار کی دلہن بنانے کا ارمان لے کر...... لیکن فردوس نے یہ کہہ کر انہیں رخصت کر دیا تھا۔

''آپا! ابھی اس قصے کو رہنے دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب فضا اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ پھر اس کی شادی کے بارے میں سوچوں گی۔ خاندان بھر میں عجیب تماشا بن گیا ہے۔ میری بیٹی کا......'' پھر جب شمسہ نے زیادہ زور دیا تو فردوس چپکے سے بولی تھیں۔

''آپا! میری بیٹی کا دل دکھایا ہے عمار کی باتوں نے...... فضا نے خود رشتے سے انکار کیا ہے تو میں کیا کروں......؟''

شمسہ چپ چاپ سب کو لے کر لوٹ آئیں۔ انہیں بھی دکھ ہوا تھا کہ جنہیں وہ چاہتی ہیں وہ ہی ان کا امتحان لے رہے ہیں۔ کلینک سے فارغ ہونے کے بعد عمار اپنے لیے گڈ نیوز سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن باقی سب کہاں تھے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

شمسہ بی پی کی ٹیبلٹ کھا کر آرام کر رہی تھیں۔

بھائی اور بھابی اپنے کمرے میں تھے۔ سارہ اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ اسے مسلسل اگنور کرتے ہوئے...... جبکہ فراز نیوز چینل کی ایسے سرچنگ کر رہا تھا کہ اگر آج اس نے خبریں نہ سنیں تو کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

''یار! کوئی مجھے بتائے گا۔ آج کیا ہوا ہے......؟'' ابرو اوپر چڑھائے اور ان دونوں پر نظر جمائے وہ پوچھ رہا تھا۔

''پہلے اپنی شکل آئینے میں دیکھو۔ اور پھر پوچھو...... کہ کیا ہوا ہے......؟'' سارہ تنک کر بولی تھی۔

''فراز تم ہی بتا دو یار! تمہاری بیوی تو ہر وقت مرچیں چبائی رہتی ہے۔'' عمار خفا ہوا تھا۔

''سارہ درست فرما رہی ہے۔ فضا نے تمہارے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔'' فراز نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔

''مگر کیوں؟''

''تمہارے جھوٹ کی وجہ سے۔ مسلسل اپنی بات پر قائم رہنے کی وجہ سے۔ سبحان کا رشتہ اس کے ساتھ طے ہونے پر بھی چپ رہنا۔ تمہاری بہادری نہیں حماقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر پلس سرجن عمار صاحب۔'' فراز بھی اس سے خفا تھا۔

وہ صوفے پر سے اٹھ گیا تھا۔ دیر ہونے سے پہلے اسے فردوس مامی سے بات کرنا تھی۔ دروازہ مامی نے ہی کھولا تھا۔

''مامی! مجھے فضا سے بات کرنی ہے۔ جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالے وہ سنجیدگی سے گویا تھا۔

''اس وقت تو وہ سو رہی ہے...... پھر جب موقع ملے۔ تو بات کر لینا۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی تھیں۔ اور وہ لوٹ آیا تھا۔ چپ چاپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ فضا کے کمرے میں گئی تھیں۔

''فضا! عمار آیا تھا۔ مجھے شرمندہ لگ رہا ہے۔ اگر وہ تم سے بات کرے تو اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا، یہ مت بھولنا کہ شمسہ کے ہمارے اوپر بہت سے احسانات ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اور فضا اکیلی رہ گئی تھی۔ اپنی سوچوں کے ساتھ، دل و دماغ کے ساتھ جنگ کرتی ہوئی وہ سوچ چکی تھی۔

☆☆☆

رات کو موسم نارمل تھا۔ لیکن فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھنے والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ آج دن کا آغاز کچھ الگ ہوگا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کو انجوائے کرتے ہوئے عمار ناشتہ کر کے حویلی کے دروازے کے شیڈ کے نیچے کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ فضا بھی کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ اس نے عمار کو دیکھ لیا تھا۔ مگر اگنور کرتے ہوئے اپنے رکشے کے پاس جانے لگی۔

''فضا! رکو۔ آج کالج مت جانا۔ موسم مزید خراب ہوگا۔'' مگر وہ رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔

کرسٹینا بھی سہانا موسم دیکھ کر اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ عمار کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ وہ کل ہی شمالی علاقہ جات کی سیر کر کے لوٹے تھے۔

''عمار! کیا ہم باہر جا سکتے ہیں......؟'' انہوں نے برگد کے درخت والے چبوترے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''جی، کیوں نہیں؟'' عمار ہنسا تھا۔

موسم اچھا تھا۔ بچے بڑے سب جمع ہو رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد فضا واپس آ رہی تھی۔ منہ لٹکائے ہوئے۔ بارش بہت تیز ہو چکی تھی۔ فردوس نے اسے کال کر کے بلایا تھا۔ کیونکہ واپسی پر اسے پریشانی ہوئی۔

موسم کا اثر ارتج پر بھی ہوا تھا۔ وہ گرم گرم آلو کے پراٹھے بنا کر اپنے سسرال لے کر جا رہی تھی۔ مگر سبحان نے بھی ٹرے وہیں تھام لی تھی۔ اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے۔

آج فضا نے ان دونوں کو بھی اگنور کیا تھا۔

''فضا! رکو۔''

فضا کو دیکھ کر اریج اس کے پیچھے اندر چلی آئی تھی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے فضا!''

بیگ فردوس کو تھما کر وہ صحن میں ہی گیلا گاؤن اتارنے لگی تھی۔

''فضا! عمار بھائی بہت اچھے ہیں۔'' وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ سب نے میرا تماشا بنا دیا ہے۔ پھپھو نے، عمار بھائی نے سبحان بھائی، ماما یہاں تک کہ تمہیں بھی میرا تماشا بنانے کیلیے وہی دن ملا تھا۔''

اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اریج کو احساس ہوا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن اگر میں اس دن یہ تماشا نہ کرتی تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ جو آج ہے۔ چار افراد کی زندگیاں اور خوشیاں بچائی ہیں۔ میں نے۔''

''اور سبحان بھائی جو ہر وقت میرے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ وہ کیا تھا۔'' وہ تخی سے بولی۔

''مجھے بھی اسی لیے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب ڈرامہ عمار بھائی اور مجھے چڑانے کے لیے تھا۔ تا کہ عمار بھائی غصے میں آ کر اسے کچھ کہتے۔'' اریج نے وضاحت کی تھی۔

''مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ ان کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''ایسا نہیں ہے فضا! یقین کرو۔ منگنی والے ڈرامے میں سبحان نے فراز بھائی اور عمار بھائی کو اعتماد میں لیا تھا۔''

''مجھے تو تمہاری باتیں بھی ڈرامہ لگ رہی ہیں۔'' وہ اپنا سر تھامے بولی تھی۔

''چھوڑو نا ساری ٹینشن۔ آؤ چبوترے پر چلتے ہیں۔ بارش کا مزہ لینے۔'' اریج نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''نہیں مجھے نہیں جانا۔'' وہ کترائی۔

''چادر اوڑھ کر چلی جاؤ۔ تھوڑی دیر میں آ جانا۔'' فردوس نے اسے پیچھے سے کہا تھا۔

بلیک چادر اوڑھے وہ اریج کے ساتھ باہر آئی تھی۔ یہاں ایک نیا تماشا لگا ہوگا تھا۔

رحمٰن اپنی مرغی کے ساتھ ہاشم چچا کے نرغے میں تھا۔ اور بارش کے ساتھ اس کے ننھے گالوں پر تھپڑ بھی پڑ جاتے۔ اگر عمار اور سبحان بیچ میں نہ آتے۔

''چچا! کیا کر رہے ہیں؟ بچہ ہے۔'' عمار ہنسا۔

''بچہ ہے یا شیطان ہے۔ پورے ایک ہفتے سے مجھے انڈہ لا کر دے رہا ہے کہ اس کی مرغی نے انڈہ دیا ہے۔ اب بتا مجھے...... کہ مرغی انڈہ کیسے دے سکتی ہے؟ بس بہت ہو گیا آج میں اس کی مرغی کاٹ کر سوپ پیوں گا۔''

''بتا دے...... انڈے کہاں سے آئے؟ ورنہ میں......'' انہوں نے چپل اتاری۔

''انڈے میں نے دیے تھے۔'' بچوں کی فوج میں سے رحمٰن کی عمر کا ایک بچہ نکل کر بولا۔

اس کا گھر ہاشم چچا کے پیچھے تھا۔ اور چھت آپس میں ملی ہوئی تھیں کہ ایک دوسرے کی چھت پر آسانی سے جایا جا سکتا تھا۔ ''اس نے مجھے کہا! کہ میرے دادا میری مرغی کاٹ دیں گے۔ یہ انڈے بھی نہیں دے رہی ہے۔ اس لیے میں روز اسے اپنی مرغی کا ایک انڈہ دے رہا تھا۔'' وہ ڈر ڈر کر بول رہا تھا۔

''کیوں رے......؟ تو مجھے کہہ رہا تھا کہ مرغی انڈہ نہیں دے رہی۔'' اس کی دادی نے اس کے کان پکڑے۔

عمار نے رحمٰن اور اس کے دوست کے کان میں کچھ کہا تھا۔ جس پر ان دونوں نے سب سے معافی مانگی تھی۔

''چچا! اب تو اسے معاف کر دیں۔ میں ابھی آپ کو دیسی مرغا بھجواتا ہوں۔ اس کا سوپ بنوا لیجیے گا۔''

''یہ مجھے دو......'' عمار نے رحمٰن سے اس کی مرغی لی۔ اور توقیر کو تھما دی۔

"پڑھا کرو...... جب بڑے ہو جاؤ گے تو میں تمہیں خود مرغا، مرغی کے ڈربے کے ساتھ گفٹ کروں گا۔ پرامس۔"

"پرامس......" رحمٰن نے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

کرسٹینا اور ہیگن ووڈ بڑی دلچسپی سے سارے معاملات دیکھ رہے تھے پھر عمار انہیں تفصیل بتانے لگا۔ جس پر وہ بھی ہنسنے لگے۔

"تم نے مجھے سب سے ملوایا۔ سوائے اپنی فیانسی کے۔" کرسٹینا نے شکایت کی۔ فضا۔ اریج کے ساتھ ہی تھوڑے فاصلے پر تھی۔

"فضا!" عمار نے اسے بلند آواز پکارا تھا۔

بارش اور بچوں کے شور میں کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"جاؤ!" اریج نے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔ "ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔" وہ جھجکتی ہوئی آئی تھی۔

"فضا! یہ ہیں ڈاکٹر کرسٹینا...... ان کے خاوند ڈاکٹر ہیون ووڈ...... اور یہ ان کے بچے ہیں۔ پاکستان وزٹ پر آئی ہیں۔ یہ ہی مجھ سے اس دن کال پر پوچھ رہی تھیں کہ اگر وہ یہاں پاکستان میں رہنا چاہیں تو ان کے بچوں کی ایجوکیشن میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی۔"

عمار نے اسے وضاحت دی تھی۔ جس پر اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"اور یہ فضا ہیں میری کزن...... ایم بی بی ایس کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ میری فیانسی بھی ہیں۔" عمار نے بڑے اعتماد سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ جس پر فضا نے اسے غصے اور حیرت سے دیکھا تھا۔

"نائس ٹو میٹ یو فضا! تم دونوں کی جوڑی شاندار ہوگی۔" کرسٹینا خوش تھی۔

"عمار بھائی! امی ناشتے کے لیے مہمانوں کو بلا رہی ہیں۔" توقیر آیا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم انہیں لے جاؤ، میں آرہا ہوں۔"

بارش تیز ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں برگد کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔

"اب بھی ناراض ہو مجھ سے......" وہ فضا سے پوچھ رہا تھا۔ فضا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری آواز کہاں گئی؟ بات بات پر سر ہلا رہی ہو۔" عمار کو حیرت ہوئی تھی۔

"الحمدللہ! میری آواز ٹھیک ہے۔" وہ کھنکھاری تھی۔

"کسی بھی رشتے میں مضبوطی کے لیے اعتماد ضروری ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آنے والی زندگی میں تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گی اور ایک عقل مند بیوی ہونے کا ثبوت دو گی۔ عمار بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"عقل مند تو میں ہوں۔" اس نے شانے اچکائے تھے۔

"دیکھ لیں گے......" وہ جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالے کھلے آسمان کے اوپر چہرہ کرکے بارش کے قطرے جذب کرنے لگا۔

"ایک بات بتائیں......" وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"کیا......؟"

"یہ رحمٰن کی مرغی انڈہ کیوں نہیں دے رہی تھی؟" عمار نے اس کی بات پر سر تا پیر جائزہ لیا تھا۔

"کیونکہ وہ مرغی نہیں مرغا تھا۔" اور فضا کا سفید رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ پیچھے سے سبحان اور اریج ہنس رہے تھے۔ فضا بھی شرمندگی سے ہنسنے لگی۔ جبکہ عمار، فضا کو اپنے ساتھ پا کر خوش تھا۔

گول گلی کے ہر گھر میں خوشی اور شادمانی پھیلی ہوئی تھی۔ دائرے میں پھیلی اس چار سو محبت نے عمار اور فضا کے ساتھ سبحان اور اریج کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

برگد کے درخت کی پھوٹی ہوئی نئی شاخیں بہار کی آمد کی خبر دے رہی تھیں۔ اور ساتھ میں محبت کرنے والوں کو سایہ بھی۔

ایک گلاس کی پیاس

خولہ سعید جاوید

گرمیوں کی حبس بھری دوپہر میں لیٹی عائزہ دس پندرہ منٹ تو برابر والا گیٹ دھڑا دھڑ بجتا سنتی رہی۔ آنے والا بھی کوئی مستقل مزاج ہی تھا، پھر جبراً اٹھی برابر والے گھر میں کرائے دار تھے۔ جو چند دن پہلے گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ گیٹ پر بیس بائیس سالہ گردش حالات کی ماری لڑکی نما عورت تھی۔ گود میں چھوٹا سا بچہ تھا۔ گرمی سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ بے قراری سے عائزہ کی طرف لپکی۔

"یہ آمنہ باجی کہاں گئی ہیں؟"

"وہ تو ٹرانسفر ہو کر کہیں دوسرے شہر چلی گئی ہیں۔"

اوہ!" آنے والی رو دینے کے قریب تھی۔

عائزہ طبعاً ہمدرد دل کی تھی۔ اندر آنے کا اشارہ کیا۔ بلا کر ٹھنڈا پانی پلایا۔ کھانا کھلایا پھر چائے پلائی۔ یہ عائزہ اور فوزیہ کی پہلی ملاقات تھی۔

☆☆☆

فوزیہ شہر سے کچھ فاصلے پر موجود گاؤں سے آتی تھی، جن کے قبیلے کو مقامی زبان میں جانگلی کہا جاتا تھا۔ وہ نہ تو پیشہ ور بھکاری تھی اور نہ ہی مستقل کام کرنے والی تھی۔ شوہر کام تو کرتا تھا لیکن کبھی ملا کبھی نہیں...... تو ایسے میں فوزیہ جان پہچان کے گھروں میں آ کر دن بھر محنت کر کے معاوضہ لے جاتی۔ عائزہ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس سے باہر کی صفائی کروائی۔ کھڑکیاں صاف کروائیں اور کچھ معاوضہ، کچھ صدقہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر یہ سلسلہ مستقل ہو گیا۔ ہر پندرہ بیس دنوں کے بعد فوزیہ آنے لگی۔ دونوں طرف سے اعتبار قائم ہوتا گیا۔

فوزیہ کے گھر ہر کچھ عرصے بعد ایک نئی زندگی آتی۔ بیٹی کی آمد پر خوشیاں منائی جاتیں۔ بقول فوزیہ "لڑکی کی شکل میں پیسہ آتا ہے۔ نوعمری میں ہی پیسے کے عوض شادی کر دی جاتی ہے پانچ سال کے عرصے میں تین بچے تو عائزہ نے ہی دیکھ لیے تھے۔ ہر بچے کی پیدائش کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد ہی فوزیہ کام کی تلاش میں آ جاتی۔

اس دفعہ خلاف معمول آمد چار ماہ بعد ہوئی۔ گود میں چھوٹا سا بچہ اور فوزیہ کی حالت ایسی کہ عائزہ ڈر گئی۔

"فوزیہ! خیریت ہے؟" یہ پوچھنے کی دیر تھی کہ فوزیہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

"باجی! پہلا بچہ ابھی ہاتھوں میں آنے کے قابل ہوا نہیں کہ دوسرا تیار۔ میں کیا کروں۔ ایسی زندگی سے تو موت اچھی۔ پہلے بچوں کا کھانا پورا ہوتا نہیں۔ میں کروں تو کیا کروں۔" عائزہ کے دل پر ہاتھ پڑا۔

"بے نیازی ہے اس ذات کی، میں ایک بچے کے لیے تڑپ رہی ہوں اور یہ اوپر تلے آنے والے بچوں کے کھانے کی فکر میں تڑپ رہی ہے۔ دونوں عورتیں رو رہی تھیں۔ غم جدا جدا تھے لیکن دونوں کے دل اولاد کے لیے دکھی تھے۔ فوزیہ کی حالت کام کے

قابل نہیں تھی۔ اس کو کھلا پلا کر اور دے دلا کر رخصت کیا۔ آئندہ آنے والے کئی دن عائزہ کے دل کا درد آنکھوں سے بہتا رہا۔

☆☆☆

شادی کو بارہ سال ہو چکے تھے۔ شروع کے چند سالوں میں ہی پتا چل گیا تھا کہ کمی عائزہ میں نہیں بلکہ اویس میں تھی۔ عائزہ کی مجبوری میکے میں سارا کنٹرول بھابھیوں کے ہاتھ میں تھا۔ سو اپنے ہی شوہر کے گھر کو آباد رکھا۔ اویس رشتہ داروں کا بچہ لینے کے حق میں نہیں تھا کہ خون اصل کی طرف ہی جاتا ہے اور یتیم خانے سے بچہ لینے پر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔

عائزہ کئی سالوں کی بحث و تمحیص کے بعد جان چکی تھی کہ اس کی گود میں کبھی کوئی بچہ نہیں آئے گا۔ کئی دن بعد جب فوزیہ آئی تو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''باجی! میرا آنے والا بچہ آپ لے لو۔'' عائزہ سناٹے میں آ گئی۔ چند منٹ تو بولا ہی نہیں گیا۔

''کیوں...... کوئی اپنی اولاد بھی کسی کو دیتا ہے؟''

''باجی! آپ کے پاس رہ کر بھوک سے تو نہیں مرے گا۔ میرے گھر میں نوالے نوالے پر بچے لڑتے ہیں۔ پڑھے گا، لکھے گا...... آپ کی زندگی کا سہارا بنے گا۔ آپ کی مراد پوری ہوگی۔ میری مشکل آسان ہوگی۔ میری عادات آپ کے سامنے ہیں۔ غربت کے علاوہ کوئی دوسری خرابی ہو تو بتائیں۔'' عائزہ حیران پریشان فوزیہ کو دیکھ رہی تھی۔

''باجی! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ ایک بچہ ہی میرا بھوک کی مار سے بچ جائے۔ پکے کاغذ پر لکھوا لیں، میں کبھی بھی ملنے نہیں آؤں گی۔ میں اکیلی ہی چھوٹے بچے کے ساتھ آپ کے گھر آتی ہوں، کسی کو آپ کے گھر کا پتا نہیں۔ پھر میری حالت دیکھیں، میں بچوں نہ بچوں۔''

عائزہ کا دل اس کی بے بسی پر کٹ رہا تھا۔ بھوک، غربت، مجبوری...... ممتا کو کس مقام تک لے آئی تھی۔ دونوں عورتیں پھر رو رہی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ اس دفعہ اندر بیٹھا مرد بھی رو رہا تھا۔ سب کچھ تھا لیکن اولاد نہیں تھی اور باہر بیٹھی عورت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن اولاد کثرت سے تھی۔

فوزیہ روتی دھوتی رخصت ہوئی اور عائزہ کی نیند، سکون اور بھوک پیاس ساتھ ہی لے گئی۔ عائزہ کو سوتے جاگتے ایک ننھا وجود اپنے آس پاس محسوس ہونے لگا۔ روٹی پکانے کھڑی ہوتی تو بے اختیار ہی ایک چھوٹی روٹی پکا کر گھی میں مسل کر نرم کر لیتی پھر اسے سامنے رکھ کر آنکھوں کو کھلی چھٹی دے دیتی کہ جتنا برسنا چاہو برس لو۔ رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی

''میرا بچہ...... میرا بچہ......'' اپنے برابر بستر پر ہاتھ مارتی۔ پھر پوری رات جائے نماز بچھا کر اللہ سے ایک بچہ مانگے جاتی۔

اویس — اپنی تنہائی اور مجبوری سے تو لڑ سکتا تھا لیکن بیوی کی ذہنی ابتری نے اس سے وہ فیصلہ کروا لیا جو عام حالات میں وہ کبھی نہ کرتا۔ آخر فوزیہ سے پکے کاغذوں پر انگوٹھے لگوا کر بچے سے مکمل دست برداری کا حلف نامہ لیا گیا۔ اویس نے ایک بڑی رقم فوزیہ کو آفر کی۔ فوزیہ کرنٹ کھا کر اٹھی۔

''نہ صاحب...... میرے بچے کا مول لگا کر ماں کو تو بے قیمت نہ کرو۔ یہ کوئی چیز ہے، جس کا سودا ہو۔ میرا ایک بچہ پیٹ بھر کر کھائے گا۔ اچھے کپڑے پہن کر جھگی کے فرش پر سونے کے بجائے گرم اور ٹھنڈے کمرے میں بستر پر نرم گدے پر سوئے...... بس میری یہی خواہش ہے۔''

☆☆☆

اب فوزیہ سے زیادہ عائزہ کو بچے کا انتظار تھا۔ آخری مہینے بعد فوزیہ پندرہ دن کا گول مٹول بچہ لیے آ گئی۔ بچہ عائزہ کی گود میں ڈال دیا۔

''باجی! بیٹا مبارک ہو۔ آج کے بعد فوزیہ آپ کے گھر نہیں آئے گی۔''

عائزہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ دھند کے پار جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو گلابی فرشتوں سا چہرہ، لال ہونٹ، مندی مندی آنکھیں، چھوٹی چھوٹی

بند مٹھیاں...... ناممکن کو آج فوزیہ ممکن بنا گئی تھی۔
شکریہ کے الفاظ پاس نہ تھے۔ کچھ کہنے کا یارا نہ تھا۔ بچے سے نظریں ہٹا کر دیکھا تو فوزیہ غائب۔ آج اس نے بچے کے عوض چائے اور کھانا بھی نہ وصول کیا۔ عائزہ کو یقین تھا لیکن اویس بے یقین تھا۔ کئی مہینے وہ دل ہی دل میں ڈرتا رہا کہ فوزیہ آئے گی اور بچہ لے کر چلی جائے گی۔
رشتے دار سارے آس پاس ہی تھے۔ کسی نے خوشی کا اظہار کیا۔ کسی نے باتیں بنائیں پھر یہ باتیں بھی پرانی ہو گئیں۔ انعام آہستہ آہستہ تعلیمی مدارج طے کرتا ہوا نویں جماعت میں آ گیا۔
ماں باپ کی جان تھی اس میں۔ اویس کالج سے ریٹائر ہو کر اکیڈمی جوائن کر چکا تھا۔ فوزیہ کے آنے کا جو دھڑکا لگا ہوا تھا، چند سال بعد وہ بھی ختم ہوا۔ انعام بہت ذہین، اچھی عادات کا ہمدرد دل بچہ ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دن ویسی ہی حبس بھری گرمیوں کی دوپہر تھی۔ گیٹ بجنے پر انعام نے دروازہ کھولا۔ کچھ کھڑ پٹر کے بعد اندر آیا۔ فوزیہ نے پوچھا۔
''کون تھا؟''
''پتا نہیں امی! کوئی عورت تھی۔ مانگنے والی تو نہیں، بس ایک گلاس پانی مانگا۔ میں نے دیا تو میرا ماتھا چوما اور دعائیں دے کر چلی گئی۔'' انعام نے اطمینان سے بتایا۔
''بیٹا! احتیاط کیا کرو۔ یوں ہی بہانے سے گھر میں داخل ہو کر صفایا کر جاتی ہیں ایسی عورتیں۔'' عائزہ نے نصیحت کی۔
''نہیں امی! وہ ایسی عورت نہیں تھی۔'' انعام کے لہجے میں یقین تھا۔
دو مہینے بعد پھر یہی ہوا۔ انعام نے پانی پلایا، عورت نے ماتھا چوما، دعائیں دیں اور چلی گئی۔ عائزہ کھٹک گئی۔ وہ اعتبار قائم کر کے گھر میں داخلے کی کوشش کر رہی تھی۔ انعام کو ٹوکا تو وہ ڈٹ گیا۔

''امی! آپ ان سے ملیں، ان میں کچھ ہے جو آپ کو ان کی طرف کھینچتا ہے۔''
''خیر ہو۔'' ہپناٹائز کر کے گھر لوٹنے کے کئی قصے دماغ میں چکرانے لگے۔ ''اچھا، آئندہ آئے تو بتانا، میں بھی دیکھتی ہوں۔'' عائزہ حقیقتاً پریشان ہو گئی۔
آئندہ پھر ایک ماہ بعد یہی ہوا۔ انعام نے پانی کا گلاس بھر کر دینے سے پہلے عائزہ کو بتایا۔ وہ بھی گیٹ پر پہنچی اور پھر ہپناٹائز ہو گئی۔ عورت پانی پی کر، ماتھا چوم کر، دعائیں دے کر کب رخصت ہوئی اس کو کچھ خبر نہ ہوئی۔
''امی! دیکھیں۔ ہے ناں اس میں کچھ خاص۔''
انعام اپنے اندازے کی درستی پر چہکا۔ عائزہ ہوش میں آئی۔
''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔''

☆☆☆

''اویس! ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔ فوزیہ چند مہینوں میں تین دفعہ آ چکی ہے۔ آپ بالکل صحیح کہتے تھے، خون اپنے اصل کی طرف کھنچتا ہے۔''
اس رات فوزیہ اویس کی نیند اڑا گئی۔ اویس نے بہت سوچ سمجھ کر پرانے کولیگز سے رابطہ کیا۔
پشاور اکیڈمی میں اپنی جاب پکی کروائی۔ دنوں میں گھر بند کیا۔ سامان پیک اور بک کروایا۔ سارے بہن بھائی یہیں تھے، ان سے درخواست کی کہ گھر کو دیکھتے رہیں۔
انعام اس عورت سے بہت متاثر ہوا تھا جو پانی پی کر ماتھا چوم کر دعائیں دیتی تھی اور بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتی تھی۔ انعام اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔
آخر کار گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کوچ کرنے کا وقت آ گیا۔ انعام کو بڑی سختی سے منع کیا کہ کسی ہمسائے کو نہیں بتانا کہ کہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔ وجہ یہ بتائی کہ اگر سیٹ ہو گئے تو فون پر سب کو بتا دینا، نہ سیٹ ہونے کی صورت میں ہم واپس آ جائیں گے تو بتاتے ہوئے شرمندگی نہ ہو گی۔

انعام بہت معصوم اور تابع دار سا بچہ تھا۔ ماں باپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتا اور وہی کرتا جو وہ کہتے۔

"امی! وہ آنٹی کو تو بتادوں ناں جو پانی پینے آتی ہیں۔" کیا معصومیت تھی انعام کے لہجے میں۔

"نہیں میری جان۔ کسی کو بھی نہیں۔"

گھر چھوڑنے تک عائزہ کے دل کو دھڑکا ہی لگا رہا۔ خواب میں نظر آتا کہ کوئی انعام کو اس سے زبردستی چھین رہا ہے۔ کبھی انعام اس سے ہاتھ چھڑا کر آسمانوں کی طرف اڑتا دکھائی دیتا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سامان جاچکا تھا۔ اویس، عائزہ اور انعام گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جب فوزیہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ انعام اچھل کر گاڑی سے نکلا۔

"آنٹی! میں نے اللہ سے آپ کے آنے کی بہت دعا کی تھی۔ میں آپ کا بہت انتظار کررہا تھا۔"

"کہیں جارہے ہو کیا؟" فوزیہ کے ہونٹ ہلے۔

"جی، ہم اس شہر سے بہت دور جارہے ہیں۔"

فوزیہ کا چہرہ ایک دم تاریک ہوا۔

اس نے بڑھ کر انعام کا ماتھا چوما۔ انعام گم صم سا کھڑا تھا۔ وہ گھوم کر عائزہ کی طرف آئی۔

"باجی! میں صرف ایک گلاس پانی ہی تو مانگتی تھی جو میری پیاس بجھادیتا تھا۔ یہ آپ نے کیا کیا؟" فوزیہ کی آنکھوں میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر بھری آنکھوں کے ساتھ انعام کا ماتھا چوما۔

"جاؤ اللہ کے سپرد۔"

اویس اور عائزہ کا سانس رکا ہوا تھا۔

انعام نے جواباً اس کے ہاتھ چومے، اس کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔ گاڑی چلی تو میاں بیوی کا رکا ہوا سانس بھی چلا۔

☆☆☆

پشاور آ کر کئی دنوں تک فوزیہ کا چہرہ اور جملہ عائزہ کو تنگ کرتا رہا۔ پھر وہ ہر دفعہ خود کو تسلی دیتی، اس کے پاس تو کئی بچے ہیں اور ہمارے پاس تو صرف ایک۔ اس نے بھی تو وعدہ خلافی کی۔ لکھ کر دیا کہ کبھی نہیں آئے گی پھر بار بار آجاتی۔

ضمیر کی آواز آتی۔ "تم لے پالک سے اتنا پیار کرتی ہو، وہ تو پھر ماں تھی۔"

ایک دو مہینوں میں عائزہ نے ضمیر کو مکمل سلادیا۔

آرمی پبلک اسکول میں انعام کا ایڈمیشن ہوگیا تھا۔ انعام ہر فن مولا بچہ تھا۔ پچھلے اسکول کی طرح پڑھائی یا کھیل کے میدان میں اس کے مدمقابل کوئی نہ تھا۔ چند مہینوں میں ہی وہ صلاحیتوں کے باعث اسکول کا ہر دل عزیز بچہ بن چکا تھا۔

اویس اور عائزہ قابل رشک والدین تھے۔ ٹیچر ہر ملاقات پر ان کی تربیت کے گن گاتے۔

16 دسمبر کی صبح کڑاکے کی سردی تھی۔ اگر انعام کا پیپر نہ ہوتا، عائزہ شاید اس کو چھٹی کرنے کو ہی کہہ دیتی۔

"امی! آپ آج بہت شان دار سا ناشتا بنائیں۔" انعام کی فرمائش آئی۔

"کیوں؟" امی بے چاری پہلے ہی گرم بستر سے نکل کر ٹھٹھر رہی تھیں۔

"اس لیے کہ آج میرا پیپر ہے اور آپ کہتی ہیں، پیپر والے دن بہت اطمینان سے پیٹ بھر کر ناشتا کرنا چاہیے۔ اور ہاں، واپسی پر میرا فیورٹ گاجر کا حلوہ گرم گرم تیار ہو۔" انعام کے لہجے میں مان تھا۔

عائزہ نے بڑے دل سے بہترین ناشتا تیار کیا۔

تینوں نے مل کر ناشتا کیا۔ اویس نے گاڑی نکالی۔ عائزہ نے حسب عادت ماتھا چوم کر دین و دنیا کی بھلائی کی دعا دی۔

"اویس! آتے ہوئے گاجریں ضرور لانا۔" بیٹے کی فرمائش ہو اور عائزہ پوری نہ کرے ناممکن تھا۔

"دکانیں تو کھلنے دو، دس بجے جاؤں گا۔" اویس نے جواباً کہا۔ گیٹ بند کرتے ہوئے انعام نے ہاتھ ہلایا۔

''امی! دعا کرنا تو نہیں بھولیں گی نا۔'' انعام نے یقین دہانی کروائی۔

اویس تو آتے ہی سو گئے۔ عائزہ نے فٹافٹ کام سمیٹے۔ دس بجے کے بعد اویس اٹھ کر گاجریں اور کھویا لینے چلے گئے۔ آج معمول سے کچھ ہٹ کر تھا۔ عائزہ کی نظروں کے سامنے بار بار انعام کا چہرہ آ رہا تھا۔ مسکراتا چہرہ ہاتھ ہلاتے ہوئے۔

''امی! دعا کرنا تو نہیں بھولیں گی نا۔'' عائزہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی۔

''نہیں بھولوں گی میری جان۔''

اویس کو آنے میں دیر ہو گئی۔ عائزہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

''انعام نے جلدی آنا ہے اور اس کے آنے سے پہلے حلوہ بھی تیار کرنا ہے۔ حد ہو گئی اویس کی لاپروائی کی۔''

اسی دم گاڑی کا ہارن بجا۔ عائزہ باہر نکلی۔ اویس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

''جلدی بیٹھو۔'' اویس نے فرنٹ ڈور کھولا۔

''کدھر...... ٹھہریں، میں گھر لاک کر آؤں۔''

''جلدی بیٹھو۔'' اویس نے سختی سے کہا۔ عائزہ کو یوں ہی بیٹھتے بنی۔

گاڑی جانے پہچانے راستوں پر رواں دواں تھی۔

''انعام کے اسکول لیکن کیوں؟'' عائزہ نے الجھ کر اویس کو دیکھا لیکن وہاں کچھ ایسا تھا کہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسکول سے ابھی کچھ فاصلہ تھا کہ سیکیورٹی نے گاڑی رکوائی۔ دونوں پیدل اسکول کی جانب چلے۔ عائزہ کا دل بند ہونے لگا۔ اندر سے مسلسل فائرنگ، دھماکے، انسانی چیخوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ بارود اور خون کی ملی جلی باس آ رہی تھی۔ کچھ اور بھی تھا عائزہ نے دل پر ہاتھ رکھا۔ ہاں ماؤں کے دل کٹنے کی آوازیں سب سے نمایاں تھیں۔

اویس اور عائزہ جیسے بہت سے والدین تھے، جن کے دل اسکول کی عمارت کے اندر کٹے پڑے تھے اور وجود اپنے آپ سے بے حال اور بے خبر تھے۔ دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم اور قدم اٹھنے سے قاصر۔ ہر ماں کے دل میں ایک آلہ نصب ہوتا ہے۔ جس کی ٹریکنگ چپ بچے کے ساتھ اس کے وجود میں لگی ہوتی ہے۔ ہر بے حال ماں کا آلہ بتا رہا تھا کہ چپ خاموش اور لاپتا ہو چکی ہے۔

''میرا انعام......'' عائزہ اویس کی بانہوں میں جھول کر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ ہوش میں آنے پر وہ بھاگ بھاگ کر گیٹ تک جانے کی کوشش کرتی۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ قیامت صغریٰ اندر باہر بپا ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اپنے ہی کٹے پھٹے وجود کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کسے کہتے ہیں، یہ اس دن اویس اور عائزہ نے ہاسپٹل جا کر جانا۔ انعام کا چہرہ شہید کا مسکراتا چہرہ تھا اور بدن خون کی ندی...... نہ جانے کتنی گولیاں لگی تھیں۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھا۔ چہرے پر عائزہ کو بس ایک ہی تحریر نظر آ رہی تھی۔

''امی! میرے لیے دعا کرنا تو نہیں بھولیں گی نا۔''

دوسری ٹریکنگ چپ فوزیہ کے ساتھ منسلک تھی۔

17 دسمبر کو انعام کے آبائی شہر میں دو مائیں ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک ہی بیٹے کو رو رہی تھیں۔

اتنے سالوں میں اویس اور عائزہ کے اندر مزید جینے کی کوئی تمنا نہیں رہی۔ رب کے حکم سے معمولات زندگی چل رہے تھے۔ عائزہ زیادہ تر وقت قرآن پاک پڑھنے میں گزار دیتی ہے یا پھر یہ سوچنے میں کہ فوزیہ تو چاہِ زمزم اپنے ہاتھوں سے اس کے سپرد کر گئی تھی پھر وہ اتنی کم ظرف کیوں بنی کہ ایک گلاس پانی جتنی پیاس بھی اس کنویں سے فوزیہ کی نہ بجھا سکی۔

☆

میمونہ صدف

رومیو جولیٹ

رافیل نے سوں سوں کرتے کسی کو تیزی سے اندھیرے میں جاتے ہوئے اور دور گھر کے پچھلے حصے میں جہاں لائٹ کا مناسب انتظام نہیں تھا، میں گم ہوتے دیکھا۔ خود وہ تھوڑے فاصلے پہ کھڑا ستارے دیکھ رہا تھا۔

گھر کے باہر مہندی کا فنکشن شروع ہو چکا تھا۔ ابا خود بھی اسے بلانے آ چکے تھے اور پیغام بھی بھجوا چکے تھے۔ لیکن وہ تیار ہو چکنے کے باوجود باہر جانے پہ آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں

ناولٹ

جانے سے اسے نہ دلچسپی تھی نہ ہی شوق۔ انسانی فطرت کے جو پہلو اس پہ بچپن میں آشکار ہو چکے تھے اسے سبق کی طرح ازبر تھے۔ اسے نئے سبق لینے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

کسی کو ایسے سوں سوں کرتے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھا تو اسے لگا تاریخ دہرائی جا رہی ہے کیونکہ ایک بار اپنے امیر کزنوں کے ہاتھوں مذاق کا نشانہ بننے کے بعد وہ بھی ایسے ہی کوٹھی کے پیچھے جا کر رونے لگا تھا۔ اس کی نظریں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ایک لمبا دوپٹہ اسے زمین پہ گرا ہوا نظر آیا۔

''اوہ۔'' اس نے آگے بڑھ کر وہ دوپٹا اٹھا لیا جو عین بیچ سے جلا ہوا تھا۔ آگے اندھیرا تھا جہاں وہ جانے لگا تھا۔ گھر کی روشنیوں نے اندھیرے کو اندھیرا رہنے تو نہیں دیا تھا لیکن اتنا اندھیرا ضرور میسر تھا کہ چھپا جا سکے۔ وہ اس کی پشت کو گھورنے لگا۔

''میں یہ دوپٹہ لایا تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً یہ آپ کا ہے۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا اور اس نے پلٹے بنا صرف ہاتھ پیچھے کی جانب کر کے دوپٹہ لے کر اپنے گلے میں عجلت میں ڈال لیا۔ البتہ بدستور وہ رو رہی تھی۔

''میرا نام رافیل ہے۔ میں یہاں مہمان ہوں۔ پہلی بار آیا ہوں یہاں۔ اگر میں یہاں کے لوگوں کو جانتا ہوتا تو آپ کو بھی جانتا۔ پھر آپ سے وجہ پوچھتا کہ یہاں اندھیرے میں اکیلے کھڑے

ہو کر آپ کیوں رو رہی ہیں۔"

"میں عمار سے محبت کرتی ہوں اور وہی سب سے زیادہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتا کیونکہ شاید میں دوسرے کزنز کی طرح امیر نہیں ہوں۔"

رافیل کو ایسے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی۔ اس لیے جی بھر کر حیران ہوا تھا۔ اس لڑکی کی عمر ہی کیا تھی جو وہ ایسی باتیں کرتی۔ پھر فوراً سے کہہ بھی ڈالا جبکہ وہ تو اسے جانتی تک نہ تھی، پہلے کبھی ملی بھی نہ تھی۔ وہ اصل وجہ ٹال کر کوئی اور وجہ بتا سکتی تھی۔ کوئی بھی بہانہ بنا سکتی تھی۔ یقیناً وہ جرات مند تھی یا پھر حد سے زیادہ معصوم۔

"محبت۔" وہ بڑبڑایا۔ "تم کافی چھوٹی نہیں ہو محبت کے لیے۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"کیا میری عمر دیکھ کر محبت مجھ پہ رحم کھا لے گی؟" وہ پنکی اور کاجل پھیلی آنکھوں سے اسے گھورا۔

اس کی عمر کتنی بھی تھی لیکن وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی۔ وہ اسکول کی طالبہ لگتی تھی۔ اگر بہت بڑی کلاس میں بھی ہوتی تو بھی نائنتھ کلاس میں ہی ہو سکتی تھی۔ کالج میں تو ہرگز نہیں۔ ویسے محبت کے لیے جو اس نے بات کی تھی وہ کافی حساس لگتی تھی۔ یعنی لڑکی جذباتی تھی اور محبت کو سمجھتی تھی۔

"کیا کیا ہے عمار نے؟" محبت کو چھوڑ کر اسے یہ پوچھنا پڑا۔

شاید اس سوال سے اسے پھر سے عمار کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ اسی لیے وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ روتے روتے نیچے بیٹھ گئی۔ اپنے لہنگے اور دوپٹے کی پروا کیے بنا۔ رافیل نے خود کو بہت آکورڈ محسوس کیا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھے اور کہے "بیٹا سب ٹھیک ہو جائے گا، عمار شمار کی ٹینشن نہ لو اور اپنی پڑھائی پہ دھیان دو۔" لیکن پھر اس چھوٹی عمر کی بڑی باتیں کرنے والی اماں بی بی کو وہ یہ کہنے سے باز رہا۔ محبت کرنے کے معاملے میں وہ 'بڑی' تھی، کم از کم اس سے۔ لیکن رو وہ بالکل بچوں کی طرح رہی تھی۔

رافیل کو اس کے پاس نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھنا پڑا۔ اس نے مہندی کے لیے سوٹ پہنا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اس کے کپڑوں کو مٹی لگ جائے گی۔ واپسی پہ پھر امی ناراض ہوں گی۔

"ایسے رونا ٹھیک نہیں۔ تمہاری امی تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں گی۔"

اس نے غصے سے، جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"میری امی مر چکی ہیں۔" اس کی بات سن کر رافیل نے خود کو بے بس پایا۔ اسی لیے یہ چھوٹی بی بی اتنی حساس ہو رہی تھیں۔

"افسوس ہوا جان کر۔ تمہارے ابو، بہن بھائی، تمہیں فنکشن میں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ مہندی کا فنکشن شروع ہو چکا ہے۔ سب تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔"

"فنکشن۔" اسے پھر سے اپنا دکھ یاد آ گیا تھا۔ رافیل کو لگا کہ اگر وہ الف ب پ بھی کہہ دے گا تو بھی وہ یوں ہی رونے لگے گی۔ لڑکیوں کو یہ کام کافی مہارت سے آتا ہے۔ نہ صرف پھوٹ پھوٹ کر رونا بلکہ بات بے بات رونا۔

"ایسے جاؤں گی میں فنکشن میں؟" اس نے اپنی پیشانی کے اوپر ہاتھ سے اشارہ کیا تو رافیل نے دیکھا اس کی پیشانی پہ عین آنکھوں کے درمیان مخصوص دائرے سے خون رس رہا تھا۔

"یہ کیا تم تو زخمی ہو۔ تم نے بینڈ ایج کیوں نہیں لگائی؟"

وہ پھر سے سسکنے لگی۔ "سب لڑکیاں بندیاں لگا رہی تھیں، میں نے بھی لگائی لیکن انھوں نے مجھے بندی کے نیچے ایلفی لگا کر دی اور پھر یہ۔"

"خدایا کون ہے وہ ظالم۔"

"عمار!" روہانسی ہو کر وہ بولی تو رافیل نے سر تھام لیا۔ محبوب میں بھی عمار کا نام آ رہا تھا اور ظالموں میں بھی۔

"تم نے کسی کو بتایا نہیں، ایسی شرارت پہ تمہیں

اسے سزا دلوانی چاہیے تھی۔"

"اس نے اکیلے یہ نہیں کیا، ان فیکٹ فریحہ، دانیہ اور شہروز مل کر کرواتے ہیں اس سے یہ سب۔" اب وہ عمار کا دفاع کر رہی تھی۔

"یعنی عمار بہت اچھا ہے۔" رافیل نے طنزیہ پوچھا۔

"ہاں، وہ بہت اچھا ہے لیکن وہ ان سب کے ساتھ مل جاتا ہے۔ وہ بہت معصوم ہے وہ ان سب کی باتوں میں آ جاتا ہے۔ یہ دیکھو میرا دوپٹہ۔ انھوں نے اسے بھی جلا دیا۔ میرے لہنگے پہ انک گرا دی۔ میں کیسے جاؤں اب فنکشن اٹینڈ کرنے؟"

"تم کسی بڑے کو کیوں یہ سب نہیں بتاتیں؟ اپنے فادر کو یا انکل کو۔"

"جو میرے انکل ہیں وہ ان کے فادر ہیں اور جو میرے فادر ہیں وہ ان کے انکل ہیں، جو ہمیشہ مجھے خاموش رہنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں بات کو زیادہ نہ بڑھاؤں۔ وہ مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔" اپنا لہنگا سمیٹتی وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ رافیل اسے دیکھتا رہ گیا۔

کچھ بھی تھا، وہ لڑکی کے غم کو سمجھ سکتا تھا۔ بچپنا ہی سہی لیکن وہ رو رہی تھی اور اس کی تکلیف اس کے آنسوؤں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کہاں تو سارے گھر کی لڑکیاں فنکشن انجوائے کر رہی تھیں اور وہ اکیلی یوں ویرانے میں رو رہی تھی۔ رافیل کو افسوس ہوا ان لوگوں پر جو اسے یوں تنگ کرتے تھے۔ وہ ایسے تنگ کرنے والوں کی ذہنی سطح سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا۔ ایسے لوگ اسے بھی اس کے بچپن میں مل چکے تھے۔ پھر اس نے انہیں زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ کاش کہ وہ لڑکی بھی سیکھ سکتی کہ ایسے لوگوں کو زندگی سے نکال کر پھینک دینا چاہیے۔

☆☆☆

رافیل کو مہندی کا فنکشن اٹینڈ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن 'وہ کیسی ہے اب' دیکھنے کے لیے وہ باہر آ گیا تھا۔ وہ وہاں موجود لوگوں میں سے صرف ایک انکل منیب اور ان کے بیٹے کو جانتا تھا۔ انکل منیب اس کے فادر کے بیسٹ فرینڈ تھے اور ان کے بیٹے کی شادی کے لیے خاص گوجر خان سے لاہور آئے تھے۔ ان کے بڑے سے گھر میں جس کے آس پاس لامتناہی جگہ پہ لان تھا۔ وہ صبح سے اپنے کمرے میں ہی تھا۔ بابا نے اسے ایک دو بار باہر مہمانوں میں آنے کے لیے کہا بھی لیکن وہ نہیں مانا۔ انکل منیب کے بیٹے نے بھی میزبانی نبھاتے ہوئے اسے گھر کے اندر ہم عمر لڑکوں میں لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گیا تھا۔ البتہ کچھ دیر وہ گھر کے بزرگوں کے ساتھ بیٹھا بات چیت کرتا رہا تھا۔ اسے بزرگ افراد پھر بھی بے ضرر لگتے تھے۔

فنکشن کافی ہائی فائی تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا فنکشن پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ انکل منیب کی امیری کے چرچے ان کے گھر میں اکثر ہوتے رہتے تھے لیکن وہ اتنے زیادہ امیر ہیں، یہ اسے آج معلوم ہوا تھا۔ ٹھیک ہی کہا تھا سائرہ آپا نے کہ وہ تو نہیں جا سکتیں ایسی شادی میں جہاں جانے کے لیے وہ اپنی طرف سے کتنی بھی تیاری کریں پھر بھی ان کے لیول کی تیاری نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے بابا کے ہزار منت کرنے پر بھی وہ تیار نہیں ہوئیں۔

امی کو حرا کے ایگزامز کے لیے رکنا پڑا تھا۔ حرا امی سے ہی ٹیوشن پڑھتی تھی، اس کے بورڈ ایگزامز تھے اور وہ نہ اسے شادی میں بھیج سکتی تھیں نہ خود آ سکتی تھیں۔ اسی لیے بابا نے اس کی منت کی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کسی بھی شادی میں بھی نہیں جاتا حتیٰ کہ وہ اپنی سگی خالہ کی شادی میں بھی نہیں گیا تھا۔ واقعہ چھوٹا تھا لیکن اس نے اس کی عزتِ نفس کو بری طرح سے کچل ڈالا تھا۔

بڑے ماموں یو کے میں ہوتے تھے پھر انہوں نے چھوٹے ماموں کو بھی وہیں بلا لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں امیر ہوتے گئے۔ یہاں آ کر اپنا بزنس شروع کر لیا۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں سگی بہنیں تھیں، اسی لیے ایک ہی بڑا بنگلہ بنا لیا اور پورچ

میں گاڑیوں کی لائن لگ گئی۔ گھر بچوں سے بھر گیا ۔ایک بار رافیل ان کے گھر رہنے گیا تو اس نے ان بچوں کو انڈوں سے کھیلتے دیکھا۔ وہ سب کچن سے انڈوں کی ٹرے اٹھا کر لائے اور لان میں ایک دوسرے پہ انہوں نے انڈے پھینکنے شروع کر دیے رافیل کا منہ کھلا رہ گیا۔ ان کے گھر میں انہیں سنڈے کے سنڈے انڈے کھانے کے لیے ملتے تھے یا جو بیمار ہوتا اسے انڈہ کھانے کو دیا جاتا۔ گرمیوں میں تو انڈہ اور سردیوں میں ہفتے میں ایک یا دو بار رات کو گرم دودھ کے ساتھ ابال کر اور یہ لوگ انڈوں سے کھیل رہے تھے۔

جب کچن کے انڈے ختم ہو گئے تو ان میں سے ایک بھاگ کر گیا اور بیکری سے انڈوں کی دس ٹرے خرید لایا۔ بیکری کا ملازم ٹرے لان میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔

لان میں پھیلی سفیدی اور زردی کو دیکھ کر رافیل کو ان سب پہ افسوس ہوا۔ مامی ان سب پر ناراض ہوئیں کہ وہ یہ کھیل کہیں اور جا کر کیوں نہیں کھیلتے، ان کا سارا لان کیوں خراب کر دیا۔ "انڈوں" کی پھر بھی کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ بہت بعد میں رافیل کو معلوم ہوا کہ ان کے لان میں لگی گھاس کی قیمت انڈوں کی ان دس بارہ ٹروں سے زیادہ تھی۔

"کہیں اور جا کر کیوں نہیں کھیلتے" والی بات شاید انہوں نے سیریس لے لی تھی۔ وہ اپنے بنگلے کی دیوار پہ چڑھ کر آنے جانے والے ملازموں پر جو مختلف بنگلوں سے سامان لینے کے لیے نکلتے یا مالیوں پر جو بنگلوں کے باغات کی کاٹ چھانٹ کا کام کرنے آتے ان پر پھینکتے۔ رافیل اندازہ نہیں کر سکا کہ 'لان کی گھاس' زیادہ اہم ہے یا 'ملازم پیشہ لوگ'۔

یہ بدتمیزی کی حد تھی اور ظلم کی بھی۔ انسان اور رزق دونوں کے ساتھ۔ اس نے گھر میں یہ بات کی تو امی نے اسے سمجھا کر خاموش کروا دیا اور کہا کہ اسے یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کرنی چاہیے۔

"لیکن وہ رزق کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں امی؟"

"بیٹا! وہ سب کر سکتے ہیں۔"

"آپ ماموں سے ان کی شکایت کریں۔"

"ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے کچھ بھی کہنے کی، کوئی بھی بات کرنے کی۔"

اس نے ماموں کے بنگلے میں جانا چھوڑ دیا۔ پھر سائرہ آپا نے بھی اور حرا نے بھی۔ پھر امی بھی کم کم جانے لگیں۔ لیکن شادیوں میں جانا ضروری تھا ابھی بھی۔

ماموں کی بڑی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ امی نے کافی پیسے خرچ کیے تھے اس سالگرہ کے لیے۔ انہوں نے سائرہ آپا اور حرا کو اچھی والی فراکیں لے کر دی تھیں۔ حرا تو اپنی فراک میں بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ دونوں ماموؤں کی مشترکہ اولادیں اسے گھور رہی تھیں۔ کانوں میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ امی اسے دو بار کہہ چکی تھیں کہ حرا کو دیکھو، وہ بابا کے پاس ہے نا۔ بابا کے پاس گیا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ سارے گھر میں کہیں نہیں ملی تھی۔ وہ گھر کی دوسری منزل کی چھت پر تھی اور اس کے رونے کی آواز سیڑھیوں کے آخری کونے تک آ رہی تھی۔ جویریہ اور سیٹی نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اور قمر حرا پر تاک تاک کر انڈے پھینک رہا تھا۔

"ناک پہ مارو۔" باقی کا ہجوم چلا رہا تھا۔

"اب میری باری۔ تمہارے دس ہو چکے ہیں۔" کوئی اور چلایا۔

جس وقت نیچے کا سارا مجمع اوپر آیا، وہ قمر کی گردن کو اپنی ٹانگوں میں کسے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ سارے بچوں کا زور بھی قمر کو اس کی ٹانگوں سے نہیں چھڑا سکا تھا۔

ماموں نے اسے گردن سے دبوچ کر دور پھینکا اور کیوں کہ وہ بہت امیر تھے، بہت زیادہ امیر، اتنے امیر کہ ان کے بچے انڈوں کو کھاتے نہیں ان سے کھیلتے تھے۔ ان کے بچوں کے ایک بار کے پہنے

ہوئے کپڑے وہ، سائرہ آپا اور حرا پہنتے تھے اس لیے وہ اس پہ چلانے لگے۔ اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ قمر کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون سے داغ دار ہو چکے تھے۔

ایک عرصہ امی کو یہ باتیں سننی پڑیں کہ رافیل نے قمر کو اس بری طرح سے مارا تھا کہ اسے ایمرجنسی میں ہاسپٹل لے جانا پڑا تھا۔ بچپن کی بات تھی وقت کے ساتھ بچپن گزرنے پہ ختم ہو گئیں۔ ماموں گھر آتے تھے، امی ان کے گھر جاتی تھیں۔ سائرہ آپا اور حرا بھی چلی جاتی تھیں لیکن رافیل اپنے بچپن کو اپنے ساتھ لے کر ہی بڑا ہوا تھا۔ وہ یہ بات جان گیا تھا کہ 'انسانوں کو بار بار نہیں آزمانا چاہیے، ایک ہی بار آزما چکنے کے بعد ان کی خصلت پر صبر کر لینا چاہیے'۔ اپنے گھر والوں کے سوا وہ دنیا میں ہر انسان سے بے زار تھا اور اس نے ہر انسان کی خصلت کے ساتھ صبر کر لیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر اس رونے والی خاتون کو ڈھونڈنے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا جب 'عمار' نام کی پکار نے اس کے قدم روک لیے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس فلور کی طرف لے کر جا رہا تھا۔ اسے سرسری نظر سے دیکھا جاتا یا کچھ وقت لیا جاتا غور کرنے پر بھی اس کے بارے میں رائے ایک ہی ہوتی 'وہ وہاں موجود کسی بھی انسان سے زیادہ پرکشش تھا اور اپنی طرف کھینچ رہا تھا'۔

وہ اس لڑکی کی محبت کو کرش سمجھا تھا، ٹین ایج لو، جو عمر میں کسی نہ کسی کے ساتھ بنا کسی وجہ کے ہو ہی جاتا ہے۔ بغیر کسی واقعے یا وجہ کے۔ خود اس کا اپنا کرش اس قمر کی چھوٹی بہن لائبہ تھی۔ لیکن اب عمار کو دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے لیے ویرانے میں آنسو بہانا ایسا کوئی زیادہ بڑا احسان بھی نہیں تھا۔ اس کی خود غرضی پہ آنسو نکل سکتے ہیں اور ان ہی آنسوؤں کے ساتھ اس کا دفاع بھی کیا جا سکتا ہے۔

وہ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ مہندی کا فنکشن گھر کے ساتھ واقع کھلے میدان میں ہو رہا تھا۔ گھر میں صرف ملازم ہی تھے۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے گھر کے اندر گھومتا پھرتا رہا۔ وہ اس لڑکی کو ڈھونڈ رہا تھا جسے وہ جانتا تک نہ تھا۔

"گھر میں کوئی ہے؟" اس نے کام کرتی ایک خاتون سے پوچھا۔

"گھر میں کون ہوگا۔ سب تو باہر ہیں۔"

لاؤنج، ڈرائنگ روم، سامنے کا لان، سارا فرسٹ فلور اور پھر کچھ دوسرے کمرے جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے، وہ سب جھانک چکا تھا۔ گھر میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ کبھی کبھار نیچے سے کسی لڑکے یا آنٹی کی آواز آ جاتی جو کسی کام سے گھر آتے اور فوراً چلے بھی جاتے۔ وہ گھر میں بھی نہیں تھی، باہر بھی نہیں تھی تو پھر وہ کہاں تھی۔ وہ واپس نیچے جانے لگا تو اسے اوپر جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ حرا بھی اسے سیڑھیوں پہ ہی ملی تھی۔ نجانے اسے کیوں لگا تھا کہ وہ بھی اسے وہیں ملے گی۔ وہ اوپر آیا تو وہ آخری سیڑھی پہ ہی بیٹھی تھی۔ کپڑے وہ بدل چکی تھی اور پھر سے زار زار رو رہی تھی۔ رونے کے لیے اس کے پاس کافی وقت تھا۔ جگہ بھی مناسب تھی تو پھر وہ اپنا یہ من پسند شوق کیوں پورا نہ کرتی۔ رافیل کو اب کوفت ہوئی تھی۔ لڑکیاں کتنا روتی ہیں۔ اگر کسی کی بدتمیزی پہ پلٹ کر گھونسا نہیں مار سکتیں تو خود رو رو کر ہلکان بھی کیوں ہوتی ہیں؟

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" اس نے غصے سے کہا کہ جیسے تم سے چھپ کر ہی تو میں یہاں آئی ہوں اور اب تم پھر چلے آئے ہو۔

"میں آپ کو فنکشن میں ڈھونڈ رہا تھا۔" چاہتے ہوئے بھی وہ پہلے کی طرح اسے 'تم' نہیں کہہ سکا۔

"کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے؟ آپ یہاں شادی اٹینڈ کرنے آئے ہیں یا مجھے ڈھونڈنے؟"

شادی تو وہ بددل ہو کر اٹینڈ کرنے آیا تھا، ڈھونڈ وہ

اسے دل سے رہا تھا۔

"آپ کے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے اور آپ رو رہی ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

"لڑکی رو رہی ہے اس لیے ہمدردی ہو رہی ہے؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اتنی ہی سمجھ دار ہے تو پھر اس عمار کے لیے رو کیوں رہی ہے جو ہمیشہ اسے نقصان ہی پہنچانے کا کام بڑی ذمہ داری سے کرتا ہے۔

"نہیں۔ بلکہ ایک بے چارہ انسان رو رہا ہے اس لیے۔"

"میں بے چاری نہیں ہوں۔"

"ہیں تو بے چاری ہی۔ انہوں نے آپ کو زخمی کر دیا، دوپٹہ جلا دیا، کپڑوں پہ انک گرادی اور بھی پتا نہیں کیا کیا ہوگا اور آپ یہاں بیٹھی رو رہی ہیں۔ یہ بے چارگی نہیں تو اور کیا ہے۔"

"تو اور کیا کروں۔ میں اکیلی ہوں۔ بابا کہتے ہیں کہ میں خاموش رہوں۔"

"وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"کیونکہ ہم تایا ابو کے گھر میں رہتے ہیں اور جن کے گھر رہا جائے، ان کے آگے بولا نہیں جاتا۔"

"تو پھر آپ تایا کے گھر نہ رہیں۔ چھوڑ دیں ان کا گھر۔ لیکن اپنے حق کے لیے بولنا سیکھ لیں۔"

"فی الحال تو آپ یہ جگہ چھوڑ دیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ ان سب سے نبٹنے کا طریقہ بتا سکتا ہوں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"مجھے ایسا کوئی طریقہ نہیں چاہیے۔ مجھے بس عمار چاہیے۔ وہ ان جیسا کیوں ہے؟" اسے پھر سے اپنا دکھ یاد آ گیا۔

"آپ کا دوپٹہ کیسے جلا؟"

"یہ کوئی پہلا دوپٹہ نہیں ہے جو جلایا گیا ہے۔"

رافیل نے تاسف سے اسے دیکھا۔ یعنی یہ سب پہلے بھی ہوتا رہا ہے پھر بھی عمار اچھا ہے، معصوم ہے، اسے پسند ہے۔ اس لڑکی کے لیے تو تالیاں بجانا بنتا تھا۔

"یعنی آپ کافی عرصے سے یہ سب سہہ رہی ہیں۔ ڈونٹ مائنڈ لیکن جس انسان میں عزت نفس نہ ہو، اسے خود پر سے 'انسان' ہونے کا لیبل بھی اتار دینا چاہیے۔ کیسی انسان ہیں آپ جسے اپنی خودداری کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں جب نو سال کا تھا، اس وقت میرے ماموں نے مجھے کہا تھا کہ 'جس کی اترن پہن کر شو مار رہے ہو، اسی کی گردن دبوچ رہے ہو۔' پھر میں نے دوبارہ کسی کو بھی یہ موقعہ نہیں دیا کہ وہ میری طرف انگلی اٹھائے اور مجھ پر کوئی احسان جتائے۔"

"عزت نفس ہے مجھ میں۔" یہ بات کہتے اس کی آواز کافی کمزور تھی۔

"اچھا وہ کیسے؟"

اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ "تم نہیں سمجھو گے۔ بس عمار کے لیے ہی سب۔"

"ہونہہ۔ کسی کے لیے بھی۔ میں کہتا ہوں کسی کے لیے بھی۔" اس نے گھور کر دیکھا اور پاؤں پٹخ کر جانے لگی۔

"غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ یا آپ ان لوگوں کو ان کے کیے کا احساس دلائیں یا ان سے دور رہیں۔ آپ نے کہا آپ کی ماں نہیں ہیں۔ آپ اپنی ماں کے بغیر بھی تو رہ رہی ہیں؟ ٹرسٹ می انسان ہر چیز کے بغیر رہ لیتا ہے۔ آپ بھی عمار کے بغیر رہ لیں گی لیکن میرا مشورہ مانیں، غیرت کے بنا نہ رہیں۔ اس سے بہتر تو موت ہے۔"

وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ "اس سے بہتر تو موت ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی، کافی دیر اسی جملے کی گردان کرتے رہنے کے بعد وہ نیچے چلی گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے نیچے آ گیا تا کہ اپنے کمرے میں جا سکے۔ نیچے لاؤنج میں اسے عمار آتا دکھائی دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے استہزائیہ پوچھا۔

"ہم تمہیں فنکشن میں تلاش کر رہے تھے۔"
عمار کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی نے اترا کر کہا۔
بنا جواب دیے وہ کچن میں چلی گئی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں پکڑے تھال کو اس نے عمار پر اچھال دیا۔
اس کے ساتھ ہی دو اور لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان کے نئے ڈیزائنر ڈریسز اور پارلی ہیر اسٹائل پر گاڑھی مہندی بہت اہتمام سے گری تھی۔

"واٹ دا ہیل۔" عمار پوری قوت سے چلایا تھا جبکہ باقی لڑکیوں کو صدمے سے چلانے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ وہ گردن جھکائے اپنے ڈریسز کو ڈمی بنی دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آر ہا تھا کہ ان کے ساتھ یہ سب ہو چکا ہے۔ یقین تو پیچھے کھڑے رافیل کو بھی نہیں آر ہا تھا کہ کچھ دیر پہلے روتی دھوتی، بے چاری سی بنی یہ لڑکی اتنا بڑا کام کر چکی ہے۔ اپنے حصے کا حساب برابر کر چکی ہے۔

"ان کے ساتھ مل کر تم مجھے تنگ کرتے ہو نا۔ میری بنڈیا پہ ایلفی لگا دی۔ میرے کپڑے جلا دیے۔"
اس کی آواز کانپ رہی تھی پھر بھی وہ روئی روئی آواز سے تو بہتر ہی تھی۔ کانپ کر چلانا رونے سے کئی گنا بہتر ہوتا ہے۔

"اب ان سب کے ساتھ مل کر مہندی کا فنکشن تم مہندی لگے کپڑوں کے ساتھ انجوائے کرو۔"
رافیل، عمار اور اس کے سامنے حیرت زدہ سا کھڑا تھا۔ حقیقتاً اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس لڑکی نے اسے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ لڑکی ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

عمار اس کے تایا ابو کا بیٹا تھا اور وہ اس کے سب سے چھوٹے چچا کی بیٹی۔ تب تک سب ٹھیک تھا جب تک وہ الگ گھر میں رہتے تھے۔ پھر سب خراب ہو گیا۔ ماما کی وفات کے بعد وہ دونوں بہنیں اکیلی گھر میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ تایا اور پھپھو کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ وہ ڈیفنس میں رہتے تھے اور وہ ڈیفنس سے باہر عام سے علاقے میں جہاں پانچ مرلے کے گھر کی

قیمت پچاس لاکھ بھی نہیں تھی۔ تایا ابو اپنا بزنس کرتے تھے اور بہت زیادہ امیر تھے۔ تایا ابو نے پھپھو کی شادی اپنے بزنس پارٹنر سے کروا دی تھی جو ان سے پندرہ سال بڑے تھے۔
تائی امی کی بہنیں اور بھائی بھی ان ہی کے بلاک میں رہتے تھے اور یوں وہاں ایک جیسے اسٹیٹس کے کزنز کا گروپ بن گیا تھا۔

رباب کے بابا زرعی بینک میں ملازم تھے۔ جب ان دونوں کا گھر میں اکیلے رہنے کا مسئلہ زیادہ پریشان کن ہوا تو تایا نے انھیں اپنے بنگلے میں بنا سرونٹ کوارٹر دے دیا جو کم و بیش ان کے ذاتی گھر جیسا ہی تھا۔ دو کمرے، کچن اور باتھ روم۔
بس یہی وہ فیصلہ تھا جو اس کے بابا نے کیا اور غلط کیا۔ وہ تین سال وہاں رہے۔ ان تین سالوں میں اس کے بابا تک تو کم ہی باتیں پہنچیں لیکن ان دونوں نے کافی کچھ جان اور سمجھ لیا۔
وہ دونوں تایا اور پھپھو کے گھر کے کام بھی کر دیتی تھیں، ان کے بچوں کے ساتھ مل کر ٹی وی پہ کارٹون بھی دیکھ لیتیں، کبھی کبھار ان کے ساتھ کھانا بھی کھا لیا کرتیں لیکن پھر بھی لکیر جہاں لگی تھی، وہ وہیں لگی رہی۔ ان کی حیثیت جہاں اور جتنی طے ہو چکی تھی وہ وہیں رہی۔ سب کے ساتھ ایک جگہ کھانے کے باوجود ان کی کرسیاں الگ ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عید وغیرہ پہ انھیں بھی تحائف دیے جاتے تھے لیکن ان تحائف کے لیے یہ بات طے تھی کہ انھیں کتنی قیمت کا ہونا چاہیے۔
اس سب طے شدہ حیثیت کے باوجود وہ عمار سے خود کو محبت کرنے سے روک نہیں سکی۔ ویسے عمار بھی اسے دو بار پروپوز کر چکا تھا، یہ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ پروپوزل ہی تھا۔
ایک بار وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سوئمنگ پول کے کنارے لے گیا اور اسے یہ بتانے لگا کہ وہ اسے کتنی اچھی لگتی ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کبھی کبھار مین (کمینہ) ہو جاتا ہوں۔"

"تم مین نہیں ہو عمار۔" اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر کہا۔ عمار کبھی برا ہو ہی نہیں سکتا تھا بھلے وہ اپنے منہ سے ہی کہہ رہا ہو کہ میں برا ہوں۔

عمار نے ہاتھ میں پکڑے ڈسپوزبل کپ میں انگلی ڈبو کر اس کی ایک آئی برو پہ لگائی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کپ میں جھانکا۔

"یہ ریڈ اینک ہے۔ دیکھو تم کتنی کیوٹ لگ رہی ہونا۔"

وہ مسکرانے لگی کہ عمار کو وہ ایسے کیوٹ لگ رہی تھی۔ اس نے پھر سے ریڈ اینک میں انگلی ڈبو کر اس کی دوسری آئی برو پہ لگائی۔ پھر ہونٹوں پہ، پھر گالوں پہ گول گول۔ پھر اس نے اس کے دونوں ہاتھ اس کپ میں ڈپ کرنے کو کہا۔ اس نے فوراً وہ ہاتھ انک میں ڈبو لیے۔

"اب یہ دونوں ہاتھ تم اپنے دونوں کانوں کے پاس رکھ لو۔ مجھے تمہاری ایک تصویر لینی ہے۔"

اس نے اپنے کانوں کے پاس اپنے ہاتھ پھیلا کر کھڑے کر لیے۔ عمار نے اس کی تصویر کلک کر لی۔

"تم دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔"

"اور تم دنیا کے سب سے پیارے دوست ہو۔" وہ ہنس دیا تھا۔ اور اسے ہلکا سا پش کر کے سوئمنگ پول میں دھکیل دیا۔

تو یہ تھا عمار کا فرسٹ پروپوزل جسے وہ تیرہ سال کی عمر سے خود کو رات بھر جگا کر رکھنے کے لیے اپنے سرہانے رکھتی تھی۔ اس کی کلک کی گئی تصویر عمار نے سب کزنز میں بانٹ دی۔ اور وہ اس پہ لگی اپنی شرط جیت گیا تھا۔ وہ اکثر ہی اس پہ شرط لگاتا تھا اور جیت بھی جاتا تھا۔ وہ عمار کے پش کرنے کو، ریڈ اینک لگانے کو بھول گئی، یاد رہا تو یہ کہ 'تم دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو' کاش کہ وہ جان سکتی کہ اس جملے کے پس منظر میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ 'تم دنیا کی سب سے بے وقوف لڑکی ہو۔'

اس کا دوسرا پروپوزل پہلے سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ آئی تھی اور وہ تین دن سے اپنے بستر پر تھی۔

"کتنے دن ہو گئے تم گھر نہیں آئیں؟" عمار خود اس کے لیے اس کے گھر آیا تھا۔ بھلا اس سے بڑی بات کیا ہونا تھی۔

اب وہ بڑا ہو گیا تھا اور تایا ابو کی کاروں کو دیواروں میں دے دے کر مارنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کاریں سڑکوں پہ دوسری کاروں سے مارتا تھا۔

"میں بیمار ہوں۔"

اس نے غور سے گھوم کر اس کا پورا جائزہ لیا کہ وہ کہاں سے بیمار ہے۔ پھر بغور اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔

"اب اتنی بھی بیمار نہیں ہو کہ چل نہ سکو۔"

"بیمار نہیں ہوں لیکن چل نہیں سکتی۔" اس نے اپنے جملے میں مناسب ترمیم کی۔ وہ ہنسا تھا۔

"تم چل سکتی ہو۔ میں تمہارے گھر آیا ہوں تو کیا مجھے ایک کپ چائے بھی نہیں پلا سکتیں۔"

"کیا کبھی تمہارے پاؤں میں موچ نہیں آئی۔" اس نے پوچھا تا کہ وہ جان سکے وہ موچ میں تکلیف کا مطلب بھی جانتا ہے۔

"مجھے بیماریوں کے بارے میں باتیں کرنا بالکل نہیں پسند۔ اٹھو اور مجھے جوس پلاؤ۔ میں تمہیں مس کرتا رہا ہوں، کیا تم نے مجھے ذرا مس نہیں کیا؟"

یہ آخری بات اتنی پر اثر تھی کہ وہ واقعی اٹھ کر کچن تک آ گئی تھی اور اس کے لیے جوس بنا لائی تھی۔ پھر اگلے ایک ہفتے تک اسکول سے چھٹی کرنا پڑی تھی۔ اس کا پاؤں سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے مزید چلنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ اسی بات میں خوش تھی کہ اس نے عمار کے لیے یہ ساری تکلیف اٹھائی تھی۔

اگر محبت اندھی ہوتی ہے تو بچپن کی محبت اندھی تر ہوتی ہے۔

وہ محبت اب بھی عمار سے کرتی تھی لیکن اب اس نے اپنی اندھی محبت کو تھوڑی بینائی دینی شروع کر دی تھی۔ میٹرک کے ایگزامز کے بعد اس نے پاپا سے کہا تھا کہ وہ انھیں، ان کے پرانے گھر لے جائیں۔

"میں تم دونوں کو وہاں اکیلے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" رباب کی فرمائش سن کر وہ گھبرا ہی گئے۔

"ہم رہ لیں گی۔ اب ہم چھوٹی نہیں رہیں۔"

"اتنی بھی بڑی نہیں ہوئیں تم رباب۔" انھوں نے بغور بیٹی کا چہرہ دیکھا جس پہ اب گہری سنجیدگی رقم ہوتی تھی۔

"بابا! میں تایا ابو کے گھر مزید نہیں رہنا چاہتی۔ آپ کو اب میں کیسے سمجھاؤں؟" وہ اس ایک بات کو دل سے لگا کر جی رہی تھی کہ انسان کو ہر چیز کے بنا رہ لینا چاہیے سوائے عزتِ نفس کے اور اس کی عزتِ نفس اسے یہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ مزید یہاں رہے۔

"سب سمجھتا ہوں میں لیکن کبھی کبھی انسان کو حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"

"یہ سمجھوتا ہم کئی سالوں سے کر رہے ہیں۔ اب بہتر ہے کہ ہم کوئی قدم اٹھالیں۔" اس نے ایک بار ضد شروع کی تو یہ ضد پھر چھوڑی نہیں۔ وہ ہر صورت عمار کے پاپا کے گھر سے جانا چاہتی تھی۔

"آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتے بابا۔" وہ پھر سے باپ کی جان کھانے لگی۔

کامران صاحب کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے، اسے سنتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہیں۔ رباب جس شدت سے یہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی اس کی کچھ کچھ وجہ وہ سمجھتے تھے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے، حساس تھے، اپنی عزتِ نفس پہ حرف نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔

"کیونکہ رباب میرے پاس کوئی گھر نہیں رہا۔ وہ گھر بھی تمہارے تایا ابو کا ہی ہے۔" انھیں کہنا ہی پڑا۔

"کیا مطلب؟ ہمارا گھر تایا ابو کا کیسے ہو گیا؟"

وہ ایسی بات پہ بالکل شاکڈ رہ گئی۔

"تمہاری ماما سات سال بیمار رہی ہیں۔ میں بھائی جان سے قرض لے کر علاج کراتا رہا ہوں۔ اب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ گھر کا کرایہ بھائی جان کے پاس جاتا ہے۔ ان کا جب دل چاہے گا، وہ اسے بیچ دیں گے۔"

"ہمارا اتنا بڑا گھر تایا ابو کے پاس اتنی آسانی سے کیسے چلا گیا؟ آپ بینک سے لون لے لیتے بابا۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ایک چھت کا ہی تو آسرا تھا، وہ بھی چھن گیا تھا۔

"بینک سے جو لون لیا تھا اس کی ادائیگی بھی تمہارے تایا ابو سے رقم لے کر کی تھی۔ اگر گھر کچھ زیادہ پیسوں میں بھی بک گیا تو میرے ہاتھ آٹھ دس لاکھ ہی آئیں گے جس سے مجھے تم دونوں کی شادیاں کرنا ہیں۔ جہاں اتنا وقت یہاں گزارا ہے وہاں تھوڑا مزید صبر کرلو۔ اپنے باپ کی بے بسی کو سمجھو۔ تمہاری خالہ نے نوریا کا ہاتھ مانگا ہوا ہے۔ جیسے ہی وہ ایف ایس سی کے پیپر دے گی میں اس کی شادی کر دوں گا۔" یہ ایک مزید شاک تھا جو اسے لگا تھا۔ نوریا آپی تو بہت زیادہ پڑھنا چاہتی تھیں۔

"لیکن بابا! نوریا آپی تو ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر نہ قسمت سے بنتے ہیں نہ ہی محنت سے، صرف پیسے سے بنتے ہیں اور فی الحال میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

زندگی کا اصل روپ تو انھوں نے ماں کے مرنے کے بعد دیکھ ہی لیا تھا لیکن بابا کی ان باتوں نے زندگی کا رہا سہا میک اپ بھی اتار کر رکھ دیا تھا اور اس کا اصل چہرہ دھل دھلا کر سامنے آگیا جو بہت خوف ناک تھا۔

اگر نوریا ڈاکٹر نہیں بن سکے گی تو وہ کیسے بنے گی۔ ان دونوں نے ماں کو جس حالت میں تڑپتے دیکھا تھا تب ہی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن کر دوسروں کی خدمت کریں گی۔ رباب نے نوریا کو بتایا تو اس نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔

''تم خاموش کیوں ہو آپی؟''

''اور کیا کروں۔ تمہاری طرح واویلا کرنے بیٹھ جاؤں؟'' وہ خائف ہوگئی۔

''تو کیا تم ڈاکٹر نہیں بنو گی؟''

''تم نے سنا نہیں، بابا نے کیا کہا ہے؟ ڈاکٹر بننے کے لیے خواہش نہیں آسائش چاہیے ہوتی ہے۔'' سنا تو اس نے تھا لیکن یقین نہیں آرہا تھا۔ نویرا سے زیادہ اسے رونا آرہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے، تم شادی کرنا چاہتی ہو بس۔ تمہیں وسیم بھائی پسند آگئے ہیں۔''

''مجھے کوئی نہیں پسند۔ لیکن اپنا باپ بہت عزیز ہے، اس کی پرواہ ہے مجھے۔''

''لیکن میں ڈاکٹر ضرور بنوں گی۔ تم بھلے کروالو شادی۔'' وہ کسی بچے کی طرح کہہ رہی تھی جو حالات نہیں سمجھتا بس ضد کرنا جانتا ہے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ عمار تم سے شادی کرلے گا؟'' نویرا نے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''عمار کی بات کہاں سے آگئی؟'' وہ گڑبڑا گئی۔ اپنے بھولپن میں وہ بھول گئی تھی کہ کچھ باتیں چھپانے سے بھی چھپا نہیں کرتیں۔ عمار سے اس کی پسندیدگی بھی نویرا سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

''عمار کی بات ہی تو ہے ساری۔ میں جانتی ہوں تم کیا سوچتی ہو۔'' جب وہ سب جانتی تھی تو رباب نے بھی پردہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

''ہاں سوچتی ہوں۔ پسند کرتی ہوں اسے اور وہ مجھے۔''

''اول تو وہ کہیں سے بھی تمہیں پسند نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوا تو تم سے شادی نہیں کرے گا اور اگر وہ غلطی سے ایسا سوچ بھی لے گا تو تائی امی بھی ایسا ہونے نہیں دیں گے۔''

''میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو تائی امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

یہ مفروضہ اس نے خود ہی گھڑ لیا تھا اور اس پہ دل و جان سے یقین بھی کرلیا تھا۔

''لائق فائق بہوؤں کو کون بیاہ کر لاتا ہے۔ سب اسٹیٹس دیکھتے ہیں۔ ورنہ بڑی بڑی ڈگریوں والی چھوٹے گھروں کی لڑکیاں بڑے گھروں کی بہوئیں ہوتیں۔'' اور اس نے سوچا تھا کہ دیکھ لیں گے اسٹیٹس کو بھی۔

☆☆☆

صبح بابا جلدی میں تھے اس لیے اسے کالج ڈراپ نہیں کرسکے۔ اس کا کالج میں دوسرا دن تھا۔ کالج گھر سے بھی دور تھا کیونکہ ڈیفنس سے دور کوئی سستا سا سرکاری کالج ڈھونڈنا جتنا آسان تھا وہ اس کے گھر سے اتنا ہی دور تھا۔ بابا اسے چھوڑ دیا کرتے اور واپسی پہ وہ لوکل وین سے خود آجاتی۔ گیٹ سے باہر وہ نکل کر سڑک پہ تیز تیز پیدل چل رہی تھی کہ پیچھے سے ہارن دیتی عمار کی کار اس کے قریب آکر رکی۔

''آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں۔'' اسے اور کیا چاہیے تھا، جھٹ سے بیٹھ گئی۔

''تم گھر نہیں آتی ہو اب۔'' تو عمار نے اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا ہے اور پھر نویرا کہتی ہے کہ وہ اسے کہیں سے بھی پسند نہیں کرتا۔

''میں پڑھتی ہوں۔ بزی ہوتی ہوں۔''

''ابھی تو کالج شروع ہوا ہے اور ابھی سے تم نے پڑھائی کو خود پہ سوار کرلیا ہے۔''

''مجھے ایف ایس سی میں ٹاپ کرنا ہے تاکہ مجھے میڈیکل میں اسکالرشپ مل سکے۔'' عمار سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہوگیا تھا۔

''ڈاکٹر بن کر تم کیا کرلو گی؟''

''جو تم کرلو گے۔'' عمار میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم گریجویشن کرو اور شادی کرکے اپنا گھر بساؤ۔''

اسے یہ بات بری طرح چبھی تھی۔ وہ کتنی روایتی سوچ کا مالک تھا یا شاید یہ روایتی سوچ اسی کے لیے مخصوص تھی۔ امیر رشتے داروں کی کچھ سوچیں بس

غریب رشتے داروں تک ہی محدود ہوتی ہیں۔

''اچھا تو تم کرو گے مجھ سے شادی؟'' اس نے طنزیہ کہا جبکہ دل سے وہ یہ بات طنزیہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

''ویل! یہ تو وقت طے کرے گا کہ مجھے کس سے شادی کرنا ہے۔''

''یعنی تم مجھے ہاں کہہ رہے ہو نا ہی نہ؟'' وہ مسکرا دیا۔

''کافی سمجھدار ہو تم۔''

''ذہین بھی ہوں میں۔ بہر حال مجھے ڈاکٹر ہی بننا ہے، تم اگر ابھی مجھ سے شادی کا وعدہ کر لیتے ہو تو شاید یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ چند سالوں بعد میں اپنا ارادہ بدل لوں۔'' عمار کتنی دیر اس کی شکل دیکھتا رہا اور پھر قہقہے لگانے لگا۔

''کیا کہا تم نے......؟ پھر سے کہنا......؟''

''مجھے اپنی بات دہرانا پسند نہیں ہے۔ سنہری حروف بار بار دہرائے نہیں جاتے۔''

''تمہیں حقیقت پسند ہونا چاہیے نا کہ ایسے فلمی ہیروئنز کی طرح۔ تم نے مجھے شادی کی پیشکش تو ایسے کی ہے جیسے تمہارے پیچھے ایک لمبی لائن لگی ہوئی ہے لڑکوں کی یا تم آئندہ چند سالوں میں ایک بہت ہی معروف انسان بننے والی ہو۔ جو بھی ہے مجھے تمہارا اعتماد اچھا لگا۔ انسان کو ایسے ہی خوش باش رکھنا چاہیے خود کو لیکن حقیقی دنیا میں بھی رہنا چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے زبردست قہقہہ لگایا جس پہ رباب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا وہ جان گئی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی تو کرتا تھا۔

''دیکھ لینا عمار! یہ نہ ہو تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کالج کے سامنے گاڑی سے اتر گئی۔

''ابھی مجھ پہ اتنا برا وقت نہیں آیا اور نہ ہی مستقبل میں آنے کا امکان ہے۔'' رباب نے گاڑی کا دروازہ ٹھک سے بند کیا تو وہ گاڑی اڑا کر لے گیا۔ وہ سارا دن اس کی باتوں کو سوچ سوچ کر کلستی رہی پھر کسی کا کہا ہی جملہ یاد آنے لگا کہ انسان ہر چیز کے بنا جی لے لیکن عزتِ نفس کے بنا تو موت ہی بہتر ہے۔

''کیا ضرورت تھی مجھے عمار سے یہ سب کہنے کی۔ اتنا اکڑنے کی۔ ایسا اعتماد دکھانے کی اور بدلے میں اتنی بے عزتی کرانے کی۔'' وہ خود پہ ملامت بھیجتے تھک نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

نویرا نے ایف ایس سی کے ایگزامز دیے ہی تھے کہ بابا نے اس کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی تھی۔ کوئی بھی فارمیلٹی نہیں ہوئی۔ بابا نے ان دونوں کو گھر آ کر بتا دیا کہ شادی کی ڈیٹ فکس کر دی ہے۔ نہ کوئی خالہ کے گھر سے آیا نہ کسی کو مدعو کیا گیا۔

''بابا! اتنی جلدی۔'' رباب کا منہ بن گیا۔

''بیٹیوں کی شادی کبھی جلدی نہیں ہوتی، ہمیشہ وقت پہ ہوتی ہے۔'' بابا نے گہری سانس لی۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔

جس دن نویرا کی شادی تھی اس سے دو دن پہلے عمار اور باقی کزنز گلیات اور شمالی علاقہ جات گھومنے نکل گئے تھے۔ انھیں معلوم بھی تھا کہ نویرا کی شادی ہے لیکن انھوں نے شادی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ظاہری بات تھی کہ اس روکھی پھیکی شادی میں ان کی کیا دلچسپی ہونا تھی، نہ ہی نویرا اتنی اہم تھی کہ وہ اس کی خاطر رک جاتے۔ اس کا خیال تھا کہ تایا ابو یا پھپھو اس طرح اچانک شادی پر ضرور کچھ کہیں گے لیکن وہ سب تو مطمئن تھے۔ انہوں نے بابا سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ ابھی نویرا چھوٹی بچی ہے، اس کی شادی کی عمر نہیں ہے، اسے پڑھنے دیا جائے، منگنی یا نکاح کر دو شادی دو چار سال بعد کر دینا۔

نویرا ٹھیک کہتی تھی کہ غریب رشتے دار ہر امیر رشتے دار کے لیے باعثِ ندامت ہوتے ہیں جن سے وہ بس ایک چیز چاہتے ہیں اور وہ ہے چھٹکارا۔

ان ساری باتوں نے اس کے دل کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا

تھا۔ شادی کے ایک مہینے بعد بابا نے اس کا بھی سامان سمیٹا اور خالہ کے گھر چھوڑنے آگئے۔ وہ بھی خاموشی سے وہاں آگئی بنا بابا سے کوئی سوال جواب کیے۔

بابا نے اسے وہاں چھوڑتے ہوئے بس اتنا بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کی بدولت نوکری کے لیے کویا جارہے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ رباب ہر صورت ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ اپنی طرف سے وہ جتنی محنت کرسکتی تھی کررہی ہے، کچھ محنت انھیں بھی تو کرنا تھی اس کے لیے جوان پہ فرض تھی۔ اسی لیے انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ لیا تھا کیونکہ وہ بھی اب چاہتے تھے کہ رباب ڈاکٹر بنے۔ اگر تھوڑی سی بھاگ دوڑ سے ان کی بیٹی کا خواب پورا ہوسکتا تھا تو وہ یہ بھاگ دوڑ کرنے کے لیے تیار تھے۔

جانے سے پہلے بابا اسے لے کر ملنے گئے تھے۔ تایا ابو نے کافی برا مانا تھا کہ وہ اپنی اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر باہر کیوں جارہے ہیں۔ باہر کون سا درختوں پہ نوٹ لگے ہیں جو وہ توڑ کر واپس آجائیں گے لیکن بابا نے اس بار تایا ابو کی ناراضی کی پروا نہیں کی تھی۔ رباب بابا کے فیصلے سے خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم وہ اپنا گھر تایا ابو سے واپس لے لیں تاکہ ان کے سر پہ چھوٹی ہی سہی لیکن ان کی اپنی چھت ہو۔

''مجھے رباب کو ڈاکٹر بنانا ہے بھائی جان۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔ نورا تو شاید نہ بن پاتی لیکن وہ ضرور بن جائے گی اور پھر میں اپنی دونوں بیٹیوں کو تو ایسے کم پڑھا لکھا نہیں رہنے دے سکتا۔''

بابا نے جانے سے پہلے خاقان صاحب کو وضاحت دی تھی جسے انہوں نے نخوت سے سر جھٹکتے سنا تھا۔

''کیا کارنامہ ہو جائے گا اس کے ڈاکٹر بننے سے۔ ہسپتال کھڑے کردے گی یہاں یا گولڈ میڈل لے آئے گی؟''

''اس کی خواہش ہے۔''

''خواہش انسان کو اوقات دیکھ کر کرنی چاہیے۔''

تائی امی کا غرور اس کا دل سلگا گیا تھا۔ اس نے کون سا در جن بھر خواہشات پالی تھیں۔ ایک ادنی سی خواہش، معصوم سا خواب تھا اس پہ بھی وہ خاندان جن کا وہ خون تھی، پاؤں رکھ کر کھڑا سانس دبا رہا تھا۔ وہ سب حسب توفیق انھیں ان کی اوقات یاد دلاتے رہتے تھے اور تب ہی رباب نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی اس اوقات کو بدلے گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے اسے ڈاکٹر بننا تھا اور اپنا گھر پھر سے حاصل کرنا تھا جہاں ان کی اپنی ایک سادہ سی زندگی تھی جو تایا ابو کے ہاں آنے سے عذاب بن گئی تھی۔

بابا باہر چلے گئے اور وہ اپنے خواب، خواہشات کے جگنو مٹھی میں دبائے خالہ کے ہاں آگئی۔

☆☆☆

عمار نے اسے اپنے کالج میں دیکھا تو اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔ اس نے آنکھوں کو مل کر بھی دیکھا لیکن منظر وہی رہا، اس میں انچ برابر بھی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔ وہ بھلے اب ان کے ساتھ نہیں رہتی تھی لیکن اتنا تو وہ جانتا تھا کہ اس نے ایف ایس سی میں ٹاپ نہیں کیا اور ٹاپ نہیں کیا تھا تو اسے اسکالر شپ بھی نہیں ملا ہوگا پھر وہ اس کے میڈیکل کالج میں کیسے گھوم پھر رہی تھی؟ یقیناً چاچو کے ہاتھ پیسہ بنانے والی مشین آگئی تھی جو انھوں نے ان کے مقابل اپنی اس دماغ سے پیدل بیٹی کو لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اب عمار خاقان کی برابری کرے گی۔ اب ایسا برا وقت بھی آنا تھا اس پہ۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہاں کیا کررہی ہوگی اس نے ایسا احمقانہ سوال کر ڈالا جس پہ اسے بعد میں افسوس بھی ہوا۔

رباب نے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ اس کی ہاف سلیوز شرٹ سے نکلتے بازو عجیب وغریب قسم کے ٹیٹوز سے بھرے ہوئے تھے اور کانوں سے نیچے گردن بھی ایسے ہی ٹیٹوز سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی

کہہ سکتا تھا کہ وہ مستقبل کا ڈاکٹر بننے والا ہے جو علاج تو کیا کرتا اپنے ایسے حلیے سے مریضوں کو سیدھا اوپر ہی سدھارتا۔ ایسے بیہودہ فیشن کرنے کی اجازت یہاں کون دیتا تھا یا وہ فیشن کرنے کے لیے بھی اپنے باپ کی اپروچ لڑاتا تھا؟

''میرا خیال ہے کہ یہ کالج ابھی تک تایا ابو نے نہیں خریدا اور نہ ہی یہاں ان کی مرضی پہ ایڈمیشن دیے جاتے ہیں۔'' بچپن میں اس کی جی حضوری کرنے والی کیسے پٹ پٹ جواب دے رہی تھی۔ عمار خاصا حیران ہوا تھا۔

''تم اس کالج میں پڑھتی ہو؟'' اس نے مزید احمقانہ سوال کیا تو وہ مسکرا دی۔

''یہ پکنک اسپاٹ تو ہے نہیں، کالج ہے جہاں پڑھا جاتا ہے اور سب یہاں پڑھنے ہی آتے ہیں تو میں بھی پڑھنے ہی آسکتی ہوں نہ کہ کوئی پارٹی شارٹی کرنے۔'' عمار نے ادھر ادھر دیکھا جیسے اس کے یہاں ہونے سے اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑا لیکن اس کے چہرے کی عبارت کچھ اور ہی کہتی تھی جسے سامنے کھڑی رباب نے بخوبی پڑھا بھی تھا اور محظوظ بھی ہوئی تھی۔

''میں نے تو نہیں سنا کہ تم نے ٹاپ کیا ہے اور تمہیں اسکالرشپ مل گیا ہے جو تم اس کالج میں موجود ہو۔''

یہ سچ تھا کہ اس کالج کا میرٹ بہت ہائی تھا اور یا تو وہاں نمبروں کی بنیاد پہ داخلہ ملتا تھا یا چند سیٹیں سیلف فنانس کی تھیں جس کی فیس اتنی تھی کہ اس میں ایک شاندار بنگلہ بنوایا جا سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عمار وہاں تایا ابو کی دولت اور اثر و رسوخ کی بنا پہ پڑھ رہا ہے اور شاید وہ یہی توقع اس سے بھی کر رہا تھا۔

بابا بھلے باہر چلے گئے ہوں لیکن ابھی اتنے امیر نہیں ہوئے تھے۔ وہ بس اتنا ہی کما رہے تھے جس میں اسے عزت سے پڑھا سکیں۔ وہ اپنی ذہانت اور محنت کی بنا پہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ اس نے ان دو سالوں میں جو واحد کام کیا تھا، وہ پڑھنا تھا۔ اسے ملک کے ٹاپ ترین میڈیکل کالج سے ہی تعلیم حاصل کرنا تھی۔ جب اس کا ایڈمیشن اس کالج میں ہوا تھا تو بابا نے فون پہ خوشی سے چھلکتی آواز میں کہا تھا۔

''مجھے زندگی میں کبھی کسی بات کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا آج ہوئی ہے۔'' اور اسے بھی اس بات کی خوشی اپنے ایڈمیشن سے بھی زیادہ ہوئی تھی۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نہیں، میں ڈاکٹر بننے جا رہی ہوں۔''

گود میں اپنی چند ماہ کی بیٹی لیے نوریہ نے اس سے محبت سے کہا تو اسے لگا کہ وہ اکیلی نہیں اس کا سارا خاندان ڈاکٹر بننے جا رہا ہے۔ ہماری کچھ خواہشات بس ہماری نہیں ہوتیں، ہم سے جڑے تمام رشتوں کی ہوا کرتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

''اسکالرشپ بھلے نہ ملا ہو لیکن ایڈمیشن مجھے مل گیا ہے، چونکہ میں ذہین ہوں جو کہ تم نے بھی تسلیم کیا تھا اسی لیے یہاں پڑھنا افورڈ کر سکتی ہوں۔''

عمار نے اس کے لہجے میں اعتماد کا گراف پہلے سے بھی بلند پایا تھا۔ اس لڑکی میں تب بھی خاصا اعتماد تھا جب وہ ان کے ہاں رہا کرتی تھی لیکن اب تو اس کا انداز ہی نرالا تھا اور عمار کی ایک چھوٹی سی کمزوری تھی جو کسی کو نہیں پتا تھی کہ اسے پُراعتماد لڑکیاں بے حد پسند تھیں۔

''میں بھی کہوں، چاچو اتنی جلدی اتنا کیسے کمانے لگ گئے۔'' اپنی غربت پہ اس کی چوٹ ہمیشہ کی نسبت اسے زیادہ بری لگی تھی۔

''ہر کسی کو اللہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی نعمت ضرور ملتی ہے جیسے تمہیں دولت اور مجھے ذہانت۔''

عمار کا چہرہ سرخ پڑا تھا اور شاید یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے رباب کا کوئی جملہ اتنی شدت سے چبھا تھا۔

''تم وقت کے ساتھ خاصی گھمنڈی نہیں ہو گئی ہو؟''

''تم شاید خود اعتماد اور خود شناس کہنا چاہتے ہو۔'' عمار نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسا انداز اس پہ بہت جچ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین

بھی ہو گئی تھی اور بااعتماد بھی۔ اسے واقعی یہی کہنا چاہیے تھا۔ عمار کی ہمیشہ کی فراٹے بھرتی زبان کو نجانے کیا ہوا جو سارے الفاظ بھول گئی تھی۔

"چلو پھر ملتے ہیں۔ اب تو ملنا جلنا رہے گا ہی۔" وہ اپنا بیگ کاندھے پہ منتقل کرتی پراعتماد سی چال چلتی آگے بڑھ گئی اور وہ اسے جاتے دیکھتا رہا۔

یہ اس کی عمار سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی کیونکہ اس کے بعد وہ جب بھی اسے نظر آیا، رباب نے اسے نظر انداز ہی کیا۔ بچپن کی اندھی محبت حالات کی سختی سے بینا ہو کر کملا گئی تھی اور ایسا نظر انداز ہونا عمار کو بڑا برا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

اس کا کالج میں دوسرا ماہ تھا جب لائبریری جاتے ہوئے اسے سیڑھیوں پہ ایک لمبے بالوں والا لڑکا ایک بلی کو گود میں لیے اسے پراٹھا کھلاتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔ اس کے بال شانوں سے بھی نیچے تک آتے تھے اور بے حد سلکی تھے۔ اس کے سلکی بالوں کے سامنے تو اس کے دن بہ دن بے رونق ہوتے بال کچھ بھی نہ تھے۔ چہرے پہ فرنچ داڑھی نہ ہوتی تو وہ گزرتے ہوئے یہی سمجھتی کہ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس کوئی لڑکی ہی ہے۔ وہ پل بھر کو ٹھٹکی اور پھر رک گئی۔ اسے پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی تھی گو کہ اس کا حلیہ خاصا بدل چکا تھا۔

وہ اسے چار سال پہلے شادی کے فنکشن میں عزتِ نفس کے سبق پڑھانے والا رافیل تھا جسے اس نے پھر دماغ سے محو نہیں ہونے دیا تھا، نہ اسے نہ ہی اس کے پڑھائے سبق کو اور یہ اس کا سبق ہی تھا جس نے اسے سر اٹھا کر جینا سکھایا تھا۔

"آپ تو وہی ہیں نا۔" بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ رافیل جو بلی کو کھلانے میں خاصا محو تھا مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم تو وہی ہو نا جلے دوپٹے والی؟"

شکر ہے اس نے دوپٹے کا حوالہ دیا تھا عمار کا نہیں۔ کبھی کبھار پرانے حوالے آپ موجودہ زندگی میں دہرانا نہیں چاہتے۔ عمار ایسا ہی حوالہ بن چکا تھا۔

"آپ نے پہچان لیا مجھے؟" وہ ایسے خوش ہوئی جیسے وہ رافیل نہیں، پرنس چارلس ہو۔

"یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔" وہ مسکرا دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ وہ پہلے سے بہت مختلف لگ رہا تھا۔ اتنے اسٹوڈنٹس میں اسے پہلی نظر میں گزرتے ہوئے پہچان لینا کمال ہی تو تھا اور یہ کمال رباب کامران نے کر دکھایا تھا۔

"آپ یہاں پڑھتے ہیں؟" عمار کے اس سوال پہ وہ اس کے سوال کے احمقانہ پن پہ ہنسی تھی، وہی سوال اس نے خود رافیل سے کر ڈالا تھا۔

"نہیں اس بلی کے لیے خاص آیا ہوں اسے پراٹھے کھلانے۔"

"آپ تو غالباً کسی اور شہر سے آئے تھے نا شادی اٹینڈ کرنے تو کیا اب یہاں ہاسٹل میں رہتے ہیں۔"

اسے اس کے بارے میں اتنا کچھ اتنی فرصت سے یاد تھا، رافیل کو اچھا لگا تھا۔ چار سال میں وہ بھی کبھی اسے بھولا نہیں تھا اور ایک ایک بات پوری جزئیات سے یاد تھی۔

"ہم لاہور ہی شفٹ ہو گئے ہیں۔ میری اور حرا کی پڑھائی کی وجہ سے ہمیں یہیں موو کرنا پڑا۔ تم شاید فرسٹ ایئر میں ہو۔" وہ اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر بولا تو رباب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں فورتھ ایئر میں ہوں۔" وہ چونکی تھی۔ رافیل بھی فورتھ ایئر میں ہی تھا۔ تو دونوں کلاس فیلوز تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے خاص عمار کا ذکر کرتے نہیں بتایا کہ اس کا عمار جو بہت اچھا اور معصوم تھا اسی کا کلاس فیلو ہے ورنہ وہ اپنی چار سال قبل کی حماقتوں کو یاد کر کے کتنی شرمندہ ہوتی۔

"فورتھ ایئر میں کیا ایسا فیشن کرنا لازم ہے؟" پہلے عمار اور اب وہ ایسے عجیب و غریب حلیے میں پھرتے پائے گئے تھے۔ وہ زبان کی نوک پہ آئے اس سوال کو روک نہیں سکی۔

"اشد ضروری۔" اس نے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتے جیسے پتے کی بات بتائی۔ رباب نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا لیکن وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو میں ادھر ہی ہوں۔ کبھی بھی یاد کر سکتی ہو۔" وہ اب بلی کو گود سے اتار چکا تھا۔

"اب میں اپنے مسئلے حل کرنا کافی حد تک سیکھ گئی ہوں۔" رافیل کو اچھا لگا تھا اس کی بات سن کر۔ جس انسان کو زندگی میں بہت سارے مسائل اور کم وسائل حاصل ہوں انہیں اپنے مسائل کو حل کرنے کی طاقت خود دکھانا چاہیے۔

اگلی بار اس نے ڈرامیٹک سوسائٹی کی جانب سے ایک ڈرامہ ایونٹ میں رافیل کو پرفارم کرتے دیکھا تو اسے اس کے حلیے کی اصل وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ وہ ایسا رومیو بنا کیوں گھوم پھر رہا تھا۔ اس کی پرفارمنس نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ وہ بھی اس کی اداکاری کی قائل ہو گئی تھی۔ وہ اتنا شان دار رومیو بنا تھا کہ اس کا دل تھوڑا چاہا کہ وہ جولیٹ بن کر گھومنے لگ جائے تاکہ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا چلا آئے۔

پھر اس نے خود ہی اپنا سر جھٹکا۔ جتنا 'عمار نامہ' وہ اس کے سامنے سنا چکی تھی اس سب کی کیا کوئی گنجائش بنتی تھی۔ اس نے خود کو سرزنش کی۔ قدم یہیں روک لینا بہتر تھا۔ ایونٹ کے بعد وہ اپنے سابقہ حلیے میں لوٹ آیا تھا لیکن عمار اسی طرح جلیبی بنا ہی گھومتا رہا تھا۔ اس کی بلا سے جو بھی بنا گھومے۔

☆☆☆

بھلے اس نے ایف ایس سی میں ٹاپ نہ کیا ہو لیکن فرسٹ ایئر میں اس نے یونیورسٹی میں پوزیشن لی تھی اور اس کی خاصی واہ واہ ہو گئی تھی۔ عمار خاص طور پر اس سے ملنے آیا تھا۔

"چلو اس بہانے مجھے تم پہ فخر کرنے کا موقع مل گیا کہ میری ایک عدد کزن ہے جو یونیورسٹی کی ٹاپر ہے وہ بھی میرے کالج میں۔"

"لیکن میں کس منہ سے سب کو بتاؤں کہ میرا کزن کالج کا ٹیٹوز بوائے ہے۔" رباب نے ناک سکوڑتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے دیکھا جہاں اس کے ہاتھوں پہ نئے ٹیٹو کا اضافہ ہوا تھا۔

"ویل! میں کافی سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔" وہ ڈھیٹ تھا اور اپنی ڈھٹائی پوری شان سے دکھا رہا تھا۔

"یوں وقت برباد کرنے کا مقصد؟" چار سال پہلے وہ یہ کہتا تو وہ خوشی سے ساری رات سو نہیں پاتی۔

"ہماری پوری فیملی میں بلکہ شاید سرکل میں بھی کوئی ایسا لائق فائق نہیں ہوگا۔" وہ پہلے کی طرح اس کا مذاق نہیں اڑا رہا تھا لیکن رباب کو پھر بھی ایسا ہی لگا تھا۔ اس نے شانے یوں اچکائے جیسے اسے اس سب کی پروا نہیں ہے۔ نہ وہ اس کے کامپلیمنٹ کو کوئی اہمیت دیتی ہے نہ اس کو۔

"تم پچھلے کئی سال سے گھر نہیں آئیں۔ میں گھر میں اکثر تمہارا تذکرہ کرتا ہوں۔ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں، تمہیں گھر آنا چاہیے۔" رباب نے اس کی بات کو یوں سنا جیسے ہوا میں اڑا دیا ہو۔ رباب کی ایسی بے نیازی عمار کو بے چین کر رہی تھی۔ اسے آج تک کسی لڑکی نے یوں نظر انداز نہیں کیا تھا جیسے وہ کر رہی تھی اور رباب کا یہی انداز اسے مزید اس کے گرد منڈلانے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"جو لوگ کسی کو گھر بلا کر عزت کرنا نہ جانتے ہوں، میں ان کے گھر جانا پسند نہیں کرتی۔" وہ گھاس پہ بکھری اپنی کتابوں کو سمیٹ کر بیگ میں ڈال رہی تھی۔

"بچپن تھا وہ جو گزر گیا۔ اب میں بدل گیا ہوں۔" رباب کے بیگ کی جانب بڑھتے ہاتھ وہیں تھم گئے۔

"صحیح کہا تم نے۔ بچپن تھا جو گزر گیا۔ میں بھی بدل گئی ہوں۔"

وہ اب بیگ بند کرتے ہوئے اٹھ چکی تھی۔ اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھی۔ بیگ اٹھا کر کاندھے پہ

ڈال رہی تھی۔ عمار وہیں گھاس پہ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے اگلے سال جب یونیورسٹی میں پوزیشن لی تو اسی دن بابا نے اسے کال کر کے بتایا تھا کہ انھوں نے تایا ابو سے ان کا گھر واپس لے لیا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے وہاں ان کی آواز بھیگ گئی تھی اور یہاں رباب کی آنکھیں۔

"آپ کو واپس آ جانا چاہیے بابا۔ اب آپ کی باہر رہ کر مشقت کرنے کی عمر نہیں ہے۔"

"ابھی تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہوئی بیٹا اور پھر مجھے تمہاری شادی بھی کرنا ہے۔"

شادی کی بات پہ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ بابا اس سے اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہ ٹھیک سے سن نہیں رہی تھی۔

ان ہی دنوں میں عمار ایک بار اس سے ملنے کالج آیا تھا۔ وہ شاید ہاسپٹل سے آ رہا تھا۔ اس کی ہاؤس جاب چل رہی تھی۔ اس کا پہلے والا حلیہ اب غائب ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک بہتر شکل کا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ کافی مہذب اور ڈیسنٹ ہو چکا تھا۔

"میں آج تم سے دوٹوک بات کرنے آیا ہوں۔ میں پاپا سے تمہارے لیے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ کر لوں نا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

رباب کو اس کی بات سے کوئی اتنا تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس کو پہلے بھی عمار کے انداز و اطوار دیکھ کر کچھ اندازہ تھا اس کی اپنے لیے پسندیدگی کا۔

"اس سے پہلے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

وہ عمار کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ اس گھر کے مکینوں میں کتنا بدلاؤ آیا ہے۔ کیا وہ اب بھی اسے عزت دیتے ہیں یا آج بھی اس کا مقام وہی ہے۔

عمار اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتری تو سامنے لان تک اس کی نظریں گئی تھیں۔ وہاں پہ موجود سوئمنگ پول سے اسے عمار کا دھکا دینا یاد آ گیا تھا۔ اس نے نظریں واپس موڑ لی تھیں۔ عمار اسے اندر چلنے کے لیے رستہ دے رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی اندر ہال میں آئی تھی۔ گھر کی آرائش خاصی بدل چکی تھی جو کہ تائی امی کی عادت تھی کہ وہ گھر کا انٹیریر بدلتی رہتی تھیں، فرنیچر بھی ہر سال تبدیل کرتی تھیں۔ بس ایک ان کے مزاج اور رویے تھے جو کبھی نہیں بدلتے تھے۔ اسی رویے کو۔ جانچنے وہ وہاں آئی تھی۔

"تم بیٹھو، میں چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ اسے ہال میں بٹھا کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

ایک نوکر آ کر اسے جوس سرو کر گیا تھا۔ دس منٹ گزر چکے تھے لیکن کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ شاید گھر پہ کوئی نہیں تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے ایسے وقت میں گھر لے آیا تھا جب گھر پہ کوئی نہیں تھا۔

"تم اکیلی بیٹھی ہو ابھی تک۔ ماما نہیں آئیں؟"

بیس منٹ بعد عمار لوٹا تو کچھ حیران ہوا۔ اس نے شانے اچکا دیے۔ عمار وہیں سے تائی امی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ کچھ دیر میں اندر سے بلند ہوتی آوازیں اس کے کانوں سے بھی ٹکرائی تھیں۔

"وہ ہماری مہمان ہے ماما۔"

"ہماری نہیں تمہاری۔ اور میں اچھی طرح سے سمجھ رہی ہوں، تم کیا چاہ رہے ہو۔" تائی امی کی آواز عمار کے خاموش کروانے کے باوجود بھی نیچی نہیں ہوئی تھی۔

"تو اس میں کیا غلط ہے؟ وہ اس گھر کا حصہ ہے، چاچو کی بیٹی ہے، کزن ہے میری، ڈاکٹر بن رہی ہے۔"

"اس کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ ڈاکٹر بننے سے اس میں سرخاب کے پر نہیں لگ جائیں گے۔ پتھر اٹھاؤ تو نیچے سے ایک ڈاکٹر نکلتی ہے۔ اس جیسی کروڑ ڈاکٹرز کی لائن لگا سکتی ہوں میں جو اس سے کہیں زیادہ عالی شان بیگ

گراؤنڈ کی مالک ہوں گی۔ پھر ہمارے ٹکڑوں پہ پلنے والی اس لڑکی میں ایسا کیا ہے جو تم اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہو۔ تم اس لڑکی پہ اپنے کزنز کے ساتھ شرط لگاتے اچھے لگتے ہو عمار، دل لگاتے نہیں۔"

اس سے زیادہ وہ اپنی تذلیل نہیں سہ سکتی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنا بیگ اٹھاتے باہر نکل آئی تھی۔ چوکیدار کو جاتے ہوئے بس اتنا کہہ گئی تھی۔

"عمار صاحب سے کہنا ہے کہ میں جا رہی ہوں۔" یہاں سے اسے ٹیکسی نہیں ملنی تھی اسی لیے وہ پیدل چل کر مین روڈ کی طرف نکل آئی تھی۔

نورا نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر کسی کی قابلیت دیکھ کر اسے بہو بنایا جاتا تو تمام قابل لڑکیاں بڑے گھروں کی بہوئیں ہوتیں۔ اس وقت وہ اپنی کم عمری کی بدولت یہ بات نہیں سمجھی تھی لیکن اب بخوبی سمجھ رہی تھی۔

تایا ابو کے گھر ہمیشہ اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا، تذلیل کی جاتی تھی۔ آج بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ چار سال بعد تو کیا چالیس سال بعد بھی اس گھر میں قدم رکھتی تو بھی اس سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا کیونکہ وہ بھی ان کے اسٹیٹس کو چھو نہیں سکتی تھی اور ان کا اسٹیٹس سے نیچے آنا ممکن نہیں تھا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ آسمان کبھی زمین سے جا ملا ہے کیا؟ اس نے کبھی ایسا سوچا تھا تو غلط سوچا تھا۔ اچھا ہوا کہ جو آج وہ یہاں چلی آئی تھی، کم از کم کہیں کوئی ہلکی سی بھی چاہ تھی تو اب باقی نہیں رہی تھی۔

مین روڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی عمار کی گاڑی اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس سے کیا پوچھتا کہ وہ وہاں سے کیوں چلی آئی ہے جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی اور ماما کی ساری باتیں سن کر ہی وہاں سے نکلی ہوگی۔

جس عزت کو ماپنے وہ وہاں آئی تھی اس کا پیمانہ آج بھی اس گھر میں اس کے لیے وہی تھا جہاں چار سال پہلے تھا۔ وہ جہاں بھی رہنا چاہتی تھی عزت اور وقار کو بلند رکھتے ہوئے رہنا چاہتی تھی ورنہ اسے وہاں رہنا ہی نہیں تھا۔

"آئی ایم ریلی سوری رباب۔ پلیز گاڑی میں بیٹھو یار۔" وہ گاڑی سے اتر کر ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا عمار! کہ ایسا نہ ہو کہ جب تم مجھ سے محبت کر بیٹھو تو میں اپنا ارادہ بدل لوں۔ تو سمجھو بدل لیا ارادہ۔"

"ایسے مت کہو رباب! میں پاپا سے بات کروں گا۔ وہ ماما کو منا لیں گے۔" رباب استہزائیہ مسکرائی۔

"جس گھر میں مجھے عزت سے لے جایا نہیں جائے گا وہاں مجھے عزت سے کیسے بسایا جائے گا؟ اور میں ایمان رکھتی ہوں کہ انسان ہر چیز کے بنا رہ لے لیکن عزت کے بنا نہ رہے۔ اس سے بہتر موت ہے اور مجھے تمہارے گھر میں موت نہیں چاہیے۔"

وہ اتنا سختی سے دو ٹوک بولی تھی کہ عمار بالکل ساکت رہ گیا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اب تو کیا کبھی بھی نہیں مانے گی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ تائی امی کو کیا مناتا، وہ تو تایا ابو تک کو نہیں منا سکا تھا اور یہ سب اسے نورا سے پتا چلا تھا۔ اسے لے کر عمار اور تایا ابو کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ تایا ابو نے بابا کو کال کر کے کھری کھری سنائی تھیں کہ وہ اپنی بیٹی کو سنبھال لیں جو ان کے بیٹے کو قابو کرنے کے چکروں میں ہے۔

اس نے خود بابا کو کال کر کے دو ٹوک بتا دیا تھا۔

"میں مر کر بھی عمار سے شادی نہیں کروں گی بابا! آپ تایا ابو کو بتا دیں کہ میں ان کے بیٹے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔"

ہر لڑکی کا ایک نسوانی پندار ہوتا ہے قائم رکھنے کے لیے اسے ہر قربانی دے دینا چاہیے۔

☆☆☆

وہ پورا سال اس ایک چہرے کو سب چہروں میں تلاش کرتی رہی تھی۔ وہ بھلا اب یہاں سے جانے کے بعد یہاں کیوں آتا۔ کس کے لیے آتا؟ اس کے لیے جس نے عمار سے محبت کا ایسا برملا اظہار اس سے کیا تھا؟ اسے کیا پڑی تھی ایسی لڑکی کے لیے آنے کی جو کسی دوسرے لڑکے کے لیے سو سو آنسو بہاتی رہی تھی۔ کاش کہ وہ ایک بار آجاتا تو وہ اسے

بتاتی کہ وہ لڑکا اب اس کے لیے ہزار آنسو بھی بہا دے تو بھی وہ اس کے لیے اپنی آنکھیں گیلی نہیں کرے گی۔ وہ عزت کو اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہے، موت اسے پسند نہیں کیونکہ زندگی سے اسے پیار ہے۔

اس کا فائنل ائیر تھا جب کالج بس کی طرف جاتے ہوئے اسے پارکنگ میں رافیل دکھائی دیا تھا۔ اپنی بائیک سے ٹیک لگائے، ہیلمٹ ہاتھ میں تھامے وہ کسی جونیئر سے بات کرتے ہوئے پہلے کی نسبت اور بھی ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ اسے گیٹ کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ سامنے کھڑے لڑکے سے معذرت کر کے اس کی طرف آیا تھا۔

''رباب۔'' اپنا نام سن کر وہ رکی تھی۔

''کیسی ہو؟ سنا ہے بڑا ٹاپ شاپ کرتی آ رہی ہیں جناب۔ ویسے مہندی کے اس فنکشن میں دیکھ کر مجھے کبھی لگا نہیں تھا کہ تم اتنی لائق فائق ہوگی۔'' سلام کرنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے جتایا کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد بھی اس سے بے خبر نہیں رہا۔

''آپ یقیناً یہاں میرا حال چال پوچھنے نہیں آئے ہوں گے، نہ ہی بلی کو پراٹھے کھلانے آئے ہوں گے اور کسی ڈرامے میں رومیو بننے تو بالکل بھی نہیں۔''

''بالکل بالکل۔ کیونکہ اب میں چاہتا ہوں کہ ایک بلی مجھے پراٹھے کھلائے اور کسی ڈرامے کے بجائے میں کسی کی زندگی کا رومیو بن جاؤں۔ ویسے خیر سے میں نے پارٹ ون کلیئر کر لیا ہے، کل کو پارٹ ٹو بھی کلیئر کر لوں گا تو بہت شاندار نہیں لیکن ایک اچھا سرجن بن جاؤں گا۔ اچھا کما لوں گا۔ ایک عدد بائیک میں خرید چکا ہوں۔ گاڑی بھی خرید ہی لوں گا۔ اوہ ہاں بابا نے ہمارا گوجر خان والا گھر بیچ کر یہیں لاہور میں ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا ہے۔ ابھی تو نہیں لیکن آج سے بیس تیس سال بعد میں بڑا گھر بنا لوں گا۔ تو کیا لگتا ہے آپ کو کہ جولیٹ مان جائے گی؟''

رباب ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

''عمار جیسا پیارا نہیں ہوں نہ ہی امیر ہوں لیکن میں کبھی کسی کی تضحیک نہیں کرتا، نہ ہی کسی کو رلاتا ہوں اور کسی لڑکی کے دوپٹے کو تو بالکل نہیں جلاتا۔ ہاں اچھا سا بھاشن دے کر دو لوگوں میں آگ ضرور لگا سکتا ہوں۔'' رباب پھیکا سا مسکرا دی تھی۔

''عمار بچپن کی ایک غلطی تھی جسے وقت نے سدھار دیا۔ کچی عمر کی لڑکیاں ایسی غلطیاں کرتی رہتی ہیں۔ مجھ سے بھی ایک واحد غلطی ہو گئی جو بچپن گزرنے پہ دور بھی ہو گئی۔''

اتنے سالوں کے بعد اس کے منہ سے عمار کا ذکر سن کر اسے نئے سرے سے شرمندگی ہوئی تھی۔

''میں تمہیں ہرگز شرمندہ نہیں کرنا چاہتا رباب۔ بس اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اپنی عزت کروانا جانتا ہوں تو دوسرے کو بھی عزت دینا جانتا ہوں۔ عزت سے اباامی کو تمہارے گھر بھیجوں گا اور بہت عزت سے ہمیشہ تمہیں اپنے گھر میں رکھوں گا۔ اور جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو رومیو کو جولیٹ سے دیر سویر محبت ہو ہی جاتی ہے۔''

رباب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں رقم سوال وہ پڑھ چکی تھی۔

''جولیٹ بننا ہے یا نہیں میں اس بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔'' وہ مڑ گئی تھی۔ بس نکلنے والی تھی اور اگر بس مس کر دیتی تو لوکل آنے جانے کی دقت اٹھانا پڑتی۔

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

اس نے پیچھے سے آواز لگائی تو رباب بے ساختہ مسکرا دی تھی۔ جولیٹ تو وہ کب سے اسی رومیو کی بننا چاہتی تھی بس تھوڑا سا نخرہ تو دکھانا تھا۔ اب دو ہزار اکیس کی جولیٹ یوں تو نہیں مان جایا کرتی۔ سمجھا کریں نا۔

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

حنا بُشریٰ

ناولٹ

"حد ہوتی ہے بے حسی اور کام چوری کی۔"

گھر کے کشادہ صحن میں مجرموں کی طرح گردنیں جھکائے کھڑی وہ چاروں خوف زدہ سی نظر آ رہی تھیں۔ چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ شاید کوئی وضاحت تھی ان کے پاس۔ مگر سامنے کھڑا شخص غیض وغضب انڈیلتا انہیں کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا بلکہ بولے چلے جا رہا تھا۔

"چار...... چار عورتیں......"

غصے میں سرخ ابلتی آنکھوں سے تیر برساتے ہوئے انہوں نے چار مجرموں کو نہ صرف دیکھا بلکہ اپنی چار انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے انہیں مزید شرمندہ کرنے کی سعی کی، جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔

"چار...... چار عورتیں جس گھر میں موجود ہوں، پھر بھی وہاں بدنظمی کا یہ عالم۔"

نہ جانے چاروں سے کیا قصور سرزد ہو گیا تھا کہ مقابل کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ ان سب کو احساس دلایا جائے کہ وہ کس قدر بدسلیقہ، پھوہڑ اور بے حسی کا مجسم پیکر ہیں۔"

"ابو! میں نے خود دی تھی صبح پھپھو کو چائے۔"

چاروں میں سے ایک لرزتی، گھبرائی آواز ابھری۔ جس میں دبا دبا سا احتجاج تھا۔ شاید وہ خود کو روک نہ پائی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ شاید ہمت کر کے لب ہلا لینے سے باقی سب کی جان بخشی بھی ہو جائے۔ یہ بات تو واضح ہوئی کہ شکر دو پہر یہ عدالت چائے کی ایک عدد پیالی پہ لگائی گئی ہے۔

"ہا...... کب......؟" ایک آواز ابھری جس میں ہوشیاری اور چالاکی کا عنصر نمایاں تھا۔ چہرے کے مصنوعی تاثرات اور عینک کے عدسوں سے جھانکتی آنکھوں سے واضح تھا کہ یہ سب سوائے "ناٹک" کے اور کچھ نہیں تھا۔

"یا اللہ! اتنا بڑا جھوٹ...... ہائے میں مرگئی۔"
پتا نہیں وہ سچ مچ رو رہی تھیں یا یہ بھی ناٹک تھا وہ بھی شاندار کہ لمحہ بھر کے لیے سب سامعین و حاضرین کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

"یا الٰہی! اتنا سفید جھوٹ۔ وہ بھی تیرے رزق کی بات پہ۔" دونوں ہاتھوں کو جوڑتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دہائی دی۔ کمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اب اپنے سفید ململ کے کروشیے والے دوپٹے سے اپنی ناک اور آنکھیں رگڑ رہی تھیں۔ ان کے رونے نے ماحول کو عجیب سا کر دیا تھا کہ ہر کوئی خاموشی سے یہ ڈرامہ ملاحظہ کر رہا تھا۔

"یا اللہ! مجھے تو موت آجائے۔ اگر میں تیرے رزق کی بات پر جھوٹ بولوں۔"

یہ ان خاتون کا تکیہ کلام تھا۔ یہاں کوئی بات ہوئی، وہاں فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہائیاں دینے لگ جاتیں اور اس میں یہ جملہ تو سرفہرست ہوتا کہ "یا اللہ مجھے موت دے دے" اور تقریباً دن میں یہ جملہ کوئی پانچ سے چھ بار تو لازمی استعمال کیا جاتا۔

"اللہ نہ کرے بلی! کیسی باتیں کر رہی ہو؟"
کسی کے دل پر ہاتھ پڑا تھا ان کی بات کو سن کر۔ وہ تڑپ کر بولے۔ وہ اس گھر کے سربراہ نورالامین تھے اور بلی کے ہمدرد و غم گسار بھی۔ اب نورالامین منہ کھول کر پوری نفرت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ "موت آئے تمہارے دشمنوں کو" کیونکہ سامنے کھڑے "مجرموں" کے ساتھ ان کا رشتہ تھا وہ بھی خون کا۔ وہ تینوں ان کی بیٹیاں تھیں اور چوتھی ان کی بیوی، اگر نورالامین کو اس بات کا لحاظ نہ ہوتا تو یقیناً اپنی چہیتی بلی کو چائے نہ دینے کے گناہ پر ان دشمنوں کو جھولیاں بھر بھر کے بددعائیں دینے سے بھی گریز نہ کرتے۔

نورالامین اپنی بہن پر جان چھڑکتے تھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی جان بلی میں تھی۔

"تو اور کیا کہوں بھائی صاحب!"
خود کو کوستے بلی نے اپنا نصف چہرہ ململ کے سفید دوپٹے میں جس کے کناروں پہ خوب بھر کے کروشیہ ہوا تھا۔ چھپا کے زاروقطار رونا شروع کر دیا تو بھائی جان کی تو جیسے جان پر بن گئی۔ دل کٹنے لگا، کرب اور شدید غصے کی لہریں ان کے سرخ چہرے پر نمودار ہونے لگیں۔ وہ تو اپنی لاڈلی بہن کی آنکھ میں ایک آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ تو پھر بہت "سارے" تھے۔ وہ تو یوں بلک بلک کر رو رہی تھیں کہ جیسے اس گھر کے مکینوں نے انہیں شدید اذیت پہنچائی ہے "چائے سے محروم" رکھ کے اور اس اذیت کا نہ اب کوئی کنارہ ہے اور نہ ہی تلافی۔ وہ اذیت جس نے بلی پھپھو کو زاروقطار رلا ڈالا تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ مگرمچھ کا بھی نہیں۔ اسی چیز کو پردے میں رکھنے کے لیے بلی پھپھو نے اپنا چہرہ ململ کے دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ بس اونچی آواز نکالتی، رو رو کے خود کو ہلکان کیے جارہی تھیں اور یہ آوازیں بھائی صاحب کے دل کو آرے کی طرح چیر رہی تھیں۔ ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا جارہا تھا اور وہ چار مجرم عورتیں، جن میں ایک ان کی بیوی رضیہ۔ اور باقی تینوں اسماء، بسمہ اور آسیہ ان کی بیٹیاں۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنی اکلوتی پھپھو کو تکے جارہی تھیں، ایک چائے کی پیالی نہ ملنے پر انہوں نے گھر میں عدالت لگوا ڈالی تھی۔ ان تینوں لڑکیوں کے چہروں پر بلا کا غصہ اور ناگواری تھی مگر خاموش رہنا ان کی مجبوری تھی۔ ویسے بھی بولنے کا فائدہ کچھ نہ تھا — جبکہ رضیہ کی حالت ایسی تھی کہ دروازے کے پٹ کے ساتھ لگی آنسو بہائے جارہی تھیں مگر ان کے آنسوؤں کی کسی کو پروا نہ تھی۔

"شرم نہیں آتی تم لوگوں کو، اپنی پھپھو کو جھٹلاتے ہوئے؟"

اور پھر نورالامین کی وہ گھن گرج شروع ہوئی کہ آسمان پر چھائے سیاہ بادل بھی اس گرج پر سہم کے رہ گئے۔ ان سب کی آنکھیں سچ مچ کے آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ ان آنسوؤں میں دکھ کی آمیزش تھی۔ نورالامین اپنی بہن کی وجہ سے ہمیشہ ہی ان کے ساتھ

ایسا سلوک کر جایا کرتے تھے۔ ببلی پھپھو کو یہ منظر بے حد لطف دے رہا تھا۔ دوپٹا بہانے بہانے سے مگر کمال احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آنکھوں کے آگے سے ہٹاتے وہ اس منظر کو دیکھ کر خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

ان چاروں مجرموں کا جرم یہ تھا کہ ان کام چور، بدسلیقہ اور پھوہڑ لڑکیوں نے اپنی پھپھو بلقیس عرف ببلی کو ناشتے میں چائے سے محروم رکھا تھا اور ببلی پھپھو کے مطابق ان کی اس حرکت کا مقصد صرف اور صرف انہیں اذیت پہنچانا تھا جبکہ ان مجرموں کا کہنا تھا کہ ببلی پھپھو بھول گئی ہیں انہوں نے دو ڈھائی پیالیاں گرما گرم چائے کی صبح ناشتے میں ان کے سامنے پی تھیں۔ جس کی وہ سب چشم دید گواہ تھیں مگر ببلی پھپھو نے اس کو جھوٹ پر مبنی الزام قرار دیتے ہوئے مقدمہ نور الامین کی عدالت میں پیش کر دیا تو بغیر تحقیق اور تصدیق کے وہ سنی سنائی کے پیچھے لگ کر ان سب پر برس پڑے۔ وہ سب اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہ گئیں مگر نور الامین کو ان کی کسی بات پر یقین نہ آیا۔ ان کے مطابق اگر کوئی سچا تھا تو صرف اور صرف ببلی پھپھو...... باقی سب جھوٹے، مکار اور کام چور تھے۔ جن کی سرغنہ رضیہ (نور الامین کی بیوی) تھی۔ جس نے غلط تربیت کر کے اولاد کو جھوٹا، مکار اور کام چور بنا دیا تھا اور رضیہ ہر غلط کام میں پورے جی جان کے ساتھ اپنی بیٹیوں کی پشت پناہی کیا کرتی تھی۔

یہ نور الامین کی سوچ تھی۔ گزرتے وقت اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کی یہ سوچ پختہ ہو گئی تھی۔ اس سوچ کو مضبوطی عطا کرنے میں ان کی لاڈلی بہن ببلی کا ہاتھ تھا۔ جو پچاس کی ہو کر بھی ببلی تھیں۔ اور یقیناً زندگی کی آخری سانس تک ببلی ہی رہنا تھا۔ ان کے ببلی ہونے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ پانچ بھائیوں کی وہ اکلوتی ببلی...... مطلب بہن تھیں۔ بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئیں تو پانچوں بھائیوں کے ہاتھ جیسے چینی کی گڑیا آ گئی۔ وہ سب ببلی کے دیوانے تھے۔ اور اپنی محبت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی اس کے لیے کچھ لاتا تو کوئی کچھ۔ ان سب کی محبتیں اپنی جگہ مگر سب سے بڑے بھائی نور الامین کی محبت تو ایسی تھی کہ جیسے باپ کی محبت اولاد کے لیے۔

وہ ببلی کو بے حد چاہتے تھے۔ ذرا سی بات پر ببلی کی نوک جھونک کسی بھائی سے ہوئی اور غصے میں آ کر بھائی — اپنا بڑا پن دکھاتے ہوئے ببلی کی پونی کھینچنے کی جرأت کر لیتا تو گھر میں وہ چیخ و پکار مچائی جاتی کہ الامان الحفیظ۔ پہلے چھوٹے بھائی کی خوب دھلائی ہوتی، کبھی تھپڑوں سے تو کبھی گھونسوں سے اور پھر بھی دل کو قرار نہ آتا تو گھر کے بڑوں کو ''ظلم'' کی داستان جو ببلی پہ توڑا گیا تھا۔ خوب مسالا لگا کر سنائی جاتی اور مخالف کو مزید ڈانٹ کے ساتھ ایک آدھ ''تھپڑ'' بھی لگوایا جاتا تو دل بے اطمینان کو اطمینان نصیب ہوتا۔ یہ سب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مخالف کو اگلی دفعہ یاد رہے کہ ''کس سے جھگڑا مول لیا ہے......'' اور یہ سب کر لینے کے بعد —— اپنی لاڈلی ببلی کے لیے ڈھیروں چاکلیٹ، گولیاں اور ٹافیاں بھی لائی جاتیں۔ وہ بھی ساری ببلی کے نام کی مثلاً......

ببلی کینڈی......

ببلی چیونگم......

ببلی چاکلیٹ......

اور ان سب کو دیکھ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر، بھا بھا کرتی ببلی سب کچھ بھول کر کھانے میں مشغول ہو جاتی مگر نور الامین کچھ نہ بھولتے۔ وہ تو دل میں اس بھائی کے خلاف محاذ کھول لیتے کہ......

''آئندہ میری ببلی کو کسی نے انگلی بھی لگائی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

☆☆☆

''دوپہر ہو چلی ہے اور ایک انسان کو ناشتہ بھی تم لوگوں نے مکمل نہیں دیا۔''

نور الامین کا پارہ تو جیسے اترنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ان کے مطابق یہ ظلم کی انتہا تھی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا اور ان کی لاڈلی، مظلوم بہن کو ابھی ڈھنگ سے ناشتہ ہی نہیں دیا گیا تھا۔ کس قدر بے حسی

تھی، کس قدر اذیت پسندی تھی۔ ظلم کی انتہا تھی۔

"رضیہ اگر یہ سب کچھ دودھ بچانے کی مکاریاں ہیں تو تم میرے حصے کا دودھ بلی کے لیے رکھ دیا کرو۔"

وہ بچپن والی جانثاری، ایثار اور قربانی نور الامین کی آج بھی قائم تھی۔ وہ اکثر اپنے حصے کی چیز بلی کے لیے چھوڑ دیا کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے منہ کا نوالہ بھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس محبت اور قربانی میں اتنی شدت آ گئی تھی کہ نور الامین کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ ان کی بیوی رضیہ بھی بلی کے لیے بالکل ایسے ہی جذبات و احساسات رکھے۔ انہوں نے پہلے روز ہی اپنی زندگی میں، اپنے گھر میں اور اپنے دل میں بلی کی اہمیت و مقام باور کروا دیا تھا۔

"یہ بہن نہیں...... میری بیٹی ہے۔" نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے نور الامین بڑے جوش و خروش سے "تذکرۂ بلی" چھیڑے ہوئے تھے۔

"مجھے خوش رکھنا چاہتی ہو تو اسے بیٹیوں کی طرح عزیز رکھنا۔"

"بلی کو دودھ دے دیا؟" یہ پہلا عمل تھا۔

نور الامین رات کو دودھ لازمی پیا کرتے تھے مگر انہوں نے تاکید کی تھی کہ پہلے ایک عدد گلاس بلی کے کمرے میں پہنچایا جائے اور ہر روز صبح خود کمرے میں جا کر خالی گلاس دیکھ کر انہیں یقین آتا کہ رضیہ نے ان کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

"بلی کو کالج کے لیے لنچ لازمی دیا کرو۔ پڑھنے والی بچی ہے، بھوک لگ جاتی ہوگی۔"

نہ صرف لنچ کی تاکید کی جاتی بلکہ روز دو ڈھائی سو روپے لازمی بلی کو تھمائے جاتے۔ کئی دفعہ تو رضیہ حیران سی رہ جاتی کہ بلی کوئی اسکول کی بچی نہیں تھی جو اسکول میں لنچ لازمی کرتی ہو۔ وہ گریجویشن کر رہی تھی اور پیسے بھی ضرور ملتے تھے۔ اسی حیرت کا اظہار دبے دبے الفاظ میں کیا۔

"بہت تنگ دل ہو رضیہ!"

رضیہ کی وہ شامت آئی کہ وہ آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ نور الامین کے ناشتے کے ساتھ بلی کا لنچ بھی اسے تھما دیتی۔ مگر اکثر بچا ہوا باسی لنچ "چھان بورے" میں ڈال دیتی کیونکہ رضیہ جانتی تھی کہ کالج کے نان چنے، برگر، دہی بھلے، فرنچ فرائز اور کوک کے سامنے کس کم بخت کا دل اس عام سے لنچ کو چاہتا تھا مگر رضیہ نے دوبارہ کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا۔ جانتی تھی بلی کے معاملے میں نور الامین نہ کچھ سننا چاہتے ہیں اور نہ ہی سمجھنا۔

"لنچ کر لیا تھا میرے بیٹے نے کالج میں۔" نور الامین فرط جذبات میں بلی کو بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔

"جی بھیا! کھا تو لیا تھا مگر......"

"مگر......" یہ مگر تو نور الامین کے دل میں سوئی کی طرح چبھ جایا کرتا تھا کہ رضیہ کی کہیں کوئی غلطی نکلے اور وہ چوٹی سے پکڑ کر اسے باہر کریں۔

"بھیا! رضیہ بھابھی سے کہیں کہ کچھ بدل کر بھی دے دیا کریں۔ روز انڈا پراٹھا۔"

مطلب کہ یہ روز صحت بخش لنچ جو بلی کھاتی نہیں تھی بلکہ ضائع کرتی تھی اسے کھائے بغیر ہی دل اوب گیا تھا اور دل تبدیلی کا خواہاں تھا اور تبدیلی بھی عام نوعیت کی نہیں تھی، پورا انقلاب تھا۔

چائنیز رائس، پراٹھا رول، اسپگیٹی، ہر چیز میں چکن وافر مقدار میں ہو۔

یہ تھا بلی کا نیو مینو، جس کی تکمیل پر نور الامین نے بیوی کو ڈرا دھمکا کر مستعد کر کے دم لیا تھا۔ وہ الگ بات کہ ایک ہفتے کے بعد ہی بلی اس تبدیلی سے بھی تنگ آ گئی تھی۔ اب بھائی کو یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ بھئی مجھ سے نہیں بچوں کی طرح لنچ کیا جاتا۔ مجھے تو کالج کی ہوا لگ گئی ہے۔ مگر اب بھلا کچھ بول کر برا تھوڑی بننا تھا۔ اس کے لیے رضیہ بھابھی جو تھیں، جنہیں دونوں بہن بھائی مل کر روز برا بناتے رہتے تھے۔

پھر ایک روز انکشاف ہوا کہ بلی کالج کی ماسی کو وہ لنچ فراخ دلی سے دے کر اپنی جان چھڑا لیتی تھی، اب نور الامین کو کون سمجھاتا کہ...... "بلی اب لنچ والی بچی نہیں رہی"۔

نہ جانے کب تک چائے کی پیالی پر رضیہ اور ان

کی بیٹیوں کی شامت آتی رہتی کہ اگر نورالامین کا اکلوتا سپوت طلحہ آ کر چشم دید گواہ نہ بنتا۔

"ابو! بلی پھپھو نے صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کیا تھا۔ سبز چائے کے ڈھائی کپ پیے۔ دو عدد گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ سبزی آملیٹ بھی۔" طلحہ کے گواہی دینے پر جہاں ماں بہنوں کی خلاصی ہوئی، وہیں بلی پھپھو کھسیانی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ بھائی نے حیرت سے دیکھا تو بتانا پڑا۔

"بھیا! شاید میں بھول گئی تھی۔" بظاہر مسکراتے ہوئے بتایا تھا مگر دل بالکل جلے ہوئے کباب جیسا ہو رہا تھا کہ کتنا مزا آ رہا تھا بھابی اور بھتیجیوں کی "مرمت" بھیا کے ہاتھوں دیکھ کر۔ طلحہ نے خواہ مخواہ آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔ آ گیا ماں کا چمچہ اونہہ...... بلی دل میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی بلی پھپھو پچھلے دو گھنٹے سے پوری دل جمعی اور تندہی کے ساتھ محلے سے آئی لڑکی (جو کشیدہ کاری میں ماہر تھی) سے سندھی ٹانکا سیکھنے میں مصروف تھیں نہ صرف خود بلکہ اپنی بیٹی عندلیب کو زبردستی پاس بٹھایا ہوا تھا۔ ہر ٹانکے پر بہت دل و جان سے توجہ دیتی بلی پھپھو گرد و پیش سے بے گانہ تھیں۔

"اے عندلیب! یہاں ذرا غور کرنا، کیسے ٹانکا بھرنا ہے۔" کبھی عینک کو آنکھوں پر ٹکاتے ہوئے، کبھی اتارتے ہوئے بس بلی پھپھو آج عزم باندھے ہوئے تھیں کہ نہ صرف خود سندھی ٹانکا سیکھ کر ہی یہاں سے اٹھیں گی بلکہ عندلیب کو بھی سکھا کر دم لیں گی۔

سندھی کڑھائی بلی پھپھو کی بڑی پسندیدہ تھی۔ بہت بار سیکھنے کی کوشش کی مگر کسی نہ کسی وجہ سے نہ سیکھ پائیں۔ آج محلے کی لڑکی اس میں ماہر نظر آئی تو اس کے سر ہو گئیں کہ انہیں اور ان کی بیٹی کو یہ ٹانکا سکھائے تاکہ عندلیب سیکھ کر ایک قمیص اپنی اور ایک دوپٹا بلی پھپھو کے لیے بھی تیار کر دے گی۔ اس مقصد کے لیے کپڑا نورالامین نے بڑی فراخ دلی سے بہن اور بھانجی کو لا کر دیا تھا۔ بس ٹانکا سیکھنے کی دیر تھی۔

"امی! میں ذرا رضیہ ممانی کے ساتھ کچن دیکھ لوں۔" ہر پندرہ منٹ بعد عندلیب یہ کہتے ہوئے خاصی بے زار نظر آ رہی تھی۔ یوں جیسے اس کا کشیدہ کاری کی طرف بالکل دھیان نہیں مگر ماں نے زبردستی پلو سے باندھ کر بٹھا رکھا تھا کہ ہر صورت یہ ٹانکا سیکھے اور ماں کو بھی سکھائے۔

جبکہ اس کی بے چین نظریں بار بار کچن میں کام کرتی رضیہ کی جانب اٹھ جاتی تھیں جو نجانے کتنے گھنٹوں سے سخت گرمی کے باوجود کام میں لگی تھیں۔

"اے، چپ کر کے بیٹھ۔"

خاموش طبع اور ڈرپوک سی عندلیب ہر بار ماں کی جھڑکی پر سہم جاتی اور نظریں کشیدہ کاری کے فریم پر لگا دیتی۔ مگر دھیان کا پرندہ اڑ کر باورچی خانے کی کھڑکی کی طرف چلا جاتا۔ جہاں سے اندر کا منظر واضح تھا۔ عندلیب نے صبح ہی رضیہ ممانی سے کہہ دیا تھا کہ دوپہر میں روٹی وہ بنائے گی۔ ایک تو جون کا مہینہ تھا۔ گرمی زوروں پر تھی۔ صبح کے ناشتے کی ڈیوٹی اسماء اور آسیہ کی تھی۔ دوپہر کا کھانا رضیہ بنایا کرتی تھیں جس میں دونوں بیٹیاں مددگار ہوتی تھیں۔ بسمہ کالج جاتی تھی۔ رات کو اس کی ڈیوٹی تھی برتن دھونا، کچن سمیٹنا اور روٹیاں بنانا۔ رضیہ خود بھی سگھڑ اور سلیقہ مند عورت تھیں اور بیٹیوں کو بھی اس کام میں طاق کر رکھا تھا۔ جبکہ بلی کی رائے کے مطابق ماں بیٹیاں پھوہڑپن کا اعلا نمونہ تھیں۔ انہیں لگتا ان کے کام میں کوئی طریقہ سلیقہ نہیں۔

"امی! میں ذرا باورچی خانے کا ایک چکر......"

عندلیب کا جملہ ماں کی جھڑکی سے ادھورا رہ گیا تھا۔

"جس کام کے لیے میں نے تجھے بٹھایا ہے وہ کر دھیان سے۔" ایک کٹیلی گھوری بیٹی پر ڈالتے ہوئے بلی پھپھو نے دوسری خونخوار گھوری کچن کی کھڑکی کی طرف ڈالی تھی جہاں سے رضیہ نظر آ رہی تھیں۔ عرق آلود پیشانی کو پونچھتے ہوئے وہ بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ان کا گھر ہے، کام بھی وہ کریں۔"

بلی نے سفاکی سے کہتے ہوئے دوبارہ سے

نظریں فریم کی جانب لگا دیں۔ ماں کی بات سن کر عندلیب دل ہی دل میں مغموم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے آسیہ اور رضیہ ممانی سے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس نے خود کہا تھا کہ آج روٹیاں وہ ہی بنائے گی اور سالن بنانے میں بھی مدد کرے گی۔ مگر ماں کے حکم پر وہ یہاں کڑھائی سیکھنے بیٹھی تھی۔ سوچ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ دونوں اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں گی کہ کام سے بچنے کے لیے کڑھائی کے بہانے بیٹھ گئی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ماں بیٹی کبھی بھی اسے یہ بات نہیں جتائیں گی۔

”بھلے امی گھر ان کا ہے مگر کھانا تو ہم نے بھی کھانا ہے۔“ دبے دبے لفظوں میں ہمت کر کے عندلیب نے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ بس یہ کہنے کی دیر تھی کہ بلی تو یوں شروع ہوئیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں کہ عندلیب اس لمحے کو کوسنے لگی جب خواہ مخواہ ماں کو چھیڑ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔

بلی پھپھو کے مطابق ساری دنیا کی ہوشیاری و مکاری ان ماں بیٹیوں میں بھری تھی۔ یہ چہروں کی بھولی، زبان کی میٹھی مگر دلوں کی بہت زہریلی تھیں۔ بلی پھپھو تو دل ہی دل میں انہیں ناگن کہا کرتی تھیں۔ بس نور الامین کے سامنے مسکینی بنی رہتی تھیں ورنہ رضیہ تو بلی کو پہلے روز سے ہی سخت بری لگی تھی۔ جب دلہن بن کر وہ ان کے بھائی کی زندگی میں شامل ہوئی تھیں، بلی کو اپنی بھابھی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی تھی۔

”رضیہ بھابھی تو کم ظرف عورت ہیں۔ ان کا دل پیار محبت سے بالکل عاری ہے۔ جیسی روکھی خود ہیں، ویسی ہی ان کی بیٹیاں ہیں۔“ روکھے پن کا خطاب بھی بلی پھپھو نے اپنی بھتیجیوں اور بھابھی کو بہت غور و فکر کے بعد دیا تھا۔

”اور تجھے خواہ مخواہ ان کا سگا بننے کی ضرورت نہیں۔“ بلی پھپھو کی توپ کا رخ اب بیٹی کی طرف تھا۔

وجہ یہ تھی کہ عندلیب اکثر ہی ان لوگوں کی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہہ دیا کرتی تھی جس سے بلی پھپھو کو سخت نفرت تھی اور اس وقت تو انہیں اپنی بیٹی بھی زہر لگا کرتی تھی۔

”کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے وہ تمہاری ماں کے ساتھ۔“ آواز کو قدرے پست رکھتے ہوئے بلی پھپھو نے نور الامین کی بیوی اور بیٹیوں کے رویے اور سلوک کی مزید شکایتیں کرتے ہوئے ایک کٹیلی نگاہ کھڑکی کی طرف ڈالی تھی۔ جہاں رضیہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ امور خانہ داری میں مصروف تھی۔

پریشر ککر کی سیٹی بجنے کی آواز کے شور نے بلی پھپھو کے لیے سہولت کر دی تھی۔ وہ جو پہلے آواز پست کیے ہوئے تھیں۔ الفاظ چبا چبا کر یوں ادا کر رہی تھیں کہ جیسے رضیہ اور اس کی بیٹیوں کو دانتوں کے درمیان چبا رہی ہوں۔ پہلے انہیں یہ خطرہ تھا کہ ان کی جلی کٹی باتیں ان لوگوں کے کان میں نہ پڑ جائیں اب پریشر ککر کے شور میں وہ قدرے اطمینان کے ساتھ بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”جوتوں میں دال رکھ کے دیتے ہیں، جن کی حمایت میں تم ماں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہو۔“ بلی پھپھو تو بیٹی کو بخشنے پر نہیں آ رہی تھیں۔ ان کے مطابق ان کے خون نے ایک دشمن کی حمایت کر دی تھی۔ وہ جنہوں نے بلی کو ہمیشہ تکلیف ہی پہنچائی تھی۔ کبھی پیار و محبت والا سلوک نہ کیا تھا، ان کے مطابق وہ اپنے سگے بھائی کے گھر میں اتنی ذلت سہتی ہیں کہ ان کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان ماں بیٹیوں کی آنکھوں میں ان کے لیے حقارت ہوتی ہے۔

”مگر امی! ممانی نے میرے ساتھ کبھی برا سلوک نہیں کیا۔“

عندلیب، بلی کی سگی بیٹی تھی مگر اس کی رائے رضیہ اور ان کی بیٹیوں کے بارے میں اپنی ماں سے مختلف تھی۔ اس نے ان کی نظروں میں کبھی اپنے لیے تذلیل نہیں دیکھی تھی۔ وہ سب تو اس سے ہمیشہ پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ لوگ بات بھی بہت ناپ تول کر کیا کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ کوئی غلط بات منہ سے نکل گئی تو نور الامین کے ہاتھوں شامت آ جاتی ہے کیونکہ نور الامین اپنی بہن کے ساتھ ذرا سی

بھی بدسلوکی نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ بلی پھپھو کی خاطر تو وہ اپنی سگی اولاد سے بھی بدظن ہو جاتے۔

''ہاں تو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' بلی پھپھو ایک دم سے لال پیلی ہونے لگی تھیں۔

''پکڑ جوتی اور مار ماں کے سر پر۔'' ان کا غصہ دیکھ کر کڑھائی سکھانے والی لڑکی بھی کوفت کا شکار ہو کر چلی گئی تھی حالانکہ وہ جانے سے پہلے کہا کرتی تھی کہ عندلیب اس کے سامنے ایک دو ٹانکے بھر کے پریکٹس کرے تاکہ اگر کہیں کوئی غلطی ہو تو وہ اصلاح کر دے مگر آج تو اس نے یہ آفر بھی نہ کی۔ پریشر ککر کی آواز کم ہونے لگی تو بلی پھپھو نے بھی دانستہ اپنی آواز کا والیم کم کر لیا تھا۔ مگر آواز میں سمویا جلال مکمل جوبن پر تھا۔ اتنی دیر سے وہ ان دشمنوں کے حوالے سے بیٹی کو کوئی ہزار باتیں بتا چکی تھیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کی زبان بولتے ہوئے ان کے خلاف زہر اگلنا شروع کرتی۔ اس کی ابھی بھی وہی راگنی تھی کہ رضیہ ممانی بہت محبت کرنے والی عورت ہیں۔

اب تو بلی پھپھو بخت جلال میں آ گئی تھیں۔ تخت کے پاس پڑی اپنی فینسی چپل جو دو روز قبل ہی نور الامین نے انہیں لا کر دی تھی۔ اٹھالی تھی اور بیٹی کو دعوت دی جا رہی تھی کہ......

''مار ماں کے سر پر......''

دونوں ماں بیٹی کے درمیان کشیدگی ابھی جاری تھی کہ اسی وقت طلحہ آفس سے آ گیا۔ یہ گھر کا وہ فرد تھا جسے دیکھ کر عندلیب کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ گھبراہٹ کا احساس اسے اپنے گھیرے میں لے لیا کرتا تھا۔

''خیر ہے پھپھو! جوتی ہاتھ میں لے کر بیٹھی ہیں؟'' بلی پھپھو کے خطرناک تاثرات دیکھ کر طلحہ بھانپ گیا تھا کہ دونوں ماں بیٹی کے درمیان کسی بات پر بحث ہو رہی ہو گی جو اس کی اچانک آمد پر تھم تو گئی ہے مگر بلی پھپھو کے چہرے پر ابھی بھی غصہ اور خفگی واضح تھی۔ پھولا ہوا منہ اور ہاتھ میں پکڑی جوتی کسی خطرناک معرکے کا اشارہ دے رہی تھی۔

''ارے نہیں بیٹا! وہ تو میں بس......'' بلی پھپھو کے چہرے پر مصنوعی ہنسی تھی۔ جھوٹ بول کر بات بدلنے میں تو وہ ماہر تھیں۔ فوراً سے پہلے بھتیجے کے سامنے بہانا بنا دیا کہ میرا بھائی اتنی چاہت اور محبت سے میرے لیے یہ چپل لایا ہے، بس وہی عندلیب کو دکھاتے ہوئے اپنے بھائی کو دعائیں دے رہی تھی۔

بات سے بات بنانے میں بلی پھپھو ماہر تھیں یوں جیسے کوئی مشین ہوں۔ جس میں سے موقعے کی مناسبت سے باتیں دھڑا دھڑ نکل رہی تھیں۔ موقع اچھا تھا۔ کچھ جذبے اور دل بھی گھبراہٹوں کی زد میں تھے۔ عندلیب کا بیٹھنا دشوار ہوا تو اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی کہ طلحہ کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

''یہ سامان امی کو دے دینا۔''

دو چار لفافے فروٹ کے تھے۔ کچھ لفافوں میں سموسے اور جلیبیاں تھیں۔ ساتھ میں اسٹرابری فلیور آئس کریم کا بڑا پیک تھا۔ سامان پکڑا کر وہ وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔

اپنی چپل دوبارہ سے زمین پر رکھتے ہوئے بلی پھپھو نے سارے سامان کا یوں مشینی انداز میں جائزہ لیا تھا کہ اگر توازن قائم نہ رکھتیں تو شاید الٹ کر چپل کے ساتھ زمین پر گر پڑتیں۔

''اتنا کچھ...... کوئی مہمان آ رہے ہیں کیا؟'' بلی پھپھو خواہ مخواہ کی خوش اخلاقی ہنستی ہنستے ہوئے بولی تھیں۔ ان کی آنکھوں کا ریڈار ابھی بھی چیزوں کے جائزے کی جانب تھا۔ جنہیں لے کر عندلیب تو کب کی جا چکی تھی مگر کبھی عینک اتار کر تو کبھی دوبارہ لگاتے ہوئے بلی پھپھو ابھی بھی بے اطمینانی کا شکار تھیں کہ پتا تو چلے یہ دعوت کس چکر میں تھی؟

ایک سوچ تو یہ تھی کہ ضرور طلحہ اپنی چٹوری بہنوں کی فرمائش پہ لایا ہوگا۔ طلحہ ابھی دو چار مہینے ہوئے جاب پر لگا تھا۔ وہ ہر روز شام کو آفس سے آتے ہوئے ماں بہنوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لاتا بلکہ صبح آفس جاتے ہوئے بھی پوچھ لیا کرتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔ وہ لیتا آئے گا۔ ضرور بر خوردار ماں بہنوں کی

فرماں برداری میں یوں لدلدا کر آئے تھے۔ بلی پھپھو نے فوراً دل ہی دل میں پلاننگ کر لی تھی کہ نور الامین کو ان فضول خرچیوں اور ''مال اڑاؤ مہم'' کے حوالے سے بتا کران کے چٹور۔۔ن کا مکو ٹھپے گی۔

''جی پھپھو! وہ امی کی سہیلی اپنی فیملی کے ساتھ آرہی ہیں۔'' طلحہ نے نہایت مختصر معلومات دی تھی جبکہ بلی پھپھو کو تفصیلی معلومات درکار تھی۔

''کون سی دوست؟''

''یوں اچانک آمد؟''

''بھئی مقصد کیا ہے؟''

''نور الامین بھائی کو کچھ خبر بھی ہے؟''

مگر طلحہ کے سامنے یوں کھل کر سوال بھی نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ طلحہ ماں بہنوں کی طرح بالکل دبو قسم کا نہیں تھا۔ وہ بلی پھپھو کا کسی قسم کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی کبھی باپ اور پھپھو کے گٹھ جوڑ سے خائف ہوا تھا۔ وہ ہر بات موقع پر کلیئر کرنے کا عادی تھا اور بلی پھپھو کو تو باور کرا دیا تھا کہ میرے معاملات سے تو ذرا دور ہی رہا کریں۔ سو جہاں بلی پھپھو نے بھائی کی شہ پر سب کو دبا کر رکھا تھا وہاں طلحہ سے دب کر رہنا مجبوری تھی۔

☆☆☆

رضیہ کی سہیلی راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ وہ اپنی فیملی سمیت مدعو تھیں۔ ان کی اچانک آمد پر بلی پھپھو تو جلے پیر کی بلی بنی پورے گھر میں گھوم رہی تھیں، بہت کریدنے کے باوجود اصل مقصد سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عندلیب سے بھی کئی بار پوچھا مگر وہ بھی لاعلم تھی۔ بلی پھپھو کے اندر بے چینی زہر میں بدلنے لگی۔

''گھنی، میسنیاں...... پتا نہیں اندر ہی اندر کیا واردات کرنے لگی ہیں ماں بیٹیاں۔'' تجسس کی بے چینی اپنی جگہ، کھانے کا انتظام اچھا خاصا دیکھ کر تو بلی پھپھو جل کر کوئلہ ہو گئی تھیں۔

''کوئی بہت ہی خاص سہیلی لگتی ہے رضیہ بھابھی آپ کی کہ یوں دیگوں کے منہ ہی کھول دیے ہیں۔'' سموسے، دہی بھلے، فروٹ چاٹ، شامی کباب، آلو کے کٹلس اور آئس کریم۔ بلی پھپھو جلی بھنی اہتمام کو

گھور رہی تھیں۔ طنز کا تیر کبھی بھابھی کی طرف ہوتا تو کبھی بھتیجیوں کی طرف۔ بلکہ طنز سے اپنی بیٹی بھی محفوظ نہ تھی۔ جس کا قصور صرف یہ تھا کہ مہمان کی آمد پر وہ گھر والوں کی مددگار بن گئی تھی کہ بلی پھپھو کے لیے یہ منظر ایسا تھا کہ ان کا اپنا خون دشمنوں سے جا ملا تھا۔

''بھائی کو اطلاع ہے اس فنکشن کی؟'' بظاہر چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بلی پھپھو دل کی جلن چھپا نہ پائیں تو بول اٹھیں۔

''اف او پھپھو! ہلکا پھلکا چائے کا انتظام کیا ہے اور آپ اسے فنکشن کہہ رہی ہیں۔'' بسمہ کافی دیر سے بلی پھپھو کی طنزیہ گفتگو نظر انداز کر رہی تھی۔ مزید برداشت نہ کر سکی تو قدرے تلخ ہوتے ہوئے بولی تھی۔ اسے بلی پھپھو کی شمولیت اس محفل میں بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم بسمہ؟'' دنیا جہاں کی بدمزاج و بداخلاق بلی پھپھو اپنی ذات کے حوالے سے فوراً ادب و آداب کی ملکہ بن جایا کرتی تھیں۔

''یہ تربیت دے رہی ہیں بھابھی تمہیں کہ پھپھو کے سامنے زبان درازی کرو۔''

ابھی مہمانوں کے آنے میں کچھ دیر تھی تو بلی پھپھو نے سوچا کہ اس وقت چھوٹی موٹی جنگ کر کے ہی دل کا غبار نکال لیا جائے۔ سو بسمہ ہتھے چڑھ گئی۔ وہ تو سچ مچ ہی پانی پت کی جنگ چھڑ جاتی اگر رضیہ اور اسماء بیچ میں آ کر بسمہ کو نہ لے جاتیں۔ جبکہ بسمہ کو بلی پھپھو پر اتنا غصہ آرہا تھا کہ دو چار سخت قسم کے جواب دے کر بلی پھپھو کا دماغ ٹھکانے لگا دے۔ وہ الگ بات تھی کہ یہ دماغ نور الامین کی شہ پر آسمان پر جا پہنچا تھا اب کسی خاص بات پر ہی ٹھکانے پر آتا تھا۔

چائے پارٹی بہت خوش گوار رہی تھی۔ رضیہ کی سہیلی فریحہ اپنی تین بیٹیوں کے ہمراہ آئی تھیں۔ رضیہ بے حد خوش تھیں اور یہ خوشی بلی پھپھو کو ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی طنزیہ جملہ میٹھی مسکراہٹ میں لپیٹ کر وہ بالکل کسی زہریلی کینڈی کی طرح جس کا چمک دار ریپر

اسے چھپائے ہوئے ہوتا ہے، اچھال رہی تھیں۔

"ویسے کہاں ٹھہرنے کا انتظام ہے آپ لوگوں کا؟" بلی پھپھو کا سوال ایسا تھا کہ اس کا مفہوم ہر کوئی سمجھ گیا تھا۔ یقیناً ان کو خطرہ تھا کہ فریحہ اپنی بیٹیوں سمیت یہاں ہی ڈیرہ نہ ڈال لیں۔

"پھپھو! فریحہ آنٹی ہوٹل میں ٹھہری ہیں۔" وہ بسمہ تھی جو ابھی بھی اسی جھڑپ کے زیر اثر تھی اس کی آنکھوں میں ناگواری تھی اور لہجہ بھی کھردرے پن کا شکار تھا۔ اسے بلی پھپھو کے فضول سوالات سے سخت کوفت ہوئی تھی۔

"اوہ۔ اچھا اچھا۔" ہوٹل میں قیام کا سننے کی دیر تھی کہ بلی پھپھو کی پوری بتیسی جو آج ہی "دنداسے" سے خوب رگڑ رگڑ کر چمکائی تھی باہر نکل آئی تھی۔

"اچھا تو کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں آپ لوگ؟" خوش گوار لہجے میں پوچھتے ہوئے بلی پھپھو نے نگٹس اور چائے کا کپ اپنے قریب کر لیا تھا۔ یوں کہ جیسے نگٹس تو خاص ان کے لیے ہی بنے تھے یا پھر ڈاکٹر نے نسخے میں خاص ہدایت کی تھی کہ خوراک میں نگٹس لازمی لیں ورنہ جان کو خطرہ ہے۔

اس سوال کے پیچھے بلی پھپھو کا مقصد صرف مہمانوں کی خوش حالی اور امارت کا اندازہ لگانا تھا۔ سب کے چہروں پر ناگواری اتنی واضح تھی کہ عندلیب کو سبکی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"آواری ہوٹل میں۔" فریحہ شائستگی سے بولی تھیں، اس کے چہرے کے تبسم سے صاف عیاں تھا کہ وہ بلی پھپھو اور ان کے فضول سوالات کو سنجیدہ ہی نہیں لے رہی تھیں۔

"اچھا...... بڑا مہنگا ہوٹل ہے۔" تیزی سے نگٹس کا صفایا کرتے ہوئے بلی اتنی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کا مظاہرہ کر رہی تھیں کہ جیسے ان سے زیادہ تو کوئی خوش اخلاق اس پوری محفل میں نہیں تھا۔

"رضیہ! آسیہ کو تو بلاؤ۔" فریحہ وقفے وقفے سے آسیہ کا ضرور پوچھتی تھیں۔ انداز بتا رہا تھا کہ وہ خاص طور پر آسیہ سے ملنے ہی آئی ہیں۔ بلی پھپھو آسیہ کے ذکر پر لازمی چونکتی تھیں۔ آسیہ کا یوں بار بار پوچھنا بہت خاص لگ رہا تھا۔ بلکہ دل کہہ رہا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا آسیہ کے حوالے سے ہی ہے مگر کیا کالا ہے لاکھ غور و فکر کے بعد بھی بلی پھپھو اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

"عندلیب بیٹا! جاؤ، آسیہ کو تو لے آؤ۔" رضیہ نے بڑی محبت و شفقت سے عندلیب کو پکارا تھا جبکہ بلی پھپھو اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئیں۔

"اپنی لاڈلیاں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی ہیں۔ بس ایک میری عندلیب ہی نوکرانی نظر آرہی ہے۔" بلی پھپھو کا دل تو چاہ رہا تھا کہ یہ بات منہ پھاڑ کر سب کے سامنے کہہ دیں مگر مہمان کا لحاظ آڑے آگیا۔

"بسمہ بیٹا! میری شام کی دوا تو کمرے سے لا دو۔" بلی نے جان بوجھ کر بسمہ کو پکارا تھا جو فریحہ کی بیٹیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ خاص طور پر اسے مخاطب کر کے دوا لانے کا کہنا کوئی بات نہ تھی جبکہ مہمانوں کے سامنے دوا کھانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ کام بلی پھپھو اپنے کمرے میں بھی جا کر کر سکتی تھیں۔ مگر بلی پھپھو کو سب لڑکیوں میں سے خاص عندلیب کو اٹھا کر کام کے لیے بھیجنا برا لگا تھا، حساب چکتا کرنے کے لیے بلی پھپھو نے بسمہ کو بلایا تھا۔ حالانکہ رضیہ نے بے حد سرسری انداز میں عندلیب کو پکارا تھا۔ مگر بلی پھپھو نے اسے سازش قرار دیتے ہوئے، بسمہ کو دوا لانے کا کہہ کر حساب برابر کیا تھا۔

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی بسمہ کی ان سے جھڑپ ہوئی تھی اور اب بسمہ مہمانوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف انہیں سخت زہر لگ رہی تھی ورنہ بلی پھپھو اتنے دلار سے انہیں کبھی مخاطب نہیں کرتی تھیں۔ بسمہ کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔ وہ بلی پھپھو کی سوچ تک پہنچ گئی تھی۔

"لاتی ہوں۔" بسمہ جو بدتمیزی سے انکار کرنے والی تھی کہ ماں نے آنکھ کے اشارے سے کہا کہ دوا لا کے دو۔ اور مہمانوں کے سامنے کوئی بدمزگی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو دوپٹا درست کرتے ہوئے اٹھنے ہی

لگی تھی کہ عین اس وقت طلحہ کمرے میں داخل ہوا۔

"بلی پھپھو! یہ آپ کا فون ہے۔"

بلی پھپھو جو اس وقت سر دبانے کی شدید اداکاری میں مشغول حاضرین محفل پر یہ ثابت کرنا چاہ رہی تھیں کہ ان کی طبیعت کتنی ناساز ہے جب کہ کچھ دیر پہلے ہی چائے کے دو کپ نگٹس اور سموسے کھاتے ہوئے وہ کہیں سے بھی بیمار نہیں لگ رہی تھیں۔

"کس کا ہے؟" بلی پھپھو کو مصروف دیکھنے کی دیر تھی کہ بسمہ دوبارہ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اب بلی پھپھو فون کی غرض سے باہر نکل جائیں گی یا اپنے کمرے میں چلی جائیں گی تو یقیناً دوا بھی خود ہی کھالیں گی۔

"نعیم پھوپھا کا۔" بلی پھپھو کے شوہر کافی دیر سے ان کے نمبر پر کال کر رہے تھے جب درجنوں کال کرنے پر بھی ریسیو نہ کی گئی تو انہوں نے طلحہ کے نمبر پر کال کردی۔ بلی پھپھو کو شوہر کی اس بے وقت کال پر سخت غصہ آیا تھا۔ کیونکہ عندلیب آسیہ کو کمرے میں لے کر آ گئی تھی اور بلی پھپھو کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ابھی اوہ بات کھلنے والی تھی جس کی ٹوہ میں وہ کافی دیر سے نگٹس کھاتی عقل کے گھوڑے دوڑا رہی تھیں۔ شوہر کی بے وقت کی کال نے بلی پھپھو کا مزا کرکرا کر دیا تھا۔

"پتا نہیں کون سی ایسی آفت آ گئی ہے جو اس وقت فون کر دیا۔" طلحہ سے فون تقریباً چھینتے ہوئے بلی پھپھو کمرے سے نکل گئیں تو سب حاضرین محفل نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ اس وقت ماں اور بہنوں کو طلحہ نجات دہندہ لگا تھا جس کے آنے سے بلی پھپھو سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ سب کھل کر ہنس بھی رہے تھے اور دل کی بات بھی کر رہے تھے۔ طلحہ بھی خاموشی سے ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ موجود تو ویسے اس وقت نورالامین کو ہونا چاہیے تھا مگر وہ دکان پر تھے۔ سو ان کی غیر موجودگی میں طلحہ ہی گھر کا بڑا تھا جو مسکراتے ہوئے محبت کے ساتھ اپنی آسیہ آپی کو دیکھ رہا تھا۔ آسیہ کا چہرہ اس وقت کھلے ہوئے گلاب کی مانند نظر آ رہا تھا اور خوشی کے احساس نے اس گلاب کی تازگی اور شگفتگی اور بڑھا دی تھی کیونکہ اس محفل میں اس کی زندگی کے بارے میں انتہائی اہم فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"کیوں، آخر اس رشتے میں برائی کیا ہے؟"

رضیہ نے آواز دانستہ آہستہ رکھی تھی۔ وہ تو یوں سرگوشی کے انداز میں نورالامین سے بات کر رہی تھیں کہ جیسے اپنے ذاتی کمرے میں نہ ہوں بلکہ کسی کھلی جگہ پر ہوں۔ جہاں پردے کی بات کرنا مشکل ہو۔ شاید اس پردہ داری کی وجہ بلی پھپھو تھیں۔ جن کے سامنے رضیہ فی الحال کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ اچھی طرح سے بلی کی حاسد فطرت سے واقف تھیں۔

"مجھ سے اجازت لیے بغیر تمہیں ان لوگوں کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

رضیہ کی سہیلی فریحہ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ اس کا بیٹا قابل لائق فائق، اچھے سرکاری عہدے پر تھا۔ گھر، گاڑی، نوکر چاکر سب تھا۔ فریحہ کی ہمیشہ سے یہ آرزو تھی کہ رضیہ کی کسی بیٹی کو اپنی بہو ضرور بنائے اور شاید یہ بات برسوں سے دونوں کے دلوں میں تھی۔ فریحہ نے رشتہ مانگا تو رضیہ انکار نہ کر سکی۔ اسے لگا کہ بن مانگے خدا نے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی ہو۔ وہ بھلا کیسے انکار کرتی۔ کئی بار نورالامین کو بتانا چاہا مگر طلحہ نے روک دیا۔

"امی پہلے ان لوگوں کو آنے دیں۔" طلحہ چاہتا تھا کہ فریحہ آنٹی آ کر رشتہ مانگیں تاکہ بات ذرا مضبوط ہو جائے پھر نورالامین کو آگاہ کیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ نورالامین بلی پھپھو کی بات کو زیادہ اہمیت دیں گے اور رشتہ آنے سے پہلے ہی انکار کر دیں گے۔

"بلی نے اپنے سسرال میں ایک لڑکے کا رشتہ بتایا تھا آسیہ کے لیے۔" نورالامین کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی کہ باہر اندھیرے میں چور بن کر بات سنتی بلی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کی یہ عادت بہت پرانی تھی۔ یہاں دو لوگوں کے درمیان بات ہوتی، وہاں بلی کے کان خرگوش کی طرح تیز ہو جاتے اور پھر بھائی بھابھی کے درمیان خفیہ گفتگو ہو اور بلی

بے خبر رہتیں۔ ننگے پیر، سر پر دوپٹا بندھے بلی پھپھو کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔

شام کی چائے پر اوور ایکٹنگ کرنے کی وجہ سے بلی کا معدہ خراب ہوگیا تو ہر پندرہ منٹ بعد واش روم کی سیر کو جاتیں بقول بلی کے۔

"ٹانگوں میں کمزوری کی وجہ سے جان نہیں رہی۔"

عندلیب سہارا دے کر ماں کو واش روم تک لے کر گئی تھی۔ دکان سے آتے ہی نور الامین کی بھی بلی بیگم نے دوڑیں لگوادیں۔ لاڈلی بہن کو بے حال دیکھ کر پہلے تو بیوی اور بیٹیوں کی بے حسی پر ایک طویل لیکچر دیا گیا۔

"اپنی پھپھو کے ساتھ تم لوگوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے۔ کل کو میں بیمار پڑ گیا تو تم لوگ تو میرے منہ میں پانی کا قطرہ نہ ڈالو گے۔" یہ نور الامین کے تند و تیز الفاظ تھے جو بلی کی حمایت میں تھے ——— انہوں نے بیوی اور بیٹیوں کو کھری کھری سنائی تھیں۔

طلحہ جیسے ہی آفس سے آیا تو اسے بھی حکم ملا کہ پھپھو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔ دو گھنٹے سر پر کھڑے ہو کر طلحہ نے بلی پھپھو کو ڈرپ لگوائی جبکہ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مریضہ کی حالت بہتر ہے۔ ڈرپ کی ضرورت نہیں، بس زیادہ کھانے کی وجہ سے فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے۔ مگر بلی پھپھو نے بے ہوش ہونے کی کمال اداکاری کی کہ ڈاکٹر اش اش کرنے پر مجبور ہوگیا اور ڈرپ لگادی۔

عندلیب بھی ماں کے ساتھ تھی اور ماں کو افسوس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ماں کو کتنا منع کیا تھا کہ زیادہ مت دکھائیں مگر انہوں نے بھلا کہاں کسی کی سنی تھی جو عندلیب کو یہ اعزاز حاصل ہو جاتا۔ چند گھنٹے پہلے ہاسپٹل میں بے ہوش پڑی، بلی بڑی مستعدی سے بھائی بھابھی کی گفتگو سن رہی تھیں اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ کمزوری کے باعث ان سے کھڑا ہونا مشکل تھا بلکہ ساری بات سن کر رضیہ بھابھی کو کوسا جا رہا تھا۔

"دیکھو کیسی گھنی میسنی ہے۔" بیلی کے ساتھ یہ کھچڑی پکائی جا رہی تھی۔"

بلی کو اچانک محفل سے اٹھ کر جانا پڑ گیا تھا اس لیے اصل بات نہ جان سکی تھیں کہ فریحہ اپنے بیٹے کے لیے آسیہ کا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ چند ماہ پہلے بلی نے اپنے سسرالی رشتے داروں میں آسیہ کے لیے ایک رشتہ بتایا تھا اور نور الامین کے سامنے لڑکے کی خوب بڑھ چڑھ کر تعریفیں کی تھیں۔

"زمین، جائیدادیں، اپنا کاروبار، گائے بھینس ہر چیز تو ہے لڑکے کے پاس۔" بلی پھپھو تو یوں اس لڑکے کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں کہ جیسے قصور کے کسی زمیندار گھرانے کا رشتہ لے آئی ہوں۔ اور نور الامین نے بھی بہن کی باتیں سن کر کسی حد تک ہامی بھر لی تھی۔ اور اب بلی پھپھو کو سخت غصہ آ رہا تھا کہ ان کے بتائے رشتے کو ٹھکرا کر رضیہ بھابھی نے اپنی من مرضی کرنے کی کوشش کی تھی یعنی......

"مینڈکی کو بھی زکام ہونے لگا تھا۔"

"وہ لڑکا گاؤں کا...... ہماری آسیہ گزارا نہیں کر سکے گی۔" رضیہ دردمندانہ انداز میں بولی تھیں۔ ہر ماں کی طرح رضیہ کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی سسرال کا سکھ دیکھے۔ کہاں قصور کا دیہاتی مزاج رکھنے والا لڑکا اور کہاں فریحہ کا قابل ہونہار بیٹا جو اسلام آباد جیسے شہر میں سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ رضیہ کسی طور بھی اس رشتے کو ہاتھ سے نکلنے دینا نہیں چاہتی تھیں۔

"اب گاؤں کی زندگی پہلے جیسی مشکل نہیں رضیہ!" نور الامین تو جیسے قائل ہونے کو ہی نہیں آ رہے تھے۔

انہیں تو لگ رہا تھا کہ جیسے ان کی بہن نے ان کی بیٹی کے لیے کوئی ہیرا تلاش لیا ہو اور باہر کھڑی چوروں کی طرح ان کی باتیں سنتی بلی دل ہی دل میں خوشی سے جھوم رہی تھیں کہ بھائی نور الامین بیوی کی مخالفت اور بلی کی حمایت میں بول رہا ہے۔

"اگر گاؤں کی زندگی مشکل نہیں تو کیوں بلی سب چھوڑ چھاڑ کر......"

اس سے پہلے کہ رضیہ ڈرتے ڈرتے دبے لفظوں میں اپنی بات مکمل کرتیں، اس نامکمل جملے کا

مفہوم باہر کھڑی بلی بھی سمجھ گئیں اور نور الامین بھی۔ یہ طعنہ تھا...... نرا طعنہ۔ جو بلی پھپھو کو تباہ کر کے لگا تھا اور ان کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

''بند کرو بکواس......'' نور الامین چلائے تھے۔ یقیناً رضیہ کا گال سرخ کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا مگر ضبط کر گئے۔ رضیہ کی بیٹیوں نے بھی یہ دھاڑ سنی تو سب بے حد مغموم ہو گئیں۔ عندلیب کا دل سہم کر رہ گیا تھا۔ بلی کا تو دل چاہ رہا تھا کہ خوشی سے جھوم اٹھیں۔ باپ کے چلانے کی آواز طلحہ تک پہنچی تو فی الوقت خاموش رہا تھا کیونکہ رات کافی ہو گئی تھی۔ مگر رات بھر وہ جاگتے ہوئے کسی وکیل کی طرح اپنی ماں اور بہن کا مقدمہ لڑنے کی تیاری میں مصروف رہا۔ اس نے دلائل بھی تیار کر لیے تھے اور یہ بھی سوچ لیا تھا کہ مقدمہ کیسے لڑنا ہے۔

☆☆☆

گھر تو جیسے میدان جنگ بن گیا تھا۔ رضیہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ نور الامین اس رشتے پر رضامند نہیں ہو رہے تھے اور بات بات پر رضیہ کو ذلیل کر کے اپنی لاڈلی بہن کے کلیجے کو سکون دے رہے تھے۔

''امی! چھوڑیں۔ آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہیں۔'' یہ آسیہ تھی جو صابر و شاکر طبیعت کی مالک تھی۔ اسے کبھی اپنے لیے لڑنا نہیں آیا تھا، نہ ہی کبھی باپ کے سامنے کوئی بے ادبی کی تھی۔ رضیہ نے بچوں کی تربیت ہی ایسی نہیں کی تھی کہ بچے باپ کے ساتھ بدتمیزی کرتے۔ آسیہ تو بسمہ اور اسماء کو بھی منع کرتی تھی کہ...... ''چپ رہو...... خاموش رہو......''

یہ الفاظ تو رضیہ نے جیسے آسیہ کو گھٹی میں دے دیے تھے۔ وہ خود بھی ان ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھی اور چھوٹی بہنوں کو بھی یہی سکھاتی تھی۔ جبکہ اسماء اور بسمہ اس سے بالکل مختلف تھیں۔ انہیں غصہ بھی آتا تھا۔ وہ غلط بات پر بول بھی لیتی تھیں۔ احتجاج بھی کرتی تھیں یہ ایک الگ بات تھی کہ نور الامین ان کا احتجاج اپنی جوتی تلے مسل کر رکھ دیتے تھے۔ انہیں اپنا اور اپنی ماں کا وجود چیونٹیوں کی مانند لگا کرتا تھا مگر آج رضیہ بیٹی کی خاطر رو رہی تھیں۔ آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں صرف اس کی خاطر پورے گھر کے سامنے باپ کے ہاتھوں ذلیل ہوں۔ بچپن کی اور بات تھی مگر اب رضیہ کی اولاد جوان ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو یوں ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انہیں علم تھا کہ بلی پھپھو کی لگائی بجھائی میں ان کا باپ ان کی ماں کے ساتھ یوں زیادتی کر جاتا تھا۔ وہ صرف صبر کا گھونٹ پی کر اپنی اولاد کے لیے درگزر کر جاتی تھیں۔ مگر اب معاملہ رضیہ کا نہیں ان کی بیٹیوں کا تھا۔ ان کے مستقبل کا تھا۔ ان کی خوشیوں کا تھا۔ اس لیے رضیہ کو صبر نہیں آ رہا تھا۔

''رضیہ بھابھی! میں نے اتنا برا رشتہ بھی نہیں بتایا جو آپ نے گھر میں رو رو کر نحوست ڈالی ہوئی ہے۔'' بلی پھپھو اندر ہی اندر رضیہ کی حالت کا مزا لے رہی تھیں اور اوپر سے ہمدرد بنتے ہوئے اداکاری کر رہی تھیں۔ ''آسیہ میری بھی بیٹی ہے۔ میرا بھی خون ہے۔ میں بھلا اس کا برا کیوں چاہوں گی۔''

اور دل ہی دل میں بلی کے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ نور الامین نے رضامندی دے دی تھی کہ بلی اپنے سسرالی رشتہ داروں کو بلا لے کہ وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔ نور الامین کا یہ فیصلہ تو رضیہ کو جیسے ساکت ہی کر گیا تھا۔ دل کو جیسے غم ہی لگ گیا تھا۔

''رضیہ بھابھی! گاؤں میں بھی انسان ہی رہتے ہیں۔'' رضیہ کو نڈھال دیکھ کر بلی کو دلی سکون ملا تھا۔ ان کا انداز تمسخرانہ سا تھا۔

''اب تو ایک سے بڑھ کر ایک سہولت وہاں موجود ہے۔'' اور بلی پھپھو کی ایسی باتوں میں سے کوئی بات اچک کر بسمہ کوئی کڑوا جواب دے دیتی تو بلی فوراً سے پہلے نور الامین کی دکان پر فون کھڑکا دیتیں۔

''نہ بھائی صاحب! ایسا کون سا غلط کام کر دیا ہے میں نے جو آسیہ کا رشتہ بتا دیا ہے کہ آپ کی بیٹیاں دن رات مجھے طعنے دینے لگی ہیں۔''

بلی کا اپنا سسرال بھی قصور میں تھا۔ وہی قصور جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ پنڈ تھا اور بلی جو شہر میں پلی بڑھی تھیں۔ انہوں نے قصور کے اس ناقابل معافی

''قصور'' کو عمر بھر معاف نہ کیا۔ اس رشتے پر ببلی نے خوب احتجاج کیا کہ وہ کسی گاؤں میں شادی نہیں کرے گی۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا اور اس احتجاج میں نور الامین بہن کے ساتھ تھے۔ وہ تو گھر کے بڑے ہی اس رشتے پر اڑ گئے اور ببلی کو قصور بھیج کر ہی دم لیا۔ مگر ببلی اپنی ضد اور انا کی پکی تھی۔ چند روز پنڈ میں گزارے اور سسرال والوں کو تگنی کا ناچ نچایا۔ ساس، سسر اور نندوں کے ساتھ زوردار لڑائیاں لڑیں اور لڑ لڑا کر واپسی کی راہ لی۔

''مجھ سے نہیں رہا جاتا اس پنڈ میں۔'' نعیم بے حد شریف اور مسکین فطرت کے مالک تھے۔ وہ تو اپنی بیوی کے تعلیم یافتہ ہونے پر اتنے مرعوب ہوئے تھے کہ شادی کے پہلے روز ہی اس کے سامنے چاروں شانے چت ہو گئے تھے۔

ببلی نے اپنے شوہر سے یہ مطالبہ کیا کہ انہیں الگ گھر لے کر دیا جائے مگر یہ نعیم کے لیے ممکن نہ تھا پھر ببلی نے دوسری ضد پکڑی کہ شہر میں جا کر رہتے ہیں۔ مجھ سے گائے بھینسوں کی آوازیں برداشت نہیں ہوتیں۔ ان کے گند کی بو سے دماغ پھٹتا ہے۔ یہ مطالبہ بھی نامنظور ہوا کہ نعیم ماں باپ کو چھوڑ کر شہر میں جانے کے لیے تیار نہ تھے اور ببلی کسی صورت ان لوگوں کے ساتھ رہنے پر تیار نہ تھیں۔ اس کے بعد ببلی نے بوریا بستر باندھا اور میکے آ گئیں۔

سسرال والے بہت بار نئی دلہن کو منانے آئے مگر ببلی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

''میرا گزارا نہیں ہوتا اس پنڈ میں۔'' یہ ببلی کا صاف جواب تھا اور پھر ببلی نے مکمل طور پر لاہور میں نور الامین کے گھر ڈیرا ڈال لیا۔ شروع کے چند مہینے ببلی نے باقی بھائیوں کے گھر میں پڑاؤ ڈالنے اور ناز نخرے اٹھوانے کی کوشش کی مگر ببلی کی یہ کوششیں ان کی بھابھیوں نے ناکام بنا دیں اور آ جا کے نور الامین کے گھر میں مستقل قیام کر لیا اور پھر اس دن سے لے کر ببلی نے سسرال کی طرف منہ نہ کیا۔

''میری بہن بوجھ نہیں ہے میرے لیے۔''

نور الامین نے خوب سینہ پھُلا کر جو یہ بات کہی تو ببلی کی گردن کا سریا اور سخت ہو گیا۔

اب تو کسی میں جرأت نہیں تھی کہ ببلی کی ضد اور انا کو توڑ سکے۔ سو ان کے شوہر نعیم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کبھی کبھار ملنے آ جاتے اور فون کر لیا کرتے تو ببلی کی ایک ہی رٹ ہوتی کہ انہیں شہر میں گھر لے کر دیا جائے۔ اپنے لیے گاؤں سے اتنی نفرت اور اپنی بھتیجی کے لیے گاؤں کی شان میں یوں قصیدے پڑھ رہی تھیں کہ جیسے گاؤں نہ ہو پیرس ہو۔ ببلی پھپھو کے مطابق تو وہ بہت عظیم کارنامہ سرانجام دے رہی تھیں۔ اپنی بھتیجی کے لیے گاؤں کے لڑکے کا رشتہ لا کر۔ اس بات پر بسمہ اور اسماء کچھ کہہ دیتیں تو ببلی پھپھو رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتیں پھر جب تک نور الامین کے ہاتھوں بیٹیوں کی چھترول نہ ہوتی انہیں صبر نہ آتا۔

بسمہ اور اسماء کا خیال تھا کہ ببلی پھپھو اپنا بدلہ آسیہ سے کیوں لے رہی ہیں۔ انہوں نے تو ببلی پھپھو کا رشتہ گاؤں میں نہیں کروایا تھا۔ اگر آسیہ کو اچھا لڑکا مل رہا ہے تو پھر انکار کی کیا ضرورت ہے مگر یہ ببلی پھپھو کو کون سمجھاتا۔ کیسے ان کی حاسد فطرت کو قرار آتا۔

اس دوران لڑکے والے آ کر آسیہ کو پسند کر گئے تھے اور نور الامین کو بہن کا لایا گیا رشتہ دل و جان سے پسند آیا تھا۔ جبکہ پسندیدگی والی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکا بہت عام سا تھا۔ قد آسیہ سے بھی چھوٹا تھا۔ رنگ بالکل سیاہ توے جیسا اور موٹا بھی تھا کہ چند قدم چل کر سانس پھولنے لگتا تھا۔ بس اگر کوئی پلس پوائنٹ تھا تو اس کی قصور میں زمین جائیداد اور اپنا کاروبار تھا۔

''ببلی پھپھو نجانے کون سے جنم کا بدلہ لے رہی ہیں ہم سے۔'' بسمہ اور اسماء نے پردے کی اوٹ سے لڑکے کو دیکھا۔ پھپھو کے لائے گئے شاہکار کو دیکھ کر اب دونوں آپس میں دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ آسیہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

''دیکھنا طلحہ بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔'' اسماء

اور بسمہ کو اپنے بھائی پر مکمل بھروسا تھا۔ جو ہر مصیبت اور مشکل میں ان کے لیے نجات دہندہ بنا کرتا تھا۔

"طلحہ بے چارہ کیا کر سکے گا۔" آسیہ بے حد مایوس تھی، اسے کسی طور نہیں لگ رہا تھا کہ یہ رشتہ ٹلے گا۔

"اتنا زبردست لڑکا ہے تو پھپھو اپنی بیٹی کی شادی کر دیں۔" ابھی بسمہ نے یہ زہر اگلا ہی تھا کہ اسی لمحے عندلیب کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اسماء اور آسیہ گھبرا گئیں۔ مگر بسمہ نے کوئی پروا نہ کی تھی کہ عندلیب نے بات نہ سن لی ہو۔ بھلا وہ کہاں کسی سے ڈرنے والی تھی۔

"عندلیب برا نہ ماننا۔ یہ تو پاگل ہے۔" آسیہ کو عندلیب جیسی سادہ مزاج اور نیک دل لڑکی کے لیے بسمہ کے الفاظ بالکل اچھے نہ لگے تو وہ آگے بڑھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگی۔ جس میں اسماء بھی شریک تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ عندلیب ایک اچھے دل کی لڑکی تھی اور اس نے ان تینوں بہنوں سمیت ممانی کے متعلق کبھی کچھ برا نہ کہا تھا بلکہ وہ تو ان کی بے حد ممنون تھی کہ وہ ان ماں بیٹی کو اتنی فراخ دلی سے سالوں سے اپنے گھر میں برداشت کر رہے تھے۔

"ارے نہیں آسیہ آپی! مجھے بسمہ کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔" وہ بڑی فراخ دلی سے مسکرائی تو آسیہ اور اسماء کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ مگر بسمہ ابھی بھی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

"انتہائی بے جوڑ قسم کا رشتہ ہے۔ پتا نہیں امی کیوں اس رشتے کی اتنی طرف داری کر رہی ہیں۔" عندلیب کو بھی آسیہ کے لیے یہ رشتہ بالکل نامناسب لگا تھا، اس کی دلی خواہش تھی کہ بات نہ بنے اور انکار ہو جائے۔

"عندلیب! کیا بلی پھپھو نے کبھی سوچا ہے کہ وہ جو بُرائی ہمارے ساتھ کرنے جا رہی ہیں، کل کو ان کی اپنی بیٹی کے آگے آ گئی تو......" بسمہ ہنوز غصے میں تھی۔ وہ جو باتیں باپ اور پھپھو کے سامنے نہیں کر سکتی تھی، عندلیب کے سامنے کہہ رہی تھی۔ اسماء اور آسیہ کے منع کرنے کے باوجود۔ اس کا دل اندر سے رو رہا تھا کہ نجانے بلی پھپھو نے ان کی اتنی بھلائیوں اور احسانات کے بدلے میں کیوں اتنی برائی کی ہے۔

"بسمہ! تم صحیح کہہ رہی ہو۔ یہ بات میں سوچ کر بہت ڈرتی ہوں مگر......" عندلیب کو اپنا آپ مجرم سا لگ رہا تھا۔ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی وہ یوں ندامت کا شکار تھی صرف اپنی ماں کی وجہ سے۔ رضیہ نے کبھی عندلیب کے ساتھ فرق نہ کیا تھا۔ جیسا اپنی بیٹیوں کے لیے لے کر آتیں ویسا ہی عندلیب کے لیے لاتیں۔

"معاف کرنا رضیہ بھابھی! کوالٹی کے لحاظ سے یہ چیزیں بالکل بھی ویسی نہیں ہیں جیسی آپ اپنی بیٹیوں کے لیے لائی ہیں۔" بلی پھپھو رضیہ سے شکوہ کرنا نہ بھولتیں۔

"بلی! میں نے سب چیزیں ایک ہی دکان سے خریدی ہیں۔ یقین نہیں آتا تو تصدیق کے لیے میرے ساتھ اسی دکان پر چلو۔" رضیہ کی اتنی قسموں اور وضاحتوں کے بعد آخر بلی کو یقین آ ہی جاتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہیں۔

ابھی وہ سب ان ہی باتوں میں لگی تھیں کہ رضیہ آئیں اور آنسو پونچھتی ہوئی خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ آنسو بتا رہے تھے کہ نورالامین نے بات پکی کر دی ہے۔ رضیہ کی حالت پر سب کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ممانی! خود کو سنبھالیں آپ۔" یہ عندلیب تھی۔ ممانی کی حالت پر دل گرفتہ تھی مگر چاہ کر بھی کچھ نہ کر پائی تھی۔ ماں کے سامنے اس رشتے کی مخالفت کی تو ماں نے الٹا کھری کھری سنا دیں۔

"لگتا ہے رضیہ بھابھی نے تو تجھے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ ماں سے زیادہ ان کی سگی بنی رہتی ہے یا کوئی تعویذ ڈال دیا ہے تیرے گلے میں۔" یہ کہتے ہوئے بلی جنونی انداز میں عندلیب کی چوٹی ادھر ادھر کر کے تعویذ ڈھونڈنے لگیں جو رضیہ نے باندھا ہی نہ تھا۔

عندلیب اپنی ماں کی جاہلانہ سوچ پر انہیں افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اصولاً بلی کو بھائی کی بیوی

اور اولاد کو محبت کے بدلے محبت دینی چاہیے تھی مگر بلی پھپھو نے ہمیشہ انہیں نفرت دی تھی۔ عندلیب کے دل میں اکثر یہ سوال اٹھتا تھا کہ آخر اس کی ماں کو اپنے بھائی کی بیوی اور بچوں سے کیوں نفرت تھی؟ مگر کبھی یہ بات ماں سے نہ پوچھ سکی تھی، جانتی تھی کہ ماں کے ہاتھوں وہ درگت بنے گی کہ مت پوچھو۔

☆☆☆

طلحہ کی آواز پر سب ہی چونکے تھے۔ وہ جو آسیہ کی بات پکی کر کے خوش تھے اور کمرے میں موجود لوگ اداس تھے۔ مطلب طلحہ ماں اور بہنوں کی وکالت کرنے کے لیے مضبوط دلائل لے کر پہنچ گیا تھا۔ طلحہ نے ذاتی طور پر لڑکے کے بارے میں معلومات اکٹھی کی تھیں کہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ تھا۔ جبکہ بلی پھپھو کے مطابق لڑکا کنوارا تھا۔ دوسری حقیقت نورالامین کے سامنے یہ رکھی گئی کہ لڑکا تقریباً چالیس سال کا تھا۔ بلی پھپھو نے لڑکے کی عمر ستائیس سال بتائی تھی، یہ دوسرا جھوٹ نکلا تھا۔ سب سے بھیانک انکشاف جو اس وکیل نے مہمانوں کی موجودگی میں کیا تھا، وہ یہ تھا لڑکا اولاد کے لیے شادی کر رہا تھا کیونکہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے والوں کو نورالامین کے گھر کی راہ بلی پھپھو نے دکھائی تھی۔ جو ان کی بھائی اور ان کے بیوی بچوں سے محبت کا ثبوت تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔

''قسم لے لیں بھائی صاحب! مجھے تو خود آج اس عیار کے متعلق یہ سب پتا چلا ہے۔ وہ بھی طلحہ بیٹے کے منہ سے۔'' مہمانوں کے سامنے یوں پول کھلنے پر بلی نے مثالی اداکاری کرنے کی ٹھانی تھی۔ اپنی سچائی کی قسمیں کھاتی ہوئی بلی پھپھو لڑکے کو گالیاں دینے لگیں۔

''ٹھگنے...... اللہ غارت کرے تجھے۔'' یہ وہی لڑکا تھا جس کی تعریفوں میں بلی پھپھو زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں کہ آسیہ کے لیے کوہ نور کا ہیرا لائی ہوں جبکہ بسمہ نے لڑکے کے قد پر اعتراض کیا تھا تو بلی پھپھو نے فوراً لڑکے کی حمایت کی تھی۔

''اب اتنا بھی چھوٹا قد نہیں ہے لڑکے کا۔''

بسمہ کی بات بلی پھپھو کو بے حد ناگوار لگی تھی۔

''ارے مردوں کی شکل اور قد پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ بس ان کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔'' بلی پھپھو کو بھائی کی مکمل تائید حاصل تھی۔

''کالی شکل والے...... منحوس دفع ہو یہاں سے۔'' اب بلی پھپھو لڑکے کو گھر سے نکل جانے کا کہہ رہی تھیں۔ جبکہ لڑکے والے حیران ہو رہے تھے کہ بلی ساری حقیقت سے واقف تھیں۔ بلی پھپھو یہی چاہ رہی تھیں کہ لڑکے والوں کو یہاں سے ذلیل کر کے نکال دوں کہیں وہ بھائی کے سامنے ان کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔

''بھائی صاحب! مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ کالا کوا...... پہلے سے شادی شدہ تھا ورنہ اسے گھر کی دہلیز پار نہ کرنے دیتی۔'' اب تو بلی پھپھو اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں کہ لڑکے نے انہیں بھی دھوکا دیا تھا۔

طلحہ بلی پھپھو کے رشتہ لانے پر تب ہی خاموش رہا تھا۔ وہ اپنے طور پر انکوائری کرنا چاہ رہا تھا تاکہ سارے اعتراضات کے جواب سامنے دیے جائیں۔ اس لیے وہ آفس سے چھٹی لے کر بلی پھپھو کے سسرال پہنچ گیا تھا۔

''آپ قصور جا رہے ہیں؟'' جانے سے پہلے طلحہ نے یہ خبر صرف ماں کو دی تھی اور حوصلہ بھی دیا تھا کہ پریشان نہ ہوں۔ رضیہ اس وقت کچن میں آئیں اور عین اسی وقت عندلیب بھی کچن میں آئی تو بات سن کر پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''اب یہ خبر اپنی والدہ محترمہ کو نہ دے دینا۔''

طلحہ یہ کام صیغہ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بلی پھپھو کو یہ پتا چلنے کی دیر تھی کہ طلحہ لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے قصور جا رہا ہے تو انہوں نے یہ خبر فوراً نورالامین کو دے کر ہنگامہ برپا کر دینا تھا کہ ساری معلومات بیچ میں دھری کی دھری رہ جاتی تھیں۔ سو طلحہ خاموشی سے قصور چلا گیا۔ لڑکے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے واپس آیا تو اس وقت لڑکے والے موجود تھے۔ موقعہ اچھا تھا

طلحہ نے ان کے سامنے ہی ساری حقیقت کھول دی تاکہ وہ مکر نہ سکیں۔

"اے بلی بہن! اچھی عزت افزائی کی ہے ہماری۔ گھر بلا کر بے عزتی کی ہے۔ ساری بات تو پہلے سے ہی جانتی تھیں تم۔ ہم نے کیا چھپایا اور تم نے اپنے بھائی کو کیا بتایا۔ یہ تم ہی جانو...... ہم باز آئے ایسی رشتہ داری سے۔" لڑکے کی ماں کو سب کے سامنے یہ بے عزتی برداشت نہ ہوئی تو بلی کو کھری کھری سنا گئی۔

طلحہ کی ہمت نے ماں اور بہنوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی مگر نور الامین اس سارے عرصے کے دوران بالکل خاموش رہے تھے۔ مگر چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اپنی لاڈلی بہن سے یہ امید نہ تھی۔ نور الامین کے پاس اب کوئی جواز نہ بچا تھا کہ فریحہ کو انکار کرتے۔ سو انہوں نے ہاں کر دی۔ عندلیب نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا، وہ دور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آسیہ کی شادی کی تیاری عروج پر تھی۔ سب خوش تھے سوائے بلی پھپھو کے۔ نور الامین کی خاموشی پر بلی پھر سے شیر ہو گئی تھیں۔ شادی کی تیاریوں میں بھی وہ کوئی بد مزگی پھیلانے کا موقع جانے نہیں دے رہی تھیں۔

"اتنے ڈنر سیٹ رضیہ بھابھی؟"

رضیہ کی پہلی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ خوب دل کے ارمان نکال رہی تھیں۔ ہر چیز بہت دل سے خرید کر آسیہ کا جہیز تیار ہو رہا تھا۔ رضیہ نے کمیٹیاں بھی ڈال رکھی تھیں اور طلحہ بھی خوب فراخ دلی سے ماں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ بلی دل ہی دل میں حسد کے مارے کھول رہی تھیں۔ اپنی شادی کا زمانہ یاد آیا تو صرف ایک ڈنر سیٹ ملا تھا۔

"برتن تو جتنے بھی دو، وہ کم ہی ہوتے ہیں بلی۔" رضیہ اتنی خوش تھیں کہ بلی کی کسی کڑوی کسیلی بات کو دل پر نہیں لے رہی تھیں۔

"ویسے بھابھی! جب بیٹی دوسرے شہر رخصت ہو کر جائے تو اتنا سامان بھلا کون دیتا ہے۔ سفر میں ہی ٹوٹ ٹاٹ جاتے ہیں۔" سارا دن فارغ بیٹھی بلی کے پاس دوسرا تو کوئی کام نہ تھا سو فضول باتیں جتنی بھی کر لو کم تھیں۔

بلی اپنی شادی پر ڈھیروں برتن خریدنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ مگر گھر کے بڑوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ دوسرا شہر ہے۔ اگر سفر کے دوران برتن ٹوٹ گئے تو سارا پیسہ برباد...... اور اس بات پر بلی منہ پھاڑ پھاڑ کے روئی تھی اور یہ مشورہ دینے والی رضیہ کے علاوہ دوسرے بھائیوں کی بیویاں تھیں۔ ظاہر ہے پیسہ ان کی جیبوں سے نکلنا تھا، بلی کے جہیز کے لیے تو انہیں تو اعتراض ہونا ہی تھا۔

آسیہ کی شادی کی تیاریاں اس دھوم دھام سے دیکھ کر بلی کو پھر سے اپنا زمانہ یاد آ گیا تھا۔

"ارے۔ ایسے کیسے ٹوٹیں گے، ٹرک پر جائے گا سارا سامان بحفاظت۔" رضیہ قدرے مطمئن سی بولی تھیں۔ "فریحہ اس معاملے میں بہت ذمہ دار ہے۔" رضیہ کو یقین تھا کہ آسیہ کے سسرال والے بہت ذمہ دار لوگ ہیں۔ وہ سامان بحفاظت ایک شہر سے دوسرے تک پہنچا دیں گے۔

ایک تو بلی اس شادی پر دل سے خوش نہ تھیں اور اوپر سے فریحہ کا نام سنتے ہی ان کے منہ کے زاویے ٹیڑھے میڑھے ہونے لگتے تھے۔ یہ فریحہ ہی تو تھی جس نے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیج کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا ورنہ دنیا کی کوئی طاقت آسیہ کو قصور روانہ کرنے سے روک نہیں سکتی تھی۔

"اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ انہیں جہیز کی ضرورت ہی کیا تھی۔" بلی کے دماغ کا میٹر اس تیزی سے چل رہا تھا کہ نئے سے نئے شوشے چھوڑ رہی تھیں۔

"لگتا ہے بس اوپر اوپر سے ہی امیر ہیں۔ اندر سے تو بھوکے ننگے لگتے ہیں مجھے۔" بے کار کی باتیں کر کے بلی خواہ مخواہ فریحہ کو لالچی ثابت کرنے پر تلی تھیں کہ جس نے جہیز کا مطالبہ کر کے انتہائی چھوٹا پن دکھایا ہے۔

"ارے نہیں بلی! فریحہ نے تو جہیز کا صاف منع کر دیا تھا۔" رضیہ کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ان

کی اتنی مخلص سہیلی کے بارے میں ببلی ایسی بدگمانیاں جگہ جگہ بیٹھ کے پھیلاتی رہیں ۔ رضیہ نے وضاحت ضروری سمجھی تھی۔

”یہ طلحہ کا اصرار تھا۔“ رضیہ نے ببلی کی ان زہریلی باتوں کا جواب مسکراتے ہوئے دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ یہ خوشی کا موقعہ الٹی سیدھی باتوں کی وجہ سے خرابی کی شکل اختیار کرے مگر ببلی تو ایسی ہی باتوں کی تلاش میں تھیں۔ کبھی کوئی بات پکڑ کر بیٹھ جاتیں تو کبھی کوئی......

”بھائی صاحب! دیکھ رہے ہیں رضیہ بھابھی پیسہ کس طرح اُڑا رہی ہیں۔“

رضیہ بیٹیوں کے ساتھ شادی کی خریداری کے لیے گئی تھیں۔ گھر میں عندلیب اور ببلی تھیں۔ نورالامین جو گھنٹہ بھر کے لیے کھانا کھانے گھر آتے تو ببلی پھپھو ریڈیو پاکستان بنی خبریں نشر کرنے لگیں اور خبریں بھی ساری ایسی جو رضیہ بھابھی اور ان کی اولاد کے خلاف جاتی تھیں۔

”اور بیٹیاں بھی تو بیاہنی ہیں یا صرف آسیہ کو ہی رخصت کرنا ہے۔“ بظاہر ہمدرد بنی ببلی صاحبہ نے بھائی کے سامنے بڑی سیانوں والی بات کہی تھی۔ جس کی تائید میں نورالامین گہری سوچ میں اترے آہستہ سے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ببلی کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔

”میں کچھ کہوں تو برا لگتا ہے ان سب کو۔“ اب کے نورالامین کی پیشانی پر یہ بل پڑنے لگے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ وہ ببلی کی باتوں سے سو نہیں ہزار فیصد متفق تھے۔ واقعی ان کی بیوی اور بیٹیاں پیسہ اڑا رہی تھیں اور اس میں ساری کی ساری غلطی رضیہ کی تھی۔ عندلیب جو اندر باہر آتی جاتی ماں کی باتیں سن رہی تھی اور ان باتوں سے اس کا دل سخت برا ہو رہا تھا۔ اس کے مطابق یہ سب باتیں غیر ضروری اور بلا مقصد تھیں اور اسی سوچ کے تحت وہ اشاروں ہی اشاروں میں منع بھی کررہی تھی کہ ایسی بے کار باتیں نہ کریں کہ خوشی کے موقعے پر گھر میں جھگڑے کی فضا بنے۔ مگر ببلی اپنے سامنے عندلیب کو سمجھتی ہی کیا تھیں جو اس کے اشاروں پر دھیان دیتیں۔ وہ تو کافی دنوں سے اسی انتظار میں تھیں کہ نورالامین اکیلے میں میسر آئیں اور وہ دل کی ساری کھولن نکال کر پیٹ کو ہلکا کریں۔

”ضرورت کیا اپنے سے اوپر کے طبقے میں آسیہ شادی کرنے کی۔“ ببلی کے دل میں تو یہ بات کانٹے کی طرح چبھ کر بیٹھ گئی تھی کہ رضیہ نے بیٹی کا رشتہ اتنے کھاتے پیتے گھرانے میں آخر کیا ہی کیوں؟

ببلی کے مطابق رضیہ نے اپنے سے اوپر کے طبقے میں بیٹی کا رشتہ کرکے بہت بے وقوفی کا کام کیا تھا۔ وہ صرف دکھاوے، نمود و نمائش کی خاطر پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔

”اب کچھ کہوں تو میرا منہ توڑ کر رکھ دیتی ہیں کہ طلحہ بھائی پیسے دے رہے ہیں...... ابو کو تو تنگ نہیں کررہے ہم۔“ یہ اسماء اور بسمہ کا پھپھو کو کرارا سا جواب ہوا کرتا تھا جس پر ببلی پھپھو بل کھا کر رہ جایا کرتی تھیں۔

نورالامین کھانا کھا چکے تھے۔ ان کی آنکھوں سے جھلکتا غصہ اس بات کا عکاس تھا کہ وہ منتظر تھے کہ رضیہ بازار سے لوٹیں اور وہ انہیں آڑے ہاتھوں لے لیں۔

”اب کیا ضرورت تھی بارات کا فنکشن پی سی ہوٹل میں رکھنے کی۔“ شادی کی خریداری پر دل کا بھانبڑ نکالنے کے بعد ببلی پھپھو اب اس نئے موضوع کی طرف آ گئی تھیں اور یہ موضوع ببلی پھپھو کی دکھتی رگ تھا۔ جتنی بار بھی اس بارے میں کوئی بات کرتی تھیں، آنکھیں دکھ کے مارے سرخ ہونے لگتی تھیں او راس دکھ کے پیچھے بھی ببلی پھپھو کی ایک لمبی کہانی تھی۔

جب سے ببلی پھپھو کو یہ خبر ملی تھی کہ بارات کا فنکشن پی سی ہوٹل میں ہے، انہوں نے رو رو کر حال برا کرلیا تھا اور ان کا بین دیکھ کر عندلیب بھی پریشان ہوگئی تھی۔ وجہ پوچھی تو ہزار بددعائیں رضیہ بھابھی کو دیتے وجہ یہ بتائی کہ......

”میری بارات کا فنکشن پتا ہے کہاں کیا تھا؟“ متحیر سی عندلیب اتنی بھولی بسری باتوں کو لے کر ماں کے رونے دھونے پر پریشان ہوگئی پھر بھی ماں کی دل

جوئی تو اس پر فرض تھی۔

''کہاں؟''

''یہ گھر کے سامنے گراؤنڈ میں۔'' بہتی ناک کو پونچھتے بلی پھپھو نے ہاتھ کا اشارہ کرتے گراؤنڈ کی سمت بھی بتائی تھی۔

''جو گراؤنڈ کم اور گھوڑوں کا اصطبل زیادہ لگتا تھا۔'' بلی پھپھو نا گن بنی پھنکاریں تو چہرے پر جبراً حیرانی لاتے عندلیب نے ماں کے ساتھ ہمدردی جتائی تھی۔

''اور پتا ہے یہ گراؤنڈ والا مشورہ کس کا تھا؟'' بلی پھپھو کا انداز شدید خونخوارانہ سا تھا۔

''کس کا؟''

''دنیا جہان کی سیانی گیانی تمہاری رضیہ ممانی کا۔'' بلی پھپھو نے یوں دانت کچکچا کر کہا کہ جیسے یہ کوئی ابھی کا تازہ حالیہ قصہ ہو جس نے ان کا سینہ ابھی تک دہکایا ہو۔ جبکہ یہ بہت برسوں پرانی بات ہو چلی تھی۔

بلی کی خواہش تھی کہ ان کی شادی کا فنکشن کسی مشہور و معروف ہوٹل میں ہو تاکہ سہیلیوں کے سامنے واہ واہ تو ہو۔ بلی جو اناولی ہوتی ذہن میں بہت سے مشہور ہوٹلوں میں سے کسی ایک کا نام فائنل کر رہی تھیں۔ ان پر یہ خبر کسی بم کی طرح گری کہ بارات کا فنکشن گھر کے سامنے والا گراؤنڈ میں فائنل کیا جارہا ہے۔ اپنی شادی کے حوالے سے بہت ارمان تھے بلی پھپھو کے دل میں اور پھر اکلوتی بہن ہونے کا فخر و غرور..... مگر یہ فیصلہ سن کر بلی کا سارا غرور اسی گراؤنڈ کی مٹی تلے آرہا تھا۔

بلی کی شادی کا سارا انتظام نورالامین نے بڑی خوش دلی سے کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اکلوتی بہن کا فنکشن اس کی من مرضی کے مطابق کسی شان دار سے ہوٹل میں ہو اور اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نورالامین نے اس بارے میں باقی بھائیوں سے بات کی تو سب اپنی جیبوں میں موجود رقم چھپاتے ہوئے پتلی گلی سے نکل گئے۔ کسی نے بھی ہمت حوصلہ نہ دکھایا تو نورالامین تنہا کیا کرتے۔ دوستو کے مشورے پر فنکشن کے لیے گراؤنڈ فائنل کرلیا اور رضیہ کا نام یوں بدنام ہوا کہ اس کی زبانی یہ خبر بلی تک پہنچی تھی۔ بس وہ دن اور آج کا دن...... بلی پھپھو کے دماغ سے یہ بات نہ نکل سکی کہ یہ سب رضیہ کی بھابھی نند والی جنگ تھی جس کا آغاز رضیہ بھابھی نے کیا تھا اور اختتام بھی کرنا چاہتی تھیں۔

''اب کرلیں اپنی بیٹی کا فنکشن بھی گراؤنڈ میں۔'' بلی پھپھو ابھی تک سلگ رہی تھیں۔ آسیہ کی شادی کے شان دار انتظامات دیکھ کر وہ کباب ہوگئی تھیں جلن کے مارے۔

''آنے دو کرتا ہوں رضیہ اور اس کی بیٹیوں سے بات۔'' بلی پھپھو کی محنت رنگ لائی تھی۔ پچھلے دو گھنٹے سے بلی پھپھو نے بھائی کا دماغ خوب گرم کیا تھا۔ نورالامین تو خوب آگ بگولا ہوئے۔ ان فضول خرچیوں پر ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیوی اور بیٹیوں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے حساب لیں۔ آج زیورات کی خریداری کا مرحلہ تھا۔ شادی میں بس چند روز رہ گئے تھے۔

☆☆☆

''اسماء! سونے کے کنگن کہاں ہیں؟'' سب لڑکیاں زیورات کے ڈبے کھولے بڑی خوش نظر آرہی تھیں۔ طلحہ نے زیورات کے لیے فراخ دلی سے رقم دی تھی۔

''امی! کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔'' طلحہ، اسماء اور آسیہ سے چھوٹا تھا مگر بڑے بھائیوں کی طرح ذمہ داری نبھا رہا تھا۔ فریحہ نے بہت منع کیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں، مگر رضیہ اور طلحہ خالی ہاتھ آسیہ کو رخصت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

رضیہ نے اپنی شادی کے دو سونے کے کنگن بھی آسیہ کے زیورات میں شامل کر دیے تھے مگر اب وہ غائب تھے۔

''امی! کپڑوں والی الماری میں دیکھ لیں۔'' ماں کی فکرمندی دیکھ کر آسیہ نے بھی ایک دو جگہ تلاش کیے مگر ناکام رہی۔

''بسمہ! کنگن کا کچھ پتا ہے؟'' بسمہ جو آسیہ کے

ماتھے پر ٹیکا لگا کر خوش ہو رہی تھی، ایک دم سے گھبرا گئی۔

"نہیں...... مجھے تو نہیں پتا۔" پورے گھر میں کنگنوں کی گمشدگی کا ڈھنڈورا مچ گیا تھا۔ شادی کے موقع پر یہ کیسی بدشگونی ہوئی تھی۔ رضیہ بے چاری غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ کوئی نہ کوئی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ بلی پھپھو تو یہ خبر پہنچی تو وہاں بس طنز ہی تھا۔

"ٹھیک سے تلاش تو کیے نہیں بھابھی نے اور بس شور مچانا شروع کر دیتی ہیں۔" بلی پھپھو کے مطابق رضیہ تو بے حد کمزور دل کی عورت تھیں۔ ہر بات پر واویلا کر کے طوفان برپا کر دیتی ہیں۔

"ہر وقت تو آپ سینے سے لگائے رکھتی تھیں، بھلا گم کیسے ہو گئے؟" بلی جانتی تھیں کہ وہ کنگن رضیہ کے لیے بہت اہم تھے۔ وہ انہیں ان کی شادی پر ساس نے دیے تھے، خاندان کی بڑی بہو جو تھیں۔

"برا نہ مانیں رضیہ بھابھی! اماں مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ جو عورت اپنے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرتی ہے، اس کے زیورات کبھی نہ تو گم ہوتے ہیں اور نہ ہی چوری۔" بلی پھپھو کا انداز استہزائیہ تھا۔ شاید وہ یہ جتانا چاہ رہی تھیں کہ رضیہ زیورات کو تو جان سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے ایسی عورتوں کی جان جاتی ہے۔

"بھئی میں نے تو ہمیشہ زیور کی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ میری تو ناک کی کیل تک یہاں سے وہاں نہیں ہوئی۔" بلی پھپھو ہنوز طنز کرنے میں مگن تھیں۔ اس بات سے بے خبر کہ کسی کا وجود ان کے طنزیہ تیروں سے زخمی ہو گیا ہے اور برداشت ختم ہو گئی تھی کہ روح بھی گھائل ہو چلی تھی۔

"بلی! کہاں چھپائے ہیں میرے کنگن؟" متورم آنکھوں کو رگڑتے رضیہ بلی کی جانب بڑھی تھیں کہ لڑکیاں حیران پریشان رہ گئیں۔ انہوں نے دھیمے مزاج والی اپنی ماں کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"مم...... میں نے......" بلی پھپھو جو پرسکون انداز میں بیٹھی امرود کی چاٹ کھا رہی تھیں ایک دم بوکھلا سی گئیں۔ رضیہ کے تیور انہیں ہراساں کر گئے تھے کہ وہ امرود کھانا ہی بھول گئیں۔

"بھابھی...... پاگل ہو گئی ہیں...... بھلا میں کیوں؟" امرود کا ٹکڑا بمشکل نگلتے ہوئے بلی پھپھو نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ رضیہ پھر سے چلائی تھیں کہ بلی کی بولتی ہی بند ہو گئی۔ بلی کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے ـــــــ کسی کو بھی بلی پھپھو کے آنسوؤں پر رحم نہ آیا تھا کیونکہ یہ آنسو بھی سچے نہ تھے۔

اسی وقت نور الامین گھر میں داخل ہوئے تھے۔ رضیہ کو یوں اپنی بہن پر چلاتے دیکھ کر وہ ہر لحاظ بھول گئے اور جوان بچوں کی ماں پر یوں سب کے سامنے ہاتھ اٹھا کر اسے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔

"یاد رکھنا اگر میری بہن سے کوئی بدسلوکی کی تو تمہاری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔"

سرخ دہکتے گال پر ہاتھ رکھے رضیہ مٹی کا مجسمہ بنی اپنی ذلت کا تماشا دیکھتی رہ گئیں۔ نور الامین کا تھپڑ بلی کے سینے میں لگی حسد و رقابت کی آگ پر برف کی مانند ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

آسیہ رخصت ہو کر اپنے سسرال جا چکی تھی۔ شادی کے دوران ہی اسماء اور بسمہ کے بھی بہت اچھے رشتے آ گئے تھے۔ آگے پیچھے بسمہ اور اسماء بھی رخصت ہو کر سسرال پہنچ گئیں۔ بلکہ دونوں باہر کے ممالک میں سیٹل ہو گئی تھیں۔ رضیہ اپنی بیٹیوں کے نصیب پر جتنا بھی شکر کرتیں کم تھا۔

تھپڑ والی بات رضیہ نے طلحہ تک نہیں پہنچنے دی تھی۔ انہوں نے بیٹیوں کو قسم دی تھی کہ طلحہ تک یہ بات کبھی نہ پہنچے۔ جانتی تھیں کہ وہ اپنی ماں کی ذلت کبھی برداشت نہیں کرے گا اور رضیہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ اور بیٹے میں کسی قسم کی کوئی بدمزگی ہو۔ جب تک بسمہ یہاں رہی تھی ماں کی قسم کی پابند رہی مگر شادی کے بعد اس نے بھائی کو یہ بات بتا دی تھی۔ وہ بھی ماں کی ذلت والی بات ابھی تک نہیں بھولی تھی۔

"چھوٹی! ویسے بہت زیادتی کی ہے تم لوگوں نے میرے ساتھ، جو مجھے یہ بات نہ بتائی۔" طلحہ کے لیے بات ناقابل برداشت تھی۔ ماں کو لگنے والا تھپڑ اسے اپنی روح پر محسوس ہوا تو راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ وہ رات بھر جاگتا اور سوچتا کہ کیا ایسا کرے کہ ببلی پھپھو سے اس زیادتی کا بدلہ لے کیونکہ تینوں بہنوں سمیت طلحہ کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ ہو نہ ہو یہ گھٹیا حرکت بھی ببلی پھپھو کی تھی ورنہ رضیہ اتنی بڑی بات ببلی کو کیوں کہتیں۔ آخر طلحہ کے ذہن میں ایک خیال آ ہی گیا تھا۔

"میں عندلیب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" بیٹے کے اس فیصلے نے باپ کو جہاں ڈھیروں خوشی عطا کی، وہاں ماں یہ فیصلہ سن کر ششدر رہ گئیں۔

"شادی کے لیے عندلیب ہی کیوں؟" پہلی بار رضیہ کے دل کے گوشوں میں روایتی بھاوج کے سے احساسات اور جذبات بیدار ہوئے تھے اور ان جذبات سے مغلوب رضیہ کو بیٹے کا یہ فیصلہ بالکل نہ بھایا تھا۔ انہیں عندلیب سے کبھی بھی نفرت نہ تھی مگر تھپڑ والے واقعے اور کنگنوں کی گمشدگی (جو ابھی تک گمشدہ تھے) کے بعد اب وہ بھی عندلیب کے ساتھ تلخ و ترش ہو جایا کرتی تھیں۔

"رضیہ ممانی! لائیے میں روٹی بنا دیتی ہوں۔" عندلیب کا انداز ہمدردانہ ہوتا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" رضیہ کا جواب رکھائی لیے ہوتا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ واشنگ مشین سے کپڑے میں نکال دیتی ہوں۔" رضیہ کی کمر میں کافی دنوں سے درد تھا۔ طلحہ ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر گیا تھا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا تھا۔ اس دوران بہت سے کام عندلیب ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتی تو وہ اسے جھڑک دیتیں۔

"جاؤ بھئی جاؤ...... اپنے کام دیکھو۔ میرے سر پر سوار نہ ہو۔ میں اپنے کام خود ہی کر لوں گی۔" رضیہ کے دل میں ببلی کے لیے شدید غصہ اور ناراضی بیٹھ گئی تھی۔ نورالامین کے تھپڑ نے رضیہ کی روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ بالکل گم صم سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ بس ضرورت کی بات کے لیے نورالامین سے ہوں ہاں تک رہتی تھیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور ببلی سے تو انہوں نے بالکل بات کرنا چھوڑ دی تھی۔

رضیہ کے دل کو شک ہی نہیں پورا یقین تھا کہ ان کے کنگن ببلی نے ہی چوری کیے تھے کیونکہ ببلی کی نظر ہمیشہ سے ہی ان کنگنوں پر تھی۔ وہ الگ بات تھی کہ چور نے اپنی چوری کمال مہارت اور ہوشیاری سے دنیا کی نظروں سے چھپالی تھی۔

رضیہ کا دل دکھی تھا۔ اس لیے انہیں بیٹے کا یہ فیصلہ بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ وہ کسی سے بھی شادی کر لیتا مگر ببلی کی بیٹی عندلیب سے ہرگز...... ہرگز نہیں۔ لمحہ بھر کے لیے رضیہ کے دل میں خیال گزرا کہ شاید عندلیب کے حسن پر طلحہ نے فریفتہ ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے مگر وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ طلحہ کوئی بھی فیصلہ جذبات میں آ کر نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کرتا تھا مگر پہلی بار رضیہ بیٹے کے حوالے سے بھی کچھ بدگمانی کا شکار ہوئی تھیں۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کا بیٹا کبھی فیصلہ کرتے ہوئے اپنی ماں کی ذات کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔" خفا خفا سی ماں کا چہرہ محبت سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ وہ چہرہ جو اس دنیا میں اس کے لیے سب سے خوب صورت اور مقدس تھا۔ رضیہ کے چہرے پر ناسمجھی کی لکیریں نمودار ہونے لگیں۔ وہ ابھی بھی نہ سمجھ پائیں کہ بیٹے نے یہ فیصلہ کیوں اور کس لیے کیا ہے؟

"بے فکر رہیں امی! آپ کا بیٹا صرف وہ کام کرے گا جس میں اس کی ماں کی عزت ہو۔"

رضیہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ بسمہ نے طلحہ کو تھپڑ والا واقعہ بتا دیا ہے۔ رضیہ کو صرف یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ عندلیب نے ان کے بیٹے کو اپنے حسن کے

جال میں قید کر لیا ہے۔

"ساری زندگی...... اس کی ماں نے میری جان کھائے رکھی ہے اور اب اس کی بیٹی بہو بن کر ہم پر حکمرانی کرے گی۔"

طلحہ کے فیصلے کے سامنے رضیہ خاموش ہو گئیں مگر دل میں خدشوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ نور الامین تو بیٹے کے اس فیصلے سے بے پناہ خوش تھے۔ طلحہ نے صحیح معنوں میں باپ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔

"بیٹا! میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ عندلیب ہی میری بہو بنے۔"

یہ نور الامین کے الفاظ تھے جن کا اظہار عالم جوش میں وہ اپنی چہیتی بہن کے سامنے بار بار کر رہے تھے اور بہن محترمہ منہ پھلائے جبراً مسکراتے ہوئے ان کی مسکراہٹوں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ بلی پھپھو بالکل خوش نہ تھیں کہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی شادی طلحہ سے ہو۔ اس کی بھی کئی وجہ تھیں کہ طلحہ انہیں داماد کی صورت بالکل پسند نہ تھا۔ ویسے بھی اس گھر میں طلحہ ہی واحد تھا جو بلی پھپھو کے سحر سے آزاد تھا۔ وہ بلی پھپھو کی ہر چال سمجھتا تھا اور اس کا جواب دینا بھی جانتا تھا۔

دوسری وجہ رضیہ بھابی تھیں جنہیں بلی نے ساری زندگی کچھ نہ سمجھا تھا۔ اب وہ بیٹی کی ساس بن کر بلی کے مقابل آ جائیں گی۔ تیسری وجہ سب سے اہم تھی۔ نور الامین کی تینوں بیٹیاں سسرال میں راج کر رہی تھیں۔ کوئی باہر کے ملک جا بسی تھی۔ بلی تو آگے ہی حسد کے مارے کھول رہی تھیں کہ عندلیب کا بھی بالکل ایسا ہی رشتہ آتا مگر یہاں کیا ہوا طلحہ کا رشتہ ہی گلے پڑ گیا تھا۔ اب بھائی کو انکار کر کے بھی بلی بری نہ بننا چاہتی تھیں۔

"لو بھلا بتاؤ، میری بیٹی کے لیے یہی رہ گیا تھا۔"

بلی پھپھو آتے جاتے بیٹی کے سامنے زہر اگل رہی تھیں جبکہ عندلیب حیران پریشان تھی کہ اتنی محبت کرنے والے بھائی کے بیٹے پر ماں کو اعتراض تھا۔ جنہوں نے ساری زندگی بہن کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔ جو چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھتے تھے بلکہ ہر مہینے بہن کو پندرہ ہزار دینا نہ بھولتے جبکہ عندلیب کا باپ ہر مہینے بیوی اور بیٹی کو مناسب رقم دینے آتا تھا۔

"رکھ لو بلی! عندلیب کے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ بنا لیا کرو۔" یہ نور الامین کی سوچ تھی۔

جبکہ عندلیب طلحہ کے اس فیصلے سے بے پناہ خوش تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ محبت جس کا طاقچہ دل کا دیا بنا کر وہ دنیا والوں کی آنکھوں سے چھپا کر اندھیری راتوں میں روشن کرتی تھی، وہ یوں اس کی زندگی میں اجالا کر دے گا۔ وہ تو اس محبت کو راتوں کو سجدوں میں خدائے لم یزل سے مانگا کرتی تھی۔ عندلیب نے کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہ کیا تھا مگر خدا کے حضور ہمیشہ دعاؤں میں اپنی محبت کو مانگا تھا۔ جو اس کے رب نے اس کی جھولی میں ڈالی دی تھی۔ اس کی تمام دعائیں مستجاب ہوئیں۔

"طلحہ! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

عندلیب کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ اس نے کئی بار طلحہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بات کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی کہ وہ طلحہ سے یہ ضروری بات نہ کر پاتی۔ شاید ابھی قدرت کو منظور نہ تھا کہ بات کھلے یا مناسب وقت پر ہی اس بات کا اظہار مناسب تھا۔

بھائی کے احسانوں کا لحاظ کرتے بلی نے طوعاً و کرہاً اس رشتے کی ہامی بھر لی مگر آہستہ آہستہ انہیں احساس ہونے لگا کہ طلحہ اور عندلیب کی شادی میں ان کے لیے فائدے ہی فائدے ہیں۔ پہلے وہ نور الامین کی صرف بہن تھیں، اب طلحہ کی ساس بن کر گھر اور رضیہ پر وہ کھل کر حکمرانی کر سکتی ہیں۔ دوسرا بڑا فائدہ جو بلی پھپھو کو بیٹی کی شادی سے ملا، وہ یہ تھا کہ پہلے گھر کا ایک کمرا بلی پھپھو کی ملکیت تھا۔ اب اوپر کا پورا پورشن بھائی نے بہن کو سیٹ کروا کے دے دیا تھا۔ جب ایک کے بعد ایک فائدے بلی کو ملنے لگے تو وہ بھی اس فیصلے پر دل و جان سے راضی ہو گئیں۔

☆☆☆

"امی! یہ آپ کے کنگن......" دوپہر کے کھانا کا وقت تھا۔ بلی اس وقت گھر میں موجود نہ تھیں۔ وہ اپنی

سہیلی کے ہاں ملنے گئی ہوئی تھیں۔ طلحہ چاہتا تو یہ تھا کہ یہ بات ان کے سامنے کرے مگر قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں اور انسان ان فیصلوں کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

''یہ کہاں سے ملے؟'' رضیہ کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت اور آنسو ایک ساتھ جھلکے تھے۔ ان کو تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ انہیں یوں دوبارہ مل جائیں گے۔ حیرت نورالامین کی آنکھوں میں بھی تھی۔

''یہ کہاں سے ملے؟'' آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے وہ بھی حیرانی سے استفسار کیے بنا نہ رہ سکے۔ یہ وہی کنگن تھے جس پر گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ انہوں نے رضیہ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ وہ بھی جوان اولاد کے سامنے...... کیونکہ رضیہ نے ان کی پارسا، نیک پروین بہن پر چوری کا الزام لگا دیا تھا۔

''بتاؤ عندلیب! اپنے ماموں اور ممانی کو، یہ کہاں سے ملے؟''

طلحہ کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور کچھ جتانے، بتانے اور کسی حقیقت پر سے پردہ اٹھانے والا انداز بھی۔ اور پھر عندلیب نے جو ساری حقیقت ماموں اور ممانی کے سامنے رکھی، اس کو سن کر تو جیسے نورالامین سکتے میں آگئے۔ رضیہ کے کنگن ببلی نے ہی چوری کیے تھے جب رضیہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ شادی کی خریداری کے سلسلے میں بازار گئی ہوئی تھیں۔ گھر خالی تھا...... موقع بھی اچھا تھا۔ ببلی اور عندلیب کے سوا گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔ ببلی نے رضیہ کی کپڑوں والی الماری سے یہ کنگن نکال لیے کیونکہ ان کی ہمیشہ سے نظر ان کنگنوں پر تھی۔ یہ کنگن رضیہ کو ان کی ساس نے شادی کے موقع پر دیے تھے۔ خاندانی دستور کے مطابق یہ کنگن جو بہت بیش قیمت تھے، بڑی بہو کو دیے جاتے تھے۔ سو ان پر حق رضیہ کا تھا۔ اور یہی بات ببلی کو سلگا گئی تھی۔ اکلوتی ہونے کے ناتے ببلی خواہش مند تھی کہ یہ کنگن اس کے حصے میں آئیں۔ ببلی نے کئی بار ماں سے ان کا تقاضا بھی کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

''ببلی! یہ خاندان کی بڑی بہو کو ہی دیے جاتے ہیں۔'' رضیہ بھابھی کی کلائیوں میں یہ کنگن دیکھ کر اس کے تو تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

''بھابھی! یہ کنگن اصل میں میرے ہیں۔ بس آج کے آج آپ انہیں پہن سکتی ہیں۔'' نئی نویلی دلہن رضیہ کے لیے نند کی یہ بات باعث حیرت تھی، سو شوہر سے بات کرنا رضیہ نے ضروری سمجھا۔

''بچی ہے، یوں ہی مذاق میں کہہ رہی ہے۔'' نورالامین کا انداز انتہا کا مشفقانہ تھا۔ وہ دن اور آج کا دن ببلی نے ان کنگنوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ببلی کو وہ رضیہ کی کلائیوں میں برداشت نہ تھے۔ رضیہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی سب سے بڑی بیٹی آسیہ کو یہ شادی میں تحفے میں دیں یا پھر طلحہ کی ہونے والی بیوی کو مگر طلحہ نے صاف کہہ دیا کہ آپ یہ آسیہ آپی کو دیں۔ اس وقت کسی کو علم نہیں تھا کہ اس گھر کی بہو عندلیب ہوگی۔

''امی! یہ غلط ہے۔ اگر بات کھل گئی تو ہم ماموں کے سامنے ذلیل ہو جائیں گے۔''

اس وقت ببلی کو بھی نہیں پتا تھا کہ عندلیب کی شادی طلحہ سے ہونا مقدر میں لکھا ہے اور یہ کنگن خود بخود اکلوتی بہو ہونے کے ناتے ان کی ہی بیٹی کو مل جائیں گے۔ مگر یہاں بھی ببلی کی بدنیتی اور بے صبری آڑے آگئی۔

''چپ کر...... جا کر انہیں میرے سب سے چھوٹے والے اٹیچی کیس میں چھپا کر رکھ۔''

بیٹی کو ڈپٹتے ہوئے ببلی نے انہیں چھپانے کا حکم دے کر خاموش کروا دیا مگر دل کے بوجھ اور ضمیر کی سرزنش نے عندلیب کو زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔ جب وہ اس گھر کی بہو بنی تو ——— اس نے پوری ایمان داری کے ساتھ شوہر کے سامنے اصل بات رکھ دی۔ کیا فائدہ تھا اس چوری کا کہ عندلیب کھل کر ان کنگنوں کو پہن بھی نہیں سکتی تھی۔

طلحہ نے عندلیب سے شادی کا فیصلہ پہلے تو اس سوچ کے تحت کیا تھا کہ اپنی ماں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا ایک ایک بدلہ وہ ببلی پھپھو سے عندلیب کو دکھ، اذیت پہنچا کر لے گا۔ ببلی پھپھو کی آنکھوں کے سامنے بیٹی کے ساتھ یہ بدتر سلوک ہوگا

تو انہیں بھی احساس ہوگا کہ کسی کو تکلیف، اذیت پہنچانا کتنا آسان اور اپنے پر سہنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ مگر جب عندلیب کی سچائی اور ایمان داری طلحہ نے دیکھی تو اسے لگا کہ یہ غلط ہے کہ ماں کی غلطیوں کی سزا بیٹی کو دی جائے۔ جس میں اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ عندلیب تو ہمیشہ سے نور الامین کے گھرانے کی احسان مند رہی تھی اور آج اتنے حوصلے اور ہمت کے ساتھ اپنی ماں کی چوری کا پول کھول کر عندلیب نے ان احسانوں کا بدلہ چکا دیا تھا۔

''میں تمہارا احسان مند رہوں گا عندلیب!'' طلحہ اپنی ماں کے گمشدہ کنگن کے مل جانے پر بے حد خوش اور پرسکون تھا اور اس خوشی کا اظہار اس نے عندلیب کے سامنے کیا تھا۔

''محبتوں میں احسان کیسا...... وہ محبتیں ہی سچی نہیں ہوتیں جن میں آپ مخلص اور ایمان دار نہ ہوں۔'' پہلی بار عندلیب نے کھل کر طلحہ کے سامنے اپنی وفاؤں اور محبتوں کا اعتراف و اظہار لفظوں میں کیا تو وہ بھی لمحہ بھر کے لیے ساکت سا ہو گیا۔

''محبت......؟''

''ہاں محبت طلحہ......! وہ جو میں آپ سے بچپن سے کرتی چلی آ رہی ہوں۔ نجانے کس بے خبری کے لمحے نے کاسۂ دل میں آپ کی محبت میرے دل میں ڈال کر مجھے ایک نئے راستے، اک نئی منزل کا مسافر بنا دیا۔ اس وقت میں اس سفر میں بالکل تنہا تھی۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ان راہوں پر چل کر کبھی میں منزل بھی پاسکوں گی یا نہیں۔'' عندلیب کی روشن آنکھوں سے دو چمک دار موتی نکلے تھے۔

''بس ایک یقین تھا، اپنی سچی محبت پر اور اللہ پر۔ کہ وہ مجھے نامراد نہیں رہنے دے گا۔'' الفاظ بھی بھیگنے لگے اور اس کے گلابی رخسار بھی اور طلحہ جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور بے حد حیران سا تھا کہ اسے کبھی خبر بھی نہ ہوئی کہ ان خوب صورت آنکھوں میں رات کی تنہائی میں طلحہ کے نام کے دو دیے روشن ہوتے تھے۔

''بڑی چھپی رستم نکلی ہو تم۔'' طلحہ شوخی سے جو مسکرایا تو وہ بھی اپنی آنکھوں سے نکلتے ان چمک دار موتیوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے پر مجبور ہوگئی کیونکہ بہت مشکل ہوتا ہے ایک لڑکی کے لیے اپنے جذبوں کا اظہار لفظوں میں کرنا اور آج عندلیب نے ہمت کر کے یہ کام کر دیا تھا۔

☆☆☆

نور الامین یہ سب جان کر غم اور کرب سے ڈھے گئے تھے۔ بالکل خاموش سے ہو گئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی بہن اس قدر کھوٹی نکلے گی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی بہن کے صاف دل کی قسمیں کھائی تھیں۔

''ہیرے جیسا دل ہے میری بہن کا...... قدر کیا کرو اس کی......'' یہ نور الامین کے الفاظ تھے جو وہ بہن کی حمایت میں بیوی اور بیٹیوں کے سامنے کہتے تھے کہ ان کی بہن کا دل ہیرے کی طرح شفاف اور روشن ہے اور باقی سب تو سیاہ دل والے میلے اور کھوٹے ہیں مگر آج احساس ہو رہا تھا کہ من میلا تو ان کی بہن کا تھا۔

نور الامین کو شروع سے لے کر اب تک تمام زیادتیاں جو انہوں نے اپنی جان سے پیاری بہن کی خاطر اپنی بیوی اور اولاد کے ساتھ کیں، ایک ایک کر کے یاد آئی، دل کو کچوکے لگا رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ بلی کو سچا جانا اور باقی سب کو جھوٹا۔ ہمیشہ بہن کی کہی باتوں میں آ کر بنا تصدیق کیے اپنے بیوی بچوں کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا کرتے تھے۔

''پیر پکڑ کر معافی مانگو اپنی پھپھو سے۔'' نور الامین کے اس حکم پر تینوں بیٹیاں بے حد غم زدہ ہوتی تھیں۔ بے گناہ ہوتے ہوئے اپنی بے گناہی کی قسمیں کھانے کے باوجود بھی وہ بلی پھپھو کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگتی تھیں کیونکہ نور الامین کے نزدیک تو صرف ان کی بہن پارسا تھا اور باقی سب جھوٹوں کے سردار اور رضیہ کے ساتھ تو بدسلوکی کی یہ انتہا تھی کہ جیسے وہ ان کی بیوی نہ ہو نوکرانی ہو۔

''بلی سے اچھا سلوک کرو گی تو اس گھر میں رہو

گی۔ ورنہ یہاں سے جاسکتی ہو۔'' نورالامین ہمیشہ بہن کے مقابلے میں بیوی کو دوکوڑی کا کر دیا کرتے تھے۔ یہ دھمکی تو ہمیشہ سے ان کی نوک زبان پر رہتی تھی۔ اب پچھتاووں اور ندامت میں گھرے نور الامین خود احتسابی کے عمل سے گزر رہے تھے۔

''بلی بھلا جھوٹ کیوں بولے گی۔''

یہ تو نورالامین کا تکیہ کلام تھا انہیں ہمیشہ سے رضیہ سے یہ شکوہ تھا کہ تم نے تو بلی کو اپنا حریف بنالیا ہے جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ بلی نے رضیہ کو اپنا حریف بنا رکھا تھا۔ رضیہ تو اس بے نام دشمنی سے ناواقف تھیں بلی جانتی تھیں کہ رضیہ کی تو نورالامین کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت ہی نہ تھی مگر بلی کو پھر بھی سکون نہیں تھا۔ بس وجہ کوئی خاص نہیں۔ بلی نورالامین کی لاڈلی بہن تھی۔ وہ ان کی بہن کم، بیٹی تھی مگر جب نورالامین کی زندگی میں رضیہ آئی تو بلی کو لگا کہ اس کے بھائی کا بٹوارہ ہوگیا ہے۔ اب پیار اور توجہ پہلے جیسی نہ ملے گی۔ یہ خوف بلی کے دل میں زہریلے ناگ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ بس اسی خوف کے تحت بلی نے بھائی کے بیوی بچوں کو کبھی دل سے اپنا نہ سمجھا۔ بس بھائی کے سامنے اچھا بننے کا ناٹک کرتیں اور انہیں برا بنا کر بھائی کے سامنے مظلوم بنی رہتیں۔ اور آنکھوں پر بہن کی محبت کی جو پٹی بندھی ہوئی تھی اس نے کبھی بہن کے یہ ناٹک سمجھنے ہی نہ دیے۔ انہیں تو صرف ہمیشہ یہی لگا کہ دنیا میں اگر کوئی معصوم ہے تو وہ بلی ہے۔ کوئی پارسا ہے تو بلی ہے۔ کوئی مظلوم ہے تو بلی...... کوئی سچا ہے تو بلی...... بلی سے آگے اور بلی سے پیچھے انہیں کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھے کہ ان کی محبت کے بدلے میں بہن بھی ان کے واری صدقے جاتی ہے مگر آج جب کنگن کی چوری والی بات کھل کر سامنے آئی تو انہیں لگا کہ بہن کی چاہت کے اس سفر میں وہ تنہا تھے۔ ان کی محبتیں یک طرفہ تھیں۔

انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو ہمیشہ لالچی، مطلبی اور خودغرض سمجھا۔ دل میں ہمیشہ بہن کا مقام اونچا رکھا۔ باقی سب کا دوسرا نمبر رہا۔ اس پہلے دوسرے نمبر کے چکر میں وہ بے حساب زیادتیاں کرتے چلے گئے۔ انہیں ایک بار بھی احساس نہ ہوا کہ محبتیں بھی توازن مانگتی ہیں ہر رشتے کے درمیان۔ آج انہیں ڈھیروں پچھتاوے تھے۔ مگر اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہ تھے۔ وہ گھر کے سربراہ تھے۔ کسی کے باپ، کسی کے شوہر تھے۔ اب وہ جھک کر اپنی زیادتیوں کا اعتراف کیسے کرتے؟

بس اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ آج انہوں نے تلافی اس صورت میں کی کہ طلحہ نے اس گھر کی خوشی اور سکون کے لیے جو فیصلہ کیا، اس پر انہوں نے پہلی بار اختلاف نہ کیا اور طلحہ کا فیصلہ یہ تھا کہ بلی پھپھو کو اب ان کے سسرال رخصت کر دینا چاہیے کیونکہ بہنیں اور بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ طلحہ جان گیا تھا کہ بلی پھپھو نے ساس کے منصب پر فائز ہوتے ہی اس گھر پہ حکمرانی کے مختلف منصوبوں پر غور وفکر شروع کر دیا تھا۔ بلی پھپھو نے حکومت کے جو نئے اصول وضع کیے تھے وہ ہرگز بھی اس گھر کی خوشیوں اور سکون کے لیے نہیں تھے۔ اس لیے بلی پھپھو کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ بلی پھپھو اپنا گیم بگڑتا دیکھ کر ہکا بکا تھیں مگر اب کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا۔ طلحہ نے نعیم پھوپھا کو فون کر دیا تھا، وہ بلی پھپھو کو لینے آنے والے تھے۔

بلی پھپھو نورالامین کی خاموشی پر حیران تھیں کہ جان چھڑکنے والا بھائی آج انہیں روک نہیں رہا تھا۔ نورالامین نے بلی کو کچھ بھی نہیں جتایا تھا مگر چہرے کی سنجیدگی ان کے اندرونی کرب کی غماز تھی کہ انہیں بلی سے ایسی امید نہ تھی اور بلی پھپھو اب ساری زندگی اس سوال کے جواب کی تلاش میں رہیں گی کہ نورالامین نے انہیں روکا کیوں نہیں؟

کیونکہ اس بات سے بلی پھپھو بالکل بے خبر تھیں کہ نورالامین آگہی کے اس دور سے گزر رہے تھے کہ جس میں ان پر انکشاف ہوا تھا کہ کسی کے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھنا غلط نہیں۔ مگر ان جذبوں اور محبتوں میں بے اعتدالیوں کا تاوان دوسروں سے وصول کرنا غلط ہے۔ حالات وواقعات نے یہ بات نورالامین کو بہت اچھی طرح سے سمجھا دی تھی۔

☆

سلوک ناروا کا اس لیے شکوہ نہیں کرتا
کہ میں بھی تو کسی کی بات کی پرواہ نہیں کرتا

بہت ہوشیار ہوں اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں
میں دل کی بات کو دیوار پہ لکھا نہیں کرتا

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تنہا نہیں کرتا

زمیں پیروں سے کتنی بار ایک دن میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پہ دل مگر چھوٹا نہیں کرتا

تیرا اصرار سر آنکھوں پر تجھ کو بھول جانے کی
میں کوشش کر کے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا

جمال احسانی

وہم

وہ نہیں ہے
تو اس کی چاہت میں
کس لیے
رات دن سنورتے ہو
خود سے بے ربط باتیں کرتے ہو
اپنا ہی عکس توڑنے کے لیے
خود سے الجھتے ہو، خود سے ڈرتے ہو
ہم نہ کہتے تھے
ہجر والوں سے آئینہ گفتگو نہیں کرتا

محسن نقوی

یاد موسم وہ پرانے آئے
زخم سہنے کے زمانے آئے

دل کی دہلیز پہ یادوں کے ہوا
کون آواز لگانے آئے

اب کہاں تاب لہو رونے کی
اب نہ وہ خواب دکھانے آئے

لوگ جیتے ہیں لہو پی کے یہاں
ہم کہاں پیاس بجھانے آئے

ہر غزل میں ہے چھپا وہ چہرہ
کوئی گھونگھٹ تو اٹھانے آئے

شاخ پھولوں سے جھکی جاتی ہے
کوئی تو ہاتھ بڑھانے آئے

صبح جب ہو تو قمر مثل صبا
پھول رکھنے وہ سرہانے آئے

قمر اقبال

جلا دیا ہے اگر آپ نے قفس میں چراغ
تو کیا سمجھ لیں ؟ ہمیں مل گیا سحر کا سُراغ

سُنا تو ہے کہ پرندے کبھی چہکتے تھے
سُنا تو ہے کسی آزاد سلطنت میں تھے باغ

یہ عہد اور ہے لیکن وہ اک زمانہ تھا
کہ فاختہ کا گراتے تھے کم ہی گھونسلہ، زاغ

پھر ایک عہد تھا، جس میں سبھی تھے نوحہ کناں
کسی عدو کو نہیں تھا شہادتوں سے فراغ

صدا نہ آتی تھی کوئی کسی بھی خیمے سے
سوائے اس کے کہ پیاسوں کے ٹوٹتے تھے ایاغ

ہیں زندہ اپنے مکانوں میں جلنے کب تک ہم
بھرا ہوا ہے رعونت سے پاسباں کا دماغ

شہید جو بھی جہاں ہے، لہو لہو ہے ظفر
نجانے زخم ہیں کتنے، نجانے کتنے ہیں داغ

صابر ظفر

احمقانہ سوال

ایک خاتون رکشہ کی زد میں آ کر فٹ پاتھ پر گر گئیں اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ایک نوجوان نے بھیڑ میں کھڑے اپنے دوست سے ایمبولنس منگوانے کے لیے کہا اور خود ان کی دل جوئی کے لیے ادھر ادھر کے سوالات کرنے لگا۔ مثلاً وہ کہاں رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کیا کرتے ہیں، بچوں کے نام کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ خاتون حادثے کی وجہ سے نروس تھیں مگر ہر سوال کا جواب بڑے اچھے انداز میں دے رہی تھیں۔

اچانک اس شخص نے ایک احمقانہ سوال کر دیا۔ ”خاتون! آپ کی عمر کتنی ہے۔“ اس پر وہ روہانسی آواز میں ٹانگ پکڑ کر کراہتے ہوئے بولیں۔

”ایسے ہنگامی موقع پر ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔“

راکٹ سائنس

ایک سردار جی کپ میں چمچہ چلاتے، چائے کی چسکی لیتے، برا سا منہ بنا کر کپ نیچے رکھتے اور چمچہ دوبارہ چلانے لگتے پھر کپ اٹھاتے چسکی لیتے، منہ بنا کر کپ نیچے رکھ کر چمچہ چلانے لگتے۔ جب پانچ چھ مرتبہ یہ عمل دہرا چکے تو چمچہ ٹرے میں پھینک کر محفل میں موجود لوگوں سے کہنے لگے۔

”لو بھئی دوستو! ایک بات تو طے ہو گئی۔“

دوستوں نے چونک کر پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

سردار جی یقین اور اعتماد سے بولے۔

”یہی کہ اگر چائے میں چینی نہ ہو تو چاہے لاکھ بار چمچہ چلالو چائے میٹھی نہیں ہوتی۔“

گھبراہٹ

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میں تو صرف تیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

”جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال جا رہا تھا۔“

حالت زار

ایک صاحب کو راستے میں اپنے دوست مل گئے، ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، منہ سے خون بہہ رہا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ صاحب پریشان ہو گئے اور دوست سے کہنے لگے۔

”اوہو یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری، آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔“

”رہنے دو، میں ابھی گھر سے ہی آ رہا ہوں۔“ دوست نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

پریشانی

”ڈاکٹر صاحب! میں بہت پریشان ہوں، مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے اتنی کہ میں اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے لگی ہوں۔“ ایک خاتون نے ماہر نفسیات سے اپنی پریشانی بیان کی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ماہر نفسیات نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب! بہت زیادہ باتیں کر کے میں اپنے آپ کو کتنا بور کرتی ہوں آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔“ خاتون روہانسی ہو کر بولیں۔

☆

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو سنے اسے (بغیر تحقیق کیے) بیان کردے۔" (مسلم)

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو اس کی تحقیق کیے بغیر آگے بیان کرنا یا اسے صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ جھوٹی ہو اور یہ بھی اسے بیان کرکے اپنے آپ کو جھوٹوں میں شامل کرلے۔ اس لیے پہلے ہر بات کی تحقیق ضروری ہے۔

ایثار،

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنگ تبوک میں بہت سے مسلمان شہید ہوگئے (میرا برادر عم بھی اس جنگ میں شریک تھا) میں اپنے بھائی کو تلاش کرتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ پانی پیو گے۔ اس نے کہا پیوں گا۔ پھر اس نے ایک دوسرے زخمی مسلمان کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ۔ جب میں اس زخمی کے پاس پہنچا تو وہ ہشام ابن عاص رضی اللہ عنہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔
"پانی پی لو۔"
ہشام نے میرے چچا زاد بھائی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
"پہلے اس کو پلاؤ۔"
جب میں واپس اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ جان جان آفریں کے سپرد کرچکا تھا۔ میں وہاں سے پلٹ کر ہشام کے پاس آیا کہ اس کو ہی پانی بلاؤں لیکن اتنی دیر میں وہ بھی انتقال کرچکا تھا۔ (دونوں نے ایثار سے کام لیا۔)

خود نمائی،

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ فرمایا۔
"یہ شخص دراصل یہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کی شخصیت کو دیکھیں۔"

غرور و تکبر،

ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہر روز نماز صبح کے بعد لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اسے اجازت نہ دی۔ اس شخص نے کہا۔
"آپ وعظ و نصیحت سے روکتے ہیں؟"
فرمایا۔ "ہاں۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح تو تکبر اور غرور میں مبتلا ہوجائے اور اپنے آپ کو تحت الثریٰ میں گرادے۔"

عافیت،

حامد لفاف رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا۔
"آپ کس حال میں ہیں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "میں اس آرزو میں ہوں کہ کسی دن تو مجھے عافیت ہو۔"
لوگوں نے کہا۔ "آپ آرام اور عافیت میں نہیں ہیں؟"
آپ نے فرمایا۔ "عافیت میں وہ ہوتا ہے جو معصیت اور نافرمانی کے قریب نہ جائے۔"

روح کا بخار،

مشہور حکیم جالینوس کا قول ہے۔

"جس طرح جسم کو بخار ہوتا ہے۔ روح کو بھی بخار ہوتا ہے اور روح کا بخار ناپسندیدہ لوگوں کو دیکھنا ہے۔"

اقوالِ زریں

- اپنی نیکی چھپانا آپ کی سوچ کا امتحان ہے اور دوسروں کے گناہ چھپانا آپ کے کردار کا امتحان ہے۔
- اچھی کتابیں اور اچھے دل ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی کتابیں ہمیشہ گرد اور اچھے دل ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتے ہیں۔
- اختلاف کے باوجود احترام سے پیش آنا، کمزوری نہیں خاندانی ہونے کی دلیل ہے۔
- احساس انسانیت کا سب سے بڑا رشتہ ہے۔ ایک دوسرے سے خونی ناتا نہ ہونے کے باوجود بھی یہ دلوں کو خونی بندھن میں باندھے رکھتا ہے۔

ناہید اسمٰعیل، کراچی

صبر و شکر

مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیر مصائب و تکالیف پر بہت صبر کرنے والے اور استقامت کے پیکر تھے۔ ایک مرتبہ ولید بن یزید سے ملنے دمشق روانہ ہوئے تو راستے میں چوٹ لگ کر پاؤں زخمی ہو گیا۔ درد کی شدت سے چلنا دوبھر ہو گیا۔ سخت تکلیف کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور دمشق پہنچ گئے۔

ولید نے فوراً طبیبوں کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے زخم کا بغور جائزہ لینے کے بعد پاؤں کاٹنے کی رائے پر اتفاق کیا۔

حضرت عروہ کو جب اس کی اطلاع کی گئی تو انہوں نے منظور کر لیا مگر پاؤں کاٹنے سے پہلے بے ہوشی کے لیے نشہ آور دوا کے استعمال سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں کوئی لمحہ اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں گزار سکتا۔

چنانچہ اسی حالت میں آلہ گرم کر کے ان کا پاؤں کاٹ دیا گیا پھر اپنا کٹا ہوا پاؤں سامنے رکھ کر فرمایا۔

"کیا غم ہے اگر مجھے ایک عضو کے بارے میں آزمائش میں ڈال کر باقی اعضاء کے سلسلے میں امتحان سے بچا لیا گیا ہے۔"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ انہیں خبر ملی ان کا بیٹا چھت سے گر کر انتقال کر گیا۔ انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی اور فرمایا۔

"اے اللہ! تیرا شکر ہے تو نے ایک جان لی اور کئی جانوں کو سلامت رکھا۔" (کیونکہ باقی بیٹے سلامت تھے۔)

اس واقعے کے بعد ولید کے پاس قبیلہ عبس کے کچھ لوگ آئے جن میں ایک بوڑھا اور آنکھوں سے اندھا شخص بھی تھا۔ ولید نے اس سے اس کا حال پوچھا اور اس سے بینائی کے ختم ہونے کا سبب دریافت کیا تو وہ بتانے لگا۔

"میں اپنے اہل و عیال اور تمام مال و اسباب لیے ایک قافلے کے ساتھ سفر میں نکلا۔ اہل قافلہ میں سے شاید ہی کسی کے پاس اتنا مال ہو جتنا میرے پاس تھا۔ ہم نے ایک پہاڑ کے دامن میں رات گزارنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ آدھی رات کے وقت جب سب میٹھی نیند سو رہے تھے، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اچانک سیلاب آ گیا۔ جو انسان، حیوان، مال اسباب میں سے سوائے ایک اونٹ اور میرے چھوٹے بچے کے علاوہ کچھ نہ بچا۔ میں ابھی اس ناگہانی آفت سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ میرا اونٹ بھاگ گیا۔ میں اس کے پیچھے گیا تو یک دم بچے کی چیخنے چلانے سے میرے قدم رک گئے، الٹے پاؤں بچے کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھیڑیے نے میرے معصوم لختِ جگر کو اپنے خونی جبڑوں میں دبوچا ہوا ہے اور وہ معصوم اس کے بے رحم جبڑوں میں اپنی زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔

یہ دلخراش منظر دیکھنے کے بعد میں پھر اس اونٹ کے پیچھے ہو لیا۔ جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے دولتی دے ماری، جس کی وجہ سے میری بینائی چلی گئی۔ اس طرح میں مال و عیال کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔"

اس کی یہ داستان سن کر ولید کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور اس نے کہا۔

"جاؤ عروہ بن زبیر سے کہہ دو تمہیں صبر و شکر مبارک۔ اس لیے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تم سے زیادہ غموں اور مصیبتوں کے مارے ہیں۔"

ایک دروازہ،

ایک بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کے شہر میں بہت ہی پہنچے ہوئے ایک بزرگ آئے ہیں۔ بادشاہ نے ان سے ملنے کی کوشش کی لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شہر کے کئی دروازے تھے۔ بادشاہ کبھی کسی دروازے کے پاس تو کبھی کسی دروازے کے پاس ان بزرگ کا انتظار کرتا لیکن دوسرے دن پتا چلا کہ وہ تو کسی اور دروازے سے چلے گئے۔ آخر کار بادشاہ نے سارے دروازے بند کروا دیے اور ایک دروازہ کھلا رکھ کر وہاں ان کا انتظار کرنے لگا۔ بزرگ کا وہیں سے گزر ہوا۔ جب بادشاہ کی ملاقات ان سے ہوئی تو بادشاہ نے کہا۔

"اب جا کر آپ سے ملاقات ہوئی ہے، جب میں نے شہر کے سارے دروازے بند کروا دیے۔"

بزرگ نے جواب دیا۔

"انسان کو رب کی راہ بھی اس وقت نصیب ہوتی ہے، جب وہ سارے دروازے بند کر کے صرف ایک دل کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔"

موتی مالا،

- میں خوش رہتا ہوں کیونکہ میں کچھ مانگتا نہیں ہوں۔
(آئن اسٹائن)
- یہ بھی مزے کی بات ہے سر توڑنا تو جرم ہے لیکن دل توڑنا جرم نہیں۔
(خدیجہ مستور)
- سفیر وہ ایمان دار شخص ہوتا ہے جو غیر ملکوں میں اپنے وطن کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔
(سر ہنری واٹسن)
- دنیا میں وہی لوگ سر بلند رہتے ہیں جو تکبر کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔
(شیخ سعدی)
- کردار کے بغیر علم برائی کی طاقت بن جاتا ہے۔
(گرو نانک)
- غصہ ہمیشہ حماقتوں سے شروع ہوتا ہے اور ندامتوں پر ختم۔
(ارسطو)
- میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔
- چھوٹی سچائی بولنا سکھاتی ہے اور بڑی سچائی خاموش رہنا۔
(ٹیگور)
- ہمارا نام اس روشنی کی طرح ہے جو سمندر کی لہروں کو رات کے وقت چمکا دیتی ہے، لیکن کوئی نشان ثبت کیے بغیر ہی معدوم ہو جاتی ہے۔
(ٹیگور)

خنساء احمد۔ کراچی

سال کا خرچ،

حضرت سہل تستری سے دریافت کیا گیا کہ آپ کس طرح اور کس قدر کھاتے ہیں تو انہوں نے کہا۔

"میرے تمام سال کا خرچ تین درہم ہے ایک درہم کا چاول کا آٹا، ایک درہم کا شہد اور ایک درہم کا روغن۔ اس سامان کے تین سو ساٹھ حصے کر لیتا ہوں اور ہر حصے سے روزانہ روزہ کھولتا ہوں۔"

لوگوں نے دریافت کیا۔ "آپ کا اب کیا عمل ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہر روز ایک درہم وزن سے زیادہ غذا نہیں کھاتا۔" یہ حضرت بتدریج اس منزل تک پہنچے تھے۔

شرائط،

ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعوت کی۔ آپ نے فرمایا۔

"تین شرائط پر تیرے گھر آؤں گا۔ ایک یہ کہ بازار سے کچھ نہ لانے۔ دوسری یہ کہ جو کچھ گھر میں ہو اس میں سے کچھ بچا کر نہ لے جا۔ تیسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کا پورا حصہ بچانا۔"

خالدہ جیلانی

فائقہ سہیل ——— کراچی

بلرنے والوں نے اس رُخ سے بھی سوچا ہو گا
سر کٹتا ہے تو ہتھیار نہ ڈلے جائیں

خنساء زریاب ——— پتوکی

بھلا ہم ملے بھی تو کیا ملے، وہی دوریاں وہی فاصلے
نہ کبھی ہمارے قدم بڑھے نہ کبھی تمہاری جھجک گئی

شزا معاذ ——— راولپنڈی

سلیقہ عشق میں میرا کمال تھا
کہ اختیار بھی دل پر عجیب مثال کا تھا
محبتوں میں بس قائل تھی لب نہ کھولنے کی
جواب ورنہ میرے پاس ہر سوال کا تھا

قرۃ العین حسن ——— دبئی

عجیب شرطیں لگاتی ہے محبت کی تجارت بھی
میرے حصے میں لاگت بھی، خسارہ بھی، مشقت بھی

ربیعہ احمد ——— کراچی

ہمارے دور کی صاحب کمال خوبی ہے
کہ نشتر کو خنجر سے بڑھ کر نشتر کیا جائے

ثمرہ شبیر ——— دھوراجی

یہ چاہتوں کے سلسلے اور بے خودی ذرا ذرا
وہ مختصر سی خواہشیں اور عاشقی ذرا ذرا

سحر احمد ——— کراچی

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ، یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے

حبا نفیس ——— لاہور

وقت رخصت آ گیا، دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اس کو ہم کیا کھوئیں گے، جس کو کبھی پایا نہیں

ماریہ گل، حنا گل ——— کراچی

ان کی نظر میں میری تباہی کے واسطے
اتنا خلوص تھا کہ شکایت نہ ہو سکی

روبینہ بٹ ——— راولپنڈی

چشم پُرنم خرید سکتا ہوں
زلف برہم خرید سکتا ہوں
تُو اگر اپنا بنا لے مجھ کو
تیرا ہر غم خرید سکتا ہوں

عصمت اکرم ——— لاہور

میری وحشت علاج غم ہوئی ہے
کہ رونے سے اذیت کم ہوئی ہے

فرح عالی ——— پی ای سی ایچ ایس

خود کو دیتے ہی رہے ترک تعلق کا فریب
اور در پردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے

لبنیٰ بٹ ——— میانوالی

مدت ہوئی ہے اک حادثہ عشق کو لیکن!
اب تک ہے تیرے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

نہ میں نے اس کو خط لکھے نہ اس نے میری پناہ چاہی
خود اپنی اپنی جگہ پہ ہم کو ملال کتنا عجیب سا تھا
سفر اکیلے ہی کاٹ لو گے یہ پوچھا تو دو پڑا وہ
جواب کتنا عجیب سا تھا سوال کتنا عجیب سا تھا

اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

نادیہ یاسر ——— گوجر خان

میں دریا سے بھی ڈرتا ہوں تم دریا سے بھی گہرے ہو
کون سی بات ہے تم میں ایسی، اتنے اچھے کیوں لگتے ہو
پیچھے مڑ کر کیوں دیکھا تھا، پتھر بن کر کیا تکتے ہو
اپنے شہر کے سب لوگوں سے میری خاطر کیوں الجھتے ہو

بقیہ خط آپ کے

کبھی ایسے شخص سے نہ کریں جس کی اپنی کوئی سمجھ سوچ نہ ہو۔ بندھن میں احتل عزیز کا شادی کا احوال اچھا لگا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ گزشتہ موسم اور نیا سورج پر سروے زبردست رہا۔ قارئین بہنوں نے بہت عمدہ لکھا۔

ج: پیاری تسنیم! مفصل اور جامع تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔

زینب نور جہانیاں سے لکھتی ہیں

اب کی بار آپی رہنے آئی ہوئی تھیں۔ چار جنوری کی شام کو پتا چلا کہ بھائی آپی کو لینے آرہے ہیں۔ ہم نے ابو کا فون اٹھایا اور خاموشی سے سیڑھیوں پہ چڑھ کر بھائی کو فون کیا۔ "بھائی وہ لیتے آئیے گا" بھائی نے کہا۔ ٹھیک ہے، جب آجاؤں تو بیٹھک کی الماری کے سب سے نچلے خانے سے اٹھا لینا" یوں چار جنوری کی رات ہماری شعاع کے ساتھ گزری۔ صبح ٹائم پہ اٹھنے میں مجھے کبھی زیادہ مشکل نہیں ہوئی، چاہے رات دیر تک جاگتی رہوں۔ اب بھی جلدی تو اٹھ گئی مگر پٹھوں کا اکڑ کر جو حال ہو چکا تھا، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ امی اکثر ہی کہتی ہیں کہ آج کل کی لڑکیوں کا اتنی سی عمر میں یہ حال ہے تو ہماری عمروں کو پہنچ کر تو منجی ہی لگ جائیں گی۔

سرورق بے انتہا خوب صورت۔ جیولری ہمیں بہت پسند ہے۔ (صرف دیکھنے کی حد تک)

صفیہ مہر اور خانیہ بلال...... آپ کا دوستی سے بڑھایا گیا ہاتھ میں نے تھام لیا، لیکن یاد رہے، میں دوستوں کو بے حد عزیز رکھتی ہوں، بھولنے کی غلطی مت کیجیے گا۔ کیا نعتوں کی کاپیاں جلا دینا ٹھیک عمل ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔

خطوط کے بعد سروے کا جائزہ لیا، عندلیب زہرا کے جوابات اچھے لگے۔ لگتا ہے سب کے قلم دسمبر کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے، اتنے اداس......؟ واللہ۔

کہانیوں میں سب سے پہلے شام کی حویلی پڑھی۔ نہ جانے اس حویلی پہ سورج کب طلوع ہوگا؟ "عسر یسرا" حسنہ حسین، باکمال، بہترین، زبردست مجھے نہیں لگتا جنت ایسی ہے۔

کیا مدرسہ نور القلوب میں، پس پردہ اسمگلنگ کا کام ہو رہا ہے؟ بھئی مجھے تو ایسا ہی لگا۔

ماہا اور تبسم خیریت سے ہیں ناں؟ بھئی حاضری تو لگوا جائیں آکر۔

ایک بات پوچھنی تھی۔ شہر تمنا میں نعیمہ ناز نے دو باتیں واضح نہیں کیں۔ ایک تو یہ کہ زین (مانی کا دوست) کے مرڈر کیس کا کیا بنا؟ زین کے والد نے اس سسٹم میں رہ کر کس طرح اپنے جوان بیٹے کے قتل کا بدلہ لینا تھا؟ امداد بروہی اور ولی بروہی کا انجام کیا ہوا؟

میں شادی کے احوال لکھ سکتی ہوں۔

ج: پیاری زینب! خط شائع نہ ہونے کی وجہ ہماری پسند یا ناپسند نہیں ہوتی بلکہ صفحات کی مجبوری ہوتی ہے۔

بہن کوثر خالد نے خط میں نعتوں کی کاپیاں جلانے کے متعلق جو لکھا ہے۔ ان کاپیوں میں نعتیں نہیں لکھی تھیں بلکہ یہ وہ کاپیاں تھیں جو انہوں نے نعتیں لکھنے کے لیے خریدی تھیں۔

پیاری بہن! ایک بات نوٹ کرلیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اگر کسی بات کی وضاحت نہ ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جو آپ کو غلط لگے تو اس کو سہو سمجھیں کیونکہ بھول چوک انسان سے ہی ہوتی ہے۔ کسی کے ایمان پر شک نہ کریں۔

نور القلوب ایک دینی مدرسہ ہے اور وہاں اسمگلنگ کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ وہ لڑکی جو صندل بی بی کے پاس آتی ہے۔ وہ لاریب ہے یا کوئی اور یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔

زین کے مرڈر کیس، امداد بروہی اور ولی بروہی کا کیا انجام ہونا تھا۔ وہی جو ہماری عدالتوں میں ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں انصاف کے علاوہ باقی سب کچھ ہوتا ہے۔

بسمہ شانزے پارس نواب نے کراچی سے لکھا ہے

بہت سے موسم بیتے، سردی گرمی...... کتنے لمحے اپنے اندر یادوں کے سمندر سموئے دبے پاؤں گزرے۔ بہت بار روئے، بہت بار ہنسے پر شعاع، خواتین اور کرن کا ہمیشہ کسی پکی سہیلی کی طرح ساتھ رہا۔ ڈائجسٹ کے ساتھ

گزرے لمحات انمٹ ہیں۔

خاموشی توڑنے کی وجہ، اکتوبر کے شمارے میں موجود میڈم رابعہ خان کا تبصرہ ہے۔ ان کی کسی بات سے میں انکاری نہیں ہوں۔ میں اپنے اساتذہ کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ میم نے بجا فرمایا کہ ریٹائرمنٹ ساٹھ سال کی عمر میں ہوتی ہے، پر آپ یقین جانیے یہ آنٹی اکثر دوپہر کے وقت آتی تھیں اور یہی فرماتیں کہ میں اسکول سے آئی ہوں۔ ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کرتیں اور یہ تاثر دیتیں جیسے ابھی ریٹائر نہیں ہوئیں۔ ان فیکٹ اس افسانے میں محترمہ کے جو مکالمات میں نے لکھے ہیں، صحیح اور ان کے اپنے ادا کیے گئے الفاظ یا جملے ہیں۔ خیر آپ سے پہلے میری بہن مجھے میری غلطی کا احساس کروا چکی ہیں کہ مجھے کسی کے بارے میں اس طرح نہیں لکھنا چاہیے۔ پر آپ کو برا لگا اس کے لیے معذرت۔

ایک بات میں میڈم کے علم میں لانا چاہتی ہوں کہ ہمارے گھر کیبل نہیں ہے اور نہ میں نے کوئی فلم دیکھی ہے۔

☆ پیاری بسمہ! آپ کا جواب رابعہ خان تک پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں۔ کہانی کو شائع ہوئے چار پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ دوسری بات کہ آپ نے ایک افسانہ لکھا تھا۔ سچی کہانی نہیں۔ افسانے فرضی بھی ہوتے ہیں۔ تھوڑی بہت مماثلت کسی سے ہو تو اس سے فرق نہیں پڑتا۔

امرحہ حسین لکھتی ہیں

ماڈل کے ساتھ ساتھ میک اپ بھی بہت خوب صورت تھا۔ اس کے بعد سیدھا "پہلی شعاع" پر پہنچے۔ جیسا کہ آپ نے کہا کہ گزشتہ سال خوف اور پریشانیوں کے سائے تلے گزرا تو بالکل ٹھیک کہا۔ کیونکہ میرے لیے 2020ء بہت ہی برا سال رہا اور نئے سال کے متعلق بھی بہت سے خدشات نے جکڑا ہوا ہے۔ "حمد و نعت" سے لطف اندوز ہو کر ہم نے ایک اونچی چھلانگ "عمر یسرا" کی طرف لگائی۔ حسنہ حسین آپ نے تو دل جیت لیا ہے۔ جب ہماری نظریں باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ پر پڑیں تو کیا بتاؤں، جو حالت ہوئی۔ اتنا ظلم نہیں کیا کریں پلیز۔ اس کے بعد "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر ذہن و دل کو سکون ملا۔ اللہ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بلاشبہ ایک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ "بندھن" میں اصل عزیز شہزاد کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ دسمبر کے بارے میں قارئین کے جوابات پسند آئے۔

"نور القلوب" بہت دلچسپ جا رہا ہے۔ بس اللہ کرے خوشل لاریب کو چھوڑ دے یا لاریب سگریٹ پینا چھوڑ دے۔ "شام کی حویلی" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ نوشین فیاض کا پچھلا ناول بہت دلچسپ تھا پر اس بار "شب آرزو" کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ حمیرا شفیع کا ناولٹ تو ماشاءاللہ......

اب اگر افسانوں کی بات کی جائے تو تمام عمدہ تھے۔ سب سے زیادہ مزا تو خطوط پڑھنے میں آتا ہے اور ایک بات اور، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ پورے سال کسی ایک مہینے میں قارئین رائٹرز کو خط لکھیں اور وہ ان کا جواب دیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو بہت اچھا ہوگا۔

☆ پیاری امرحہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آنے والے تمام سال آپ کے

دعائے مغفرت

ہماری ساتھی ثوبیہ قطب کے بہنوئی ریحان عادل شامی طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ادارہ ثوبیہ قطب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

لیے خوش گوار ثابت ہوں۔ پچھلے سال آپ جن پریشانیوں سے گزریں، اس سال ان کا سامنا نہ ہو۔

باقی آئندہ تو ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا لیکن کہانی طویل ہو تو قسطوں کی شکل میں شائع کرنا پڑتی ہے۔ جہاں تک انتظار کی بات ہے، انتظار تو واقعی کٹھن ہوتا ہے لیکن انتظار کے بعد جو چیز ملتی ہے اس کی خوشی بھی بہت ہوتی ہے۔

آپ کی تجویز اچھی ہے، اس پر ہم نے فوری عمل کیا ہے۔ سالگرہ نمبر میں یہ سلسلہ شامل ہوگا۔ آپ سوال بھجوادیں۔

حرم نواز ملغانی، بستی سوکڑ سے لکھتی ہیں

شعاع اور میرا ساتھ 2014ء سے شروع ہوا۔ اس طویل عرصے میں، میں نے ان ناولوں سے بہت کچھ سیکھا۔ کبھی نمرہ احمد نے اپنے ''نمل'' سے ہمیں بہت کچھ سکھایا۔ کبھی آمنہ ریاض نے اپنے ''دشت جنوں'' سے ہمیں خوف دلایا۔ کبھی سمیرا حمید نے اپنے ''یارم'' سے خوب ہنسایا۔ کبھی عمیرہ احمد نے اپنے ''الف'' سے جینا سکھایا۔ اس طویل عرصے میں، میں نے خط کبھی نہیں لکھا۔ اب میرے خط میرا بھانجا عبداللہ پوسٹ کراتا ہے۔ اسے بھی ان شماروں کا شوق ہے۔ ہمارے گھر کے قریب ایک کباڑ خانہ ہے۔ جہاں پتا نہیں کس نے رسالے بیچے، یقین مانیے پورے سات بڑے بڑے گٹھر تھے۔ وہ جب بھی وہاں جاتا، وہاں سے رسالے لے آتا اور مجھے بھی پڑھنے کو دیتا اور خود بھی پڑھتا۔ اور اب ہم دونوں اکٹھے رسالے لیتے ہیں۔

سب سے پہلے ''عسر یسرا'' پڑھا۔ اس میں جنت کا کردار بہت خوب ہے۔ اس کے بعد سارا رسالہ پڑھا، بہت خوب۔

☆ پیاری حریم! ہمیں بے حد افسوس ہے، آپ نے اتنی محبت سے خط لکھا اور ہم شامل نہ کرسکے۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں دوبارہ خط لکھا۔ ہم آپ کا خط شامل کررہے ہیں۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے رونق محفل ہیں

ثمینہ اکرم سے مل کر خوشی ہوئی۔ معیز کا غم اپنی جگہ مگر وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ نیک اولاد ملی۔ تبصرہ کے الفاظ افسانہ ہی لگے، واہ۔ زینب نور اچھی سوچ کی مالک ہے۔ تبسم اور ماہا کی امی کو صحت کی دعائیں اور فوزیہ ثمر کے لیے دعائے استقامت قبول ہو۔ جب لوگ دھکے دیں اور ہم صبر کریں تو اللہ مل جایا کرتا ہے۔

ارے ہم تو اپنی آدھی گلی تک جب جھاڑو پھیرتے ہیں تو لوگ ہمیں پاگل سمجھتے ہیں۔ مگر ہم لگے رہتے ہیں اور کل تو ربیع (پانچ سالہ) نے دو گھروں تک گلی صاف کی۔ سامنے والے بچے بھی دیکھ کر لگ گئے۔ مگر آج طلال نے ساری گلی گندی کردی۔ ہم سے ڈر کر بھاگ گیا۔

''پہلی شعاع'' اس ربیع الاول میں کافی نعتیں پڑھیں، جو پسند کی گئیں۔ راہ روک کر لوگ سلام کرتے ہیں۔ پوچھتے ہیں، لوگوں کو بیٹی پر لکھا، بیٹے کی طرف سے گلہ بھی بہت پسند آیا۔ آپ کو کیسے سناؤں؟ طویل ہے۔

میں منتاں کرکر ہار گیا مری بہن میرے گھر آوندی نہیں
میں دھمکیاں دے کے ویکھ لیا، مری بہن مرے گھر آوندی نہیں

''حمد و نعت'' واصف علی واصف کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ حمد و نعت کے علاوہ ان کے اقوال بھی دیا کریں کیونکہ کتابوں تک رسائی ممکن نہیں سب کی۔ آمنہ زریں کو واپس دیکھ کر خوش ہیں۔ لاجواب قلم و ذہن کی مالکہ ہیں، حیران کردیتی ہیں۔

''جب تجھ سے ناتا جوڑا'' بہوؤں سے عرض ہے کہ جیسی ساس وہ چاہتی تھیں نہ ملی، تو اب وہ خود ویسی بن کر دکھائیں تاکہ تبدیلی آئے۔ اور یہ قدم ہم اٹھا چکے ہیں اور امن و امان کی فضا تک رسائی کرلی ہے۔ ''نور القلوب'' دلچسپ، پراسرار ابتدائیہ ہے۔ تنزیلہ جی کا نام ہی کافی ہے۔

''شہر تمنا'' یہ سوپ سیریل تھا، ہم نے ناواں ناواں پڑھ کر کہانی جان لی۔ ہمیں تو ہیرو چاچا درزی ہی لگے۔ ''شام کی حویلی میں'' ابھی تو شام ہی ہے۔ صبح ہوگی تو بتائیں گے۔ ''عناد'' بہت محنت سے لکھا گیا، کچھ فلمی سا تھا مگر سبق اچھا رہا۔ ''وہ نازنین'' نازنین ہم اوپر والے پر ہی بھروسا رکھتے ہیں اور مصیبت کا تو کبھی نام بھی نہیں لیا۔ ہر امتحان کو اپنی سزا سمجھتے ہیں اور رب کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔ ہمیں تو یہ وجہ بھی پتا ہے کہ ہماری بیٹی ہمارے گھر کیوں نہیں آسکتی۔ بلکہ کچھ

آئندہ کے امتحان بھی معلوم ہیں جو ہوں گے۔

☆ پیاری کوثر! لوگ چاہے جو بھی سمجھیں، ہم تو آپ کو محبت بھرا دل رکھنے والی پر خلوص خاتون سمجھتے ہیں۔ گلی کی صفائی کرنا بری بات نہیں، اگر ہر شخص میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو گھروں کی طرح گلیاں بھی صاف نظر آئیں۔

نیک لوگوں کی زندگی میں مشکلات امتحان ہوتی ہیں، آزمائش ہوتی ہیں، سزا نہیں۔ جو لوگ ثابت قدم رہتے ہیں، صبر سے کام لیتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ اس کا صلہ دیتا ہے۔

اچھی بات ہے کہ آپ اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہیں۔

بختاور صدیقی انور......کراچی

میں تین سال سے شعاع، کرن پڑھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے سرورق ماڈل نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ پھر میں نے رخسانہ جی کے ناول پر چھلانگ ماری (میری مما کہتی ہیں، چھلانگیں مارنے میں تو میری بیٹی اے ون ہے) رخسانہ جی! یہ کیا کر دیا آپ نے۔ اب موحد اس کو کہاں ڈھونڈے گا (کہیں وہ موحد کے ساتھ ہی تو نہیں چلی گئی) اور یہ رمشا کے ساتھ اتنا ظالم نہ کریں۔ ایمان اور بلال کی جوڑی کچھ اچھی نہیں لگ رہی۔ افشین نعیم کا ''یار دل دار'' تو میرا موسٹ فیورٹ ہے۔

☆ پیاری بختاور! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے بہت اچھا خط لکھا اور بالکل درست اندازہ لگایا کشف کے بارے میں۔ اپنی قارئین کی ذہانت کے تو ہم دل سے قائل ہیں۔

اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

سندس مصطفیٰ بخاری خیر پور میرس سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے ''عمر یسرا'' پڑھا۔ فارس کے ساتھ تو اچھا ہی ہوا۔ شاید اب عقل ٹھکانے آجائے۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے پر مجھے سب سے زیادہ تعلق کا گھر پسند آیا۔ ناولٹ ''احساس'' بھی بہت پسند آیا۔ عائشہ نصیر احمد کا ''میری راہیں تیرے تک'' بھی اچھا تھا۔

''شب آرزو'' نوشین فیاض کا پسند آیا۔ نوشین جی! آپ کے قلم میں سحر ہے۔ ''نور القلوب'' بھی اچھی ہے۔ تنزیلہ ریاض کو میں پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ تنزیلہ میری امی کی فیورٹ رائٹر ہیں۔ ''تجھ سے ناتا جوڑا'' بہت اچھا ہے، بھی بندمت کرنا۔ فرح بخاری میری ایک درخواست ہے کہ بہت ہی اچھی اسٹوری لے آئیں۔ پلیز آپی! بلال عباس خان کا انٹرویو کریں اور میری خالہ حبا بخاری کہہ رہی ہیں، حبا بخاری کا انٹرویو بھی کریں۔

☆ پیاری سندس! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی خالہ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔

گڑیا راجپوت جاتری شریف سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے شعاع لینے بھائی پھیرو مجھے خود جانا پڑا۔ ایک تو مجھے ''عمر یسرا'' پڑھنے کی جلدی تھی، دوسرا اپنا خط۔ ماسٹر بک ڈپو سے خرید کر بینچ و مشین کٹ پیس تک پہنچتے تک میں پیدل چلتے دوبارہ سارے خط کھنگال چکی تھی۔ لیکن مجھے اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔ ایک دو یہاں تک کہ پانچویں بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے۔ یہ نمی گھر آنے تک برقرار رہی۔ ٹائٹل گرل بہت پسند آئی۔ خاص کر ہیئر کلر اور لڑکی کے خوب صورت ہاتھ (ہاتھوں کی خوب صورتی میری کمزوری ہے)۔ حمد باری تعالیٰ دو لوگوں نے لکھی کیا؟ ''بندھن'' میں امت العزیز آپی سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ''گزشتہ موسم اور نیا سورج'' زینب نور کو پڑھ کر ہنسی آئی اور اقتباس پسند آیا

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ حمیرا شفیع کی والدہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ حمیرا شفیع کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ حمیرا شفیع اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

نعیمہ صفدر کا۔ ''نورالقلوب'' میں تہجد والا پوائنٹ دل کو چھوگیا۔ خوشگل کی کوکین خان، بابالاریب کے نہیں، خوشگل کے دماغ کو چڑھ جائیں گے۔ ''عمر یسرا'' حسنہ حسین آپ کی تعریف...... قسم سے کیا کروں۔ الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ ''خط آپ کے'' کوثر خالد آنٹی کی باتیں متاثر کن تھیں۔ فوزیہ ثمر اور فائزہ بھٹی کی کمی محسوس ہوئی۔ فائزہ آپ کے دوسرے افسانے کے منتظر ہیں۔ صفیہ نے پوچھا گڑیا لفظ منحوس کیوں لگتا ہے۔ بڑی بات تو نہیں بس مجھے خود کے لیے سوٹ ایبل نہیں لگتا۔ خانیہ بلال کیا آپ کو میری یاد نہیں آئی اور آپ کو تو ڈاکٹرز کو اہمیت دینے کا بہت شوق ہے۔ ڈاکٹر ہانیہ کو بھی دیکھیے۔

☆ پیاری گڑیا! اچھا ہوا آپ نے ایڈیٹ کرنے والی بات خود ہی واپس لے لی ورنہ ہم امتحان میں پڑ جاتے۔ ہم اپنی گڑیا کو کھونے کی ہمت نہیں رکھتے اور ایڈیٹ کیے بغیر خط شائع کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہمیں اپنی دیگر قاری بہنیں بھی بہت عزیز ہیں جو اتنی محبت سے ہمیں خط لکھتی ہیں اور یہ آپ سے کس نے کہہ دیا بھئی کہ ہم ڈاکٹرز کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، ہم اپنی تمام قارئین کو اہمیت دیتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چھوٹے شہروں اور گاؤں سے جو قارئین خط لکھتی ہیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خط ضرور شامل ہو جائیں کیونکہ وہ بہت ساری دشواریوں سے گزار کر اور اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا کر خط پوسٹ کراتی ہیں۔

شہرین اسلم...... چوک شاہدرہ بہاول پور

میرے جڑواں بھائی عمیر، غذیر نو سال کے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوتے ہیں میرا نام ڈائجسٹ میں دیکھ کر۔ بہت خوشی ملتی ہے اپنے سے زیادہ اپنے شہر کا نام دیکھ کر۔ پی کوز آئی لو مائی بیوٹی فل سٹی بہاولپور۔ ٹائٹل گرل پیاری لگی۔ ''تجھ سے ناتا جوڑا'' میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہن ط۔ غ کہنا کیا چاہ رہی تھیں۔ ''بندھن'' میں امثل عزیز کا نام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، اچھا لگا ان کے بارے میں جان کر۔ لیلیٰ زبیری واقعی اچھی اداکارہ ہیں۔ سروے میں زینب نور چھپکلی والے واقعے کو بہت انجوائے کیا۔ میں بھی بہت ڈرپوک ہوں مگر چھپکلی سے زیادہ چوہے سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ ابھی دو روز پہلے ہی صبح فجر کے وقت چوہا میری رضائی کے اوپر آ گیا۔ زوردار چیخ ماری، سب ڈر کر اٹھ گئے۔ بے چارہ چوہا چیخ سن کر بھاگ گیا، بعد میں اتنی سننے کو ملیں کہ ڈرنے کی کیا بات تھی، چوہا ہی تو تھا۔ ''شعاع کے ساتھ ساتھ'' لازمی دیا کریں۔

☆ پیاری شہرین! یہ تو آپ کے گھر والوں کی زیادتی ہے، رضائی کے اوپر سے چوہا گزرتے دیکھ کر آپ کی چیخ نکلی تو یہ بالکل جائز بات تھی۔ ہماری تو چوہے اور چھپکلی دونوں سے ہی جان جاتی ہے ساتھ ساتھ گھن بھی بہت آتی ہے۔

مافیہ ارشد پسرور سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے سرورق پر ماڈل اچھی نہیں لگی، سوری۔ ''پہلی شعاع، حمد و نعت'' پڑھی۔ ''نبی کی باتیں'' پڑھ کر ایمان کر تازہ ہو جاتا ہے۔ ''بندھن'' میں امثل عزیز سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ ''دستک'' میں لیلیٰ زبیری سے بھی ملاقات اچھی رہی۔ ویسے امثل جی کی ایک لائن بہت اچھی لگی کہ خود بھی سکون سے رہو اور دوسروں کو بھی رہنے دو پر یہاں نہ کوئی خود سکون سے رہتا ہے نہ دوسروں کو رہنے

دعائے مغفرت

ہماری مصنفہ امت العزیز شہزاد کی والدہ محترمہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں جیسی نعمت کا سر سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم بہن امت العزیز کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

دیتے ہیں۔ آپی جان! آپ نے کہا کہ پورا نام لکھنا اگلی دفعہ۔ تو لیں جی لکھ دیا۔ لیکن سب ہی پڑھ کر یہ بولیں گی کہ یہ کیسا نام ہے، بھلا یہ بھی نام ہے تو سن لیں دوستو میں جہاں پیدا ہوئی وہاں مجھ سے پہلے چار آپیاں موجود تھیں۔ بھائی ایک تھا تو سب نے مل کر میرا یہ نام رکھا کہ اللہ بس کریں، معافی دے دیں اور بیٹیاں نہیں لگتی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پھر چار بیٹے دیے اور بڑی بیٹی واپس لے لی۔ پانچ بیٹے ہوگئے اور چار بیٹیاں۔ میرا نام تو یہی رہ گیا جو رکھ دیا گیا۔ کسی نے بدلنے کی زحمت نہیں کی۔ میں نے کہا بھی لیکن کسی نے سنی نہیں اور آج کل سنتے صرف اس کی ہیں جس سے پیار ہو تو ہم سے کون پیار کرتا بھئی۔ بن مانگی بارش، ابو کو تو کبھی بھی بیٹیاں اچھی نہیں لگیں۔ ہمیشہ شیر کی نظر سے ہی دیکھا۔ خیر ہمارا اللہ تو ہے اور کوئی نہیں تو آپیوں میں تو صبر و برداشت ہے، لیکن مجھ سے نہیں ہوتا۔ میرے ہم عمر بھائیوں کو اتنا پیار، مجھے کیوں نہیں۔ میرا کیا قصور ہے، میں تو شاید پاگل ہی ہو جاتی اگر شجاع سے دوستی نہ ہوتی۔ ابو جی بے شک ہم سے پیار نہیں کرتے لیکن چھوٹے بھائی بہت پیار کرتے ہیں۔ پرچا لا کر بھی دیتے ہیں اور خط بھی پوسٹ کرواتے ہیں۔ بھائی لکھنے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ اب میں ہوں، بھائی ہیں، آپیاں اپنے اپنے گھروں والی ہو گئیں۔ ایک بھابھی ہے باقی چھوٹے ہیں۔ میرے پیارے بھائی ہمارے گھر کی رونق ہیں۔ ”خط آپ کے“ میں پیاری بہن صفیہ مہر آپ کو نیہا پر غصہ کیوں آیا۔ جب کسی سے بندھی ہوئی کوئی امید ٹوٹتی ہے تو انسان پاگل سا ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ اوپر سے شوہر نفسیاتی مریض، اسے تو غصہ عثمان پر ہی آتا تھا کہ یہ اگر میرے ساتھ ایسا نہ کرتا تو یہ سب بھی نہ ہوتا۔ ہم انسان ہیں، فرشتے نہیں ہیں کہ کوئی غلطی نہ ہو ہم سے اور اگر آپ کو برا لگے تو سوری۔

☆ پیاری! مافیہ! غصہ آنا غلط نہیں ہے۔ غصہ کا اتنی دیر رہنا غلط ہے۔ ہماری جب عمر بڑھتی ہے تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ان مٹ ہے جو نصیب میں ہوتا ہے، وہی ملتا ہے۔ دوسرے انتقام کا جذبہ اور اتنی لمبی پلاننگ کہ اپنی اولاد کو ہی مہرہ بنا دیا۔ نیہا کی اپنی بیٹی کے ساتھ بھی برا ہو سکتا تھا۔ غصہ آنا فطری ہے لیکن غصہ کا اتنی دیر قائم رہنا اور انتقام کا جذبہ غلط ہے۔

آپ یہ نہ سوچیں کہ ابو جی آپ سے محبت نہیں کرتے۔ محبت ضرور کرتے ہوں گے۔ کچھ لوگ اظہار کے معاملے میں کنجوس ہوتے ہیں۔ یہ بھی تو آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے چھوٹے بھائی آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔

بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔ عام مشاہدہ کی بات ہے جن گھروں میں بیٹیاں ہوتی ہیں، وہاں لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا جبکہ جن گھروں میں بیٹے ہوتے ہیں، وہاں سے اکثر جھگڑے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں پھر بیٹیاں باپ سے جتنی محبت کرتی ہیں، اتنی محبت بیٹے نہیں کرتے۔ وہ باپ کے گھر سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کے ہاتھ ہمیشہ میکے کی خوش حالی کے لیے اٹھے رہتے ہیں۔ ☆

ملکہ رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ خاندان غلاماں کے تیسرے فرماں روا سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی اور اسی خاندان کے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔

رضیہ سلطانہ بچپن سے ہی بڑی ذہین و فطین تھی۔ التمش جو علم دوست حکمران کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ رضیہ نے ابتدا میں قرآن پاک پڑھا، پھر بڑے بڑے علما سے مروجہ علوم کی تعلیم پائی، اس کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون حرب وضرب بھی سیکھے اور شہ سواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی میں بھی طاق ہوگئی۔

اس کے اعلا اوصاف کی وجہ سے التمش اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ اسے کاروبار حکومت چلانے کے گر بھی سکھاتا رہتا اور حکومتی امور میں اس سے مشورے بھی لیتا۔ اگر حکومتی امور کے سلسلے میں اسے دارالحکومت سے باہر بھی جانا پڑتا تو رضیہ کو اپنا جانشین بنا کر جاتا۔ حالانکہ اس کے بیٹے بھی موجود تھے، مگر وہ بیٹوں کے بجائے بیٹی پر زیادہ اعتماد کرتا۔ اس کی عدم موجودگی میں رضیہ نہایت خوش اسلوبی سے امور مملکت انجام دیتی۔

یوں التمش کے زمانے سے ہی رضیہ سلطانہ کو سلطنت کے امور سے واقفیت ہوگئی تھی۔ حکومت کے بہت سے پیچیدہ مسائل میں اس کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی۔ التمش کو اس کی فہم وفراست پر بے حد اعتماد تھا۔ گوالیار کی فتح کے بعد التمش نے اپنے چند خاص امرا کی موجودگی میں رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، ان امرا نے اس موقع پر التمش سے سوال کیا کہ۔

''آخر بیٹوں کے ہوتے ہوئے ایک بیٹی کو وارث تاج وتخت قرار دینے میں کیا حکمت ہے؟''

التمش نے جواب دیا کہ......

''میں بیٹوں کی عادات واطوار اور چال چلن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس وقت جبکہ وہ ہر لحاظ سے میرے دست نگر ہیں۔ بری طرح مے خواری اور عیش وعشرت میں مشغول ہیں، اسی وجہ سے میں انہیں حکمرانی کے قابل نہیں سمجھتا۔ رضیہ سلطانہ کو میں اپنے بیٹوں پر اس لیے ترجیح دیتا ہوں اگرچہ بظاہر وہ ایک عورت ہے لیکن عقل وپختگی کے لحاظ سے حقیقتاً مرد ہے۔''

رضیہ سلطانہ بلاشبہ بہادر اور جری خاتون تھی۔ وہ مردانہ لباس میں تمام ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار ہوکر باہر نکلتی تھی۔ ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ جب وہ شکار کو جاتے تو اپنے ساتھ حرم کی خواتین کو بھی لے جاتے۔ ایک مرتبہ التمش شیر کے شکار کو گیا۔ خواتین پیچھے تھیں کہ ایک شیر جنگل سے نکل کر بادشاہ پر جھپٹا عین اس وقت رضیہ برق رفتاری سے وہاں پہنچی اور تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ شیر وہیں پر ڈھیر ہوگیا۔ اگر وہ نہ پہنچی ہوتی تو بادشاہ بری طرح زخمی ہوگیا ہوتا۔ اس واقعے کے بعد التمش کی نظر میں رضیہ کی وقعت بڑھ گئی۔

التمش کے آٹھ بیٹے تھے۔ ایک بیٹا اس کی زندگی میں ہی انتقال کرگیا۔ باقی سات پر قابلیت اور حسن سیرت کے اعتبار سے وہ رضیہ کو ہی ترجیح دیتا، ایک روایت ہے کہ اس نے وفات سے پہلے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تاج و تخت سونپ دیا۔ لیکن اسکی دلی خواہش یہی تھی کہ اس کے بعد رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھے۔

التمش کی وفات کے بعد امرائے دربار نے عورت کی حکمرانی کو ناپسند کرتے ہوئے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش

اوراوباش نوجوان تھا۔ ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ سلطنت کا انتظام اس کی ماں شاہ ترکان چلاتی تھی۔ وہ بڑی سنگ دل عورت تھی۔ وہ ایک ترکی لونڈی تھی جس نے التمش کے حرم میں داخل ہو کر التمش پر برا اثر ڈالا تھا۔

یہ عورت نہایت کینہ پرور تھی اس نے اپنے بیٹے رکن الدین کی عیش کوشی سے بہت فائدہ اٹھایا اور التمش کی بہت سی بے نکاحی بیویوں کو بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ التمش کے حرم کی ترکی خواتین بھی اس عورت کی آتش حسد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

ترکان شاہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر یہ معزز خواتین مفلسی اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئیں۔ اس نے التمش کی اولاد پر بھی بہت ظلم ڈھائے، التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا قطب الدین، شاہ ترکان کے اشارے سے قتل کیا گیا۔ شاہ ترکان کے ان مظالم کی وجہ سے دلی کا ہر چھوٹا بڑا شخص رکن الدین کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آخر کار ۱۲۳۶ء میں دلی کے عوام اور فوج کے ایک حصہ کی جانب سے رکن الدین فیروز کو معزول کر کے رضیہ کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر کے بڑی شان وشوکت سے تخت شاہی پر متمکن ہوئی۔ حکمرانی کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے اس نے پردہ ترک کر دیا اور مردانہ لباس زیب تن کر کے دربار عام منعقد کیا۔ التمش کے عہد کے تمام ضابطے قوانین، جو طاق نسیاں ہو گئے تھے انہیں دوبارہ نافذ کیا۔ عوام الناس سے وعدہ کیا کہ ان کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہے کرے گی۔

رضیہ سلطانہ کے اوصاف حمیدہ کے باوجود وزیر سلطنت نظام الملک محمد جنیدی، علاؤ الدین شیر خانی، ملک سیف الدین کوچی، ملک اعز الدین کبیر خانی نے اس کو ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بغاوت کی تیاری شروع کر دی۔ ملکہ نے نہایت حکمت عملی سے ان میں پھوٹ ڈلوادی اور ان کو ایسا زچ کیا کہ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔

رضیہ سلطانہ کا دور حکومت نہایت عادلانہ تھا۔ وہ امیر غریب، مسلم غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتی تھی۔ مظلوموں کی فریاد سنتی، ظالموں کو سزا دیتی، شاہی ملازمین میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ رشوت لے۔ وہ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی لیکن گھوڑے پر سواری اسے بہت پسند تھی، جنگ کے وقت فوج کو خود مرتب کرتی اور اپنے سپاہیوں کو دوش بدوش داد شجاعت دیتی۔ اس نے قاضی کبیر الدین، قاضی نصیر الدین، قاضی سعید الدین اور قاضی جلال الدین پر مشتمل ایک مجلس قضا قائم کی جس کے مشورے سے جملہ احکام صادر کیے جاتے تھے۔

رضیہ سلطانہ نے نظام سلطنت کو چلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، لیکن اس کو امن وچین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کیونکہ بہت سے امرا اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے، اس کی وجوہ یہ تھیں کہ وہ عورت کی حکمرانی کو اپنے لیے باعث توہین سمجھتے تھے۔ اس کے مردانہ لباس اور بے نقاب آنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ تیسری وجہ ملکہ کا ایک حبشی غلام ملک جمال الدین یاقوت تھا جو شاہی اصطبل کا مہتمم تھا۔ اسے ترقی دے کر ملکہ نے میر شکار کے عہدے پر فائز کر دیا تھا اور اسے امیر الامرا کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس عنایت خسروانہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ملکہ کی جان بچائی تھی، وہ قابل اور باصلاحیت آدمی تھا اسی لیے ملکہ نے اسے ترقی کا اہل سمجھا، لیکن ترک امرا نے اس کو غلط معنی پہنائے اور اس کی ترقی کو انہوں نے اپنے لیے توہین سمجھا اور ملکہ پر تہمت طرازی کی۔ یوں ملکہ کے اقبال کا ستارہ تاریکی کے دامن میں آگیا۔

لاہور کے حاکم اعز الدین نے علم سرکشی بلند کیا۔ ملکہ خود لشکر تیار کر کے اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئی۔ حاکم لاہور کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے بغیر مقابلے کے اطاعت قبول کر لی۔ رضیہ کو

اعزالدین کا یہ انداز اطاعت بہت پسند آیا، اس نے خوش ہو کر لاہور کی حکومت کے ساتھ ملتان کی حکومت بھی اعزالدین کو دی۔ بھٹنڈہ کا حاکم ملک التونیہ جو، "ترکان چہل گانی" میں سے تھا (ترکان چہل گانی التمش کے چالیس غلام تھے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے) اس نے یاقوت حبشی کے اثر واقتدار سے تنگ آ کر رضیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔

اس کے جواب میں رضیہ نے اپنی فوج کو تیار کیا اور بھٹنڈہ پر حملہ کر دیا۔ شاہی فوج ابھی راستے میں ہی تھی کہ ترک امرا نے اس پر چھاپہ مارا اور اس معرکے میں ترکوں کو فتح ہوئی، یاقوت حبشی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور رضیہ سلطانہ کو قید کر کے بھٹنڈہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

ملکہ کی نظر بندی کے بعد ان باغی امرا نے ملکہ کے بھائی اور سلطان التمش کے بیٹے معزز الدین بہرام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

اسی دوران بھٹنڈہ کے حاکم ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ رضیہ اور التونیہ نے آپس کے صلاح مشورے کے بعد کھکروں، جاٹو، آس پاس کے دیگر زمینداروں سے لڑاکا قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک زبردست لشکر تیار کیا اور دلی پر حملہ کر دیا۔ معزز الدین بہرام شاہ نے بھی اپنی فوج اعزالدین بلبن کی ماتحتی میں روانہ کی۔

اعزالدین بلبن التمش کا داماد تھا جو بعد میں الغ خان کے لقب سے مشہور ہوا۔ راستے میں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک زبردست جنگ ہوئی اس کے نتیجے میں رضیہ سلطانہ کو شکست ہوئی۔ وہ میدان جنگ سے بھاگ کر بھٹنڈہ میں پناہ گزیں ہوئی۔

رضیہ اس شکست کے بعد آزردہ خاطر نہ ہوئی، اس کی بے چین اور اقتدار پسند طبیعت نے اسے آرام سے نہ بیٹھنے دیا، اور اپنے منتشر لشکر کو از سر نو مرتب کر کے ایک بار پھر دلی پر حملہ آور ہوئی، اس بار بھی بہرام شاہ نے اعزالدین کو رضیہ کے مقابلے میں پروانہ کیا۔ کیتھل کے گرد و پیش کے علاقے میں دونوں لشکریوں میں معرکہ آئی ہوئی۔ اس بار بھی رضیہ کو شکست ہوئی اور اعزالدین کامیاب رہا۔ رضیہ اور التونیہ دونوں میدان جنگ سے بھاگ نکلے، لیکن چند زمینداروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

رضیہ کی موت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان زمینداروں نے انہیں گرفتار کر کے معزز الدین بہرام شاہ کے سامنے پیش کیا۔ اور اس کے حکم سے ۲۷ رمضان المبارک ۶۴۰ء کو دونوں کو قتل کر کے وہیں دفن کر دیا گیا بعد میں رضیہ سلطانہ کے چھوٹے بھائی سلطان ناصر الدین محمود نے دونوں کی قبروں پر ایک خوب صورت مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو آج بھی کیتھل (ضلع کرنال مشرق پنجاب بھارت) میں کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد کے کچھ آثار باقی ہیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ اس جنگ میں ملک التونیہ کو قتل کر دیا گیا لیکن رضیہ جان بچا کر ایک جنگل میں چھپ گئی، جب بھوک پیاس نے تنگ کیا تو ایک دہقان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ تھوڑی سی روٹی کھا کر وہ ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر سو گئی۔ وہ اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ لیکن نیند کی حالت میں کپڑے ادھر ادھر کھسکے تو دہقان کو معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس نے زیورات کے لالچ میں اسے سوتے ہوئے قتل کر دیا اور وہیں دفن کر دیا۔ جب وہ زیورات فروخت کرنے شہر گیا تو پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ پر اس نے سارا واقعہ بتایا۔ چنانچہ ملکہ کی نعش کو وہاں سے نکال کر دلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔ یہ قبر اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے "امی کی درگاہ" کہتے ہیں۔

(بہ شکریہ بتول)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مچھلی کا قورمہ

ضروری اشیاء:

مرغی یا رہو مچھلی	آدھا کلو
تیل	حسب ضرورت
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
پیاز	تین عدد
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
کالا زیرا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چند عدد
ثابت سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	چار عدد
ناریل	آدھا کپ
بڑی الائچی	ایک عدد
چھوٹی الائچی	چار عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
کالی مرچ	پانچ سے چھ عدد

ترکیب:

تیل گرم کر کے پیاز کو سنہرا ہونے تک فرائی کر لیں اور نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔ پسا دھنیا، پیاز، لال مرچ، پسا ادرک لہسن، ہرا دھنیا، ثابت کالا زیرا، ہری مرچ، ثابت سفید زیرا، لونگ پسا ہوا، ناریل، بڑی الائچی، چھوٹی الائچی، دار چینی اور کالی مرچ کو دہی میں حل کر لیں اور اس میں مچھلی شامل کر دیں۔ تیل گرم کر کے مچھلی تل لیں۔ تھوڑا سا پانی ڈالیں اور پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب مچھلی آدھی گل جائے تو اسے پلٹ دیں۔ پھر دم پر رکھ دیں۔ آخر میں پسا گرم مسالا ڈال کر چولہے پر سے اتار لیں۔ مزے دار قورمہ تیار ہے۔

براؤنیز

ضروری اشیاء:

مکھن	آدھا پاؤ
پسی چینی	آدھا کپ
چاکلیٹ	آدھا پاؤ
دودھ	آدھا کپ
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
اخروٹ	آدھا پاؤ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کوکو پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
میدہ	آدھا پاؤ
انڈے	دو عدد

ترکیب:

میدہ، بیکنگ پاؤڈر، کوکو پاؤڈر کو چھان لیں۔ مکھن کو پھینٹ لیں۔ تھوڑی تھوڑی کر کے چینی ڈالیں، انڈے ڈالیں۔ اس کے بعد ونیلا ایسنس فریش ملک، پگھلی چاکلیٹ اور میدہ ڈالیں۔ اس کے بعد لکڑی کے چمچے سے ملائیں اور تھوڑا اخروٹ ڈال کر مکس کریں۔ گریس اور پیپر لگے پین میں ڈالیں۔ باقی اخروٹ اوپر چھڑک دیں۔ تھوڑی انڈے کی سفیدی اور کوکو پاؤڈر سے اوپر برش کریں۔ آدھا گھنٹہ بیک کریں جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس کے چھ ٹکڑے کاٹ کر پیش کریں۔

(اخروٹ نہ ہو تو نہ ڈالیں۔ اوون کے بغیر دیگچی میں بھی بنا سکتے ہیں)۔

سراغ

پاکستان میں ٹیکس سے متعلق ہمیشہ ابہام ہی رہے ہیں۔ گلوکار راحت فتح علی خان بھی ان دنوں پریشان ہیں۔ ان لینڈ ریونیو نے راحت فتح علی خان کے خفیہ بینک اکاؤنٹ کا سراغ لگالیا ہے۔ ان رقوم کا گوشواروں میں کوئی ذکر نہیں۔ ایف بی آر نے کارروائی شروع کردی (رشوت کے لیے؟)۔ راحت فتح علی خان نے اس انکشاف کے بعد ادارے سے مہلت مانگی ہے (سفارش لانے کے لیے؟)۔

ڈرامہ

اداکارہ میرا ہمیشہ ہی کچھ الگ کرکے نمایاں ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس بار موبائل فون گم ہونے کی خبر لائی ہیں۔ انہوں نے اپنے ویڈیو پیغام میں کہا ہے کہ فون ڈھونڈ کرلانے والے کو پانچ لاکھ انعام دیا جائے۔ (نیا موبائل نہیں آجائے گا اتنے میں؟) اس ویڈیو کے ریلیز ہوتے ہی شوبز کے مختلف حلقوں میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئی ہیں اور سب اس کو میرا کا نیا ڈرامہ کہہ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے، اس میں میرا کا کوئی خاص ڈیٹا ہو جس کے لیے وہ پانچ لاکھ دینے پر تیار ہوگئی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ میرا اپنی کوئی نئی ویڈیو ریلیز کرنا چاہتی ہیں جس کے لیے موبائل کی گمشدگی کا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ لیکن میرا کے ہمدردوں کا کہنا ہے کہ میرا ایک ذمہ دار ایکٹریس ہیں انہیں اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔ (کام نہ ہوتو؟)

نظر انداز

رچرڈ برٹن 1952ء میں ٹوئنٹتھ سنچری فوکس کی تین فلموں میں کام کرنے کے لیے ہولی وڈ آیا تھا۔ بعد میں رچرڈ برٹن نے ایک جگہ اپنی یادداشتوں میں لکھا "میں بیل ایئر کے ایک پرتعیش مکان میں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھا تھا کہ دوسرے کنارے پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے چہرے کے سامنے سے کتاب ہٹائی۔ وہ کم بخت بہت ہی خوب صورت تھی لیکن بہت مغرور معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے بھی اسے نظر انداز کردیا۔"

یہ کوئی افسانوی قسم کی صورت حال نہیں تھی، جس میں ہیرو، ہیروئن بظاہر ایک دوسرے سے بے نیازی برت رہے تھے لیکن دل ہی دل میں ایک دوسرے سے بات کرنے کے خواہاں تھے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ لڑکی ایلزبتھ ٹیلر تھی۔ اسٹار بننے کے بعد دونوں نے سیکھا کہ خواہ مخواہ دوسروں کے سامنے باچھیں نہ کھلاتے پھرو بلکہ انتظار کرو کہ لوگ خود تم تک آئیں۔

تربیت

فیصل قریشی ورسٹائل اداکار و میزبان ہیں۔ فلموں سے ٹی وی کی طرف سفر کرنے والے فیصل قریشی کا کہنا ہے کہ بیٹیاں باپ کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ بچوں سے والدین کے رشتے کے بارے میں بات کرتے ہوئے فیصل قریشی کا کہنا تھا کہ اپنے بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیے، یہ بہت ضروری ہے وہ صرف ہمارے بچے ہی نہیں ہمارے ملک کا مستقبل بھی ہیں لہٰذا والدین ہونے کے ناتے یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم اپنے بچوں کی اچھی تربیت کریں۔ مجھے احساس ہورہا ہے کہ بیٹیاں والد

کے زیادہ قریب ہوتی ہیں، وہ اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اس کی پسندیدہ سرگرمیاں کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ رات شوٹنگ سے دیر سے ہی کیوں نہ آئیں لیکن وہ اپنی بیٹی آیت کے لیے صبح جلدی اٹھتے ہیں اور اسے خود اسکول چھوڑ کر آتے ہیں یا اس سے اسکول جانے سے پہلے لازمی ملتے ہیں (اور بڑی بیٹی سے؟)۔

ادھر اُدھر سے

اداکارہ زرنش خان کا کہنا ہے کہ ''مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ میری پوسٹس پر ساٹھ فیصد خواتین ٹرولنگ کمنٹس کرتی ہیں۔ ترقی کی جانب بڑھتے پاکستان میں خواتین اب بھی ایک دوسرے کی غیبت کرتی ہیں اور اس کے بعد خواتین کے حقوق پر ریلیاں نکالنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔

(سوشل میڈیا)

☆ میرا تعلق اس نسل سے جس نے اسکول میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس وقت مہنگے گرامر اسکولوں کا رواج عام نہیں ہو رہا تھا بلکہ سرکاری اسکولوں میں ایک جیسی کتابوں والے بچے ہی بورڈ میں پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہماری نسل نے ایسا کون سا تیر مار لیا جو آج کے بچے نہیں مار پا رہے؟ یہ درست ہے کہ اس وقت کا میٹرک پاس آج کے میٹرک پاس کے مقابلے میں زیادہ لائق فائق ہے مگر اس کی وجہ یکساں نصاب نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ سرکاری اسکولوں کا اعلا معیار تعلیم تھا۔

(ذراہٹ کے......یاسر پیرزادہ)

☆ چند روز پہلے ہماری مایہ ناز تجزیہ نگار نسیم زہرا نے ایک نجی ٹی وی پر کہا تھا کہ ہمارے وزیراعظم صاحب چوتھی جماعت کے بچوں کی طرح اپوزیشن سے کٹی کیے بیٹھے ہیں۔ اپوزیشن کے قائدین پر ڈاکوؤں اور لٹیروں کی پھبتیاں کستے رہنے کے باعث ہی سسٹم کے اندر سے دھواں اٹھنے لگا ہے جو حد درجہ تشویش کی بات ہے۔

(صورت حال......الطاف حسن قریشی)

☆☆

جلد کی صفائی

فیشل

فیشل، چہرے کو کسی کلینزر یا کریم سے اچھی طرح صاف کرنے کا عمل ہے، جس سے جلد میں ایک نئی قوت حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ مارکیٹ میں مختلف قسم کے فیشل دستیاب ہیں۔ فیشل اعصابی تناؤ کے لیے بہت مفید ہے۔

فیشل کے لیے کسی اچھی کریم سے چہرے کا ہلکا سا مساج کریں۔ اب کسی برتن میں کھولتا ہوا پانی ڈالیں اور اس میں اپنی پسندیدہ خوشبو کی جڑی بوٹیاں یا تیل یا پھر پودینے کی چند پتیاں ڈال دیں۔ چہرے اور گردن کو تولیے سے خوب اچھی طرح سے ڈھانپ لیں اور بھاپ لینا شروع کر دیں۔ برتن سے آپ کے چہرے کا فاصلہ کم از کم دو فٹ ہو، خوب اچھی طرح پسینہ آجائے تو تولیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کرلیں۔ ایسی خواتین جن کی جلد خشک اور پختہ ہے وہ اپنے چہرے پر کولڈ کریم، نائٹ کریم یا تیل کی ہلکی مالش کریں۔ حتیٰ کہ کریم یا تیل جلد میں پوری طرح جذب ہو جائے۔ عام طور پر مالش کا عمل بیس سے پچیس منٹ تک کیا جاتا ہے۔ مالش سے جلد پر صحت مندی اور رونق نظر آنے لگتی ہے۔

ماسک

ماسک کے بغیر کوئی فیشل مکمل نہیں ہوتا۔ تیار ماسک بازار میں بھی دستیاب ہیں۔ اپنی جلد کے مطابق آپ ماسک خود بھی تیار کرسکتی ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ ماسک چہرے پر سب جگہ برابر لگانا چاہیے۔

یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ماسک آنکھوں، نتھنوں اور ہونٹوں پر نہ لگے۔ ماسک تقریباً دس سے پندرہ منٹ چہرے پر لگانا ضروری ہے، اس کے بعد اسے روئی کی مدد سے نیم گرم پانی سے صاف کیا جائے۔

ماسک اپنی جلد کی ساخت کی مناسبت سے استعمال کرنا چاہیے۔ جلد کی تین اقسام ہوتی ہیں۔ چکنی جلد، نارمل جلد، خشک جلد، آپ اپنی جلد کے مطابق ماسک لگائیں۔

چکنی جلد کے لیے ماسک:

پپیتے کا گودا لے کر اس میں آدھے لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو بیس منٹ کے لیے چہرے پر لگالیں۔ یہ جلد پر نمودار ہونے والے اضافی تیل کو روکے گا۔

خشک جلد کے لیے ماسک:

خشک جلد کے لیے ضروری ہے کہ اس کو باقاعدگی سے موئسچرائز کیا جائے۔ چہرے کو بھی رگڑیں نہیں، بلکہ ہلکے سے تھپتھپا کر خشک کریں۔

ایک چمچہ شہد، ایک چمچہ زیتون کا تیل اور لیموں کے رس کے چند قطرے لے کر اس کو ملالیں۔ اب اس کو چہرے پر آدھے گھنٹے کے لیے لگالیں پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔ خشک جلد تروتازہ ہو جائے گی۔

نارمل جلد کے لیے ماسک:

ایسی جلد پر ہمیشہ پھلوں کے ماسک استعمال کریں۔ کیلے کو مسل لیں۔ اس میں شہد یا لیموں کا رس ملا کر بیس منٹ چہرے پر لگا رہنے دیں پھر پانی سے دھولیں۔